ایوانِ غزل

(ناول)

جیلانی بانو

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

ایوانِ غزل

جیلانی بانو

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

© جیلانی بانو

Aiwan-e-Ghazal
by
Jilani Bano
Rs.152/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2012 تعداد: 1100 قیمت: -/152 روپے

ISBN:978-81-7587-825-9 سلسلۂ مطبوعات:1664

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

فون نمبر:49539000 فیکس: 49539099

ای میل:urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد۔110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ ناساعد حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہوگیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلاشرکتِ غیرے شائع کی ہیں)۔ زیرنظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابل فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ارباب حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُرخلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اولین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاچکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہورہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
مینجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

فرحان کے نام
جو میرا مستقبل ہے

یہ غزل کی انجمن ہے ذرا اہتمام کر لو
کسی غم کو مئے بنا لو، کسی دل کو جام کر لو

(احمد معظم)

ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

صوفوں کے پیچھے کرسیوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ پھر بھی لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ دروازوں پر کھڑکیوں میں۔ ڈائس کے آس پاس اور باہر کوریڈور میں، اتنے ہجوم میں عظیم نظر نہیں آرہا تھا مگر اس کے متعلق تعریف و تحسین لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے لوگوں کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

سامنے کی صف میں ہندوستان کے وہ سب مانے ہوئے ادیب اور دانشور بیٹھے ہوئے تھے جو ہر کل ہند ادبی کانفرنس کا لازمی جزو ہیں۔ وہ سب جناب صدر کی اس اردو نوازی پر خوش ہو رہے تھے کہ وہ اپنی وزارت کا قیمتی وقت نکال کر اردو کی ایک صنف سخن کو خراج تحسین ادا کرنے کے لیے آگئے تھے۔

جناب صدر، کارچوبی مسند کے گاؤ تکیے پر بیٹھے، دھوتی کا پلا سنبھالے اپنی اس قدر افزائی پر خوش ہو رہے تھے۔ خوشی کے مارے ان کا منہ کھلا

ہوا تھا۔ جیسے وہ اس اردو جلسے کی کارروائی سننے کی بجائے، نگل رہے ہوں۔ کئی بار انھوں نے جھک کر اپنے پی۔ اے سے کہا کہ سرخ گلاب کے پھولوں کا وہ ہار جو انھیں پہنایا گیا ہے حفاظت کے ساتھ گھر لے جایا جائے۔ پھر انھیں اپنی چپلیں یاد آئیں جو لوگوں نے زبردستی مخمل کے فرش پر اتروادی تھیں

منسٹر بننے کے بعد انھوں نے آناً فاناً اردو کے متعلق بہت سی معلومات حاصل کرلی تھیں۔ یہاں تک کہ آج انھوں نے ایک اردو جلسے کی صدارت بھی قبول کرلی تھی جو اردو غزل کے بارے میں ہو رہا تھا۔ آج جو تقریر انھوں نے کی وہ ان کے پی۔ اے نے پہلے اردو میں لکھی۔ پھر اس کا تلگو میں ترجمہ ہوا اور پھر انھوں نے تلگو میں اس کا مطلب سمجھ کر اردو میں رٹ لیا تھا۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ غزل کسی چڑیا کو کہتے ہیں یا کسی عورت کا نام ہے مگر وہ اردو کے اس شاعر کو جانتے تھے جو آج انھیں زبردستی اس جلسے کی صدارت کرانے کھینچ لایا تھا۔ نئی نئی جمہوریت قائم ہوئی تھی اس لیے پنڈت نہرو کے خاص احکام تھے کہ تمام ریاستوں کے وزیر عوام میں گھلے ملے رہیں۔ اور خصوصاً کلچرل پروگراموں میں شریک ہوکر عوام کے قریب آنے کی کوشش کریں۔ اسی لیے انھوں نے اپنے دوست کی بات مان لی تھی۔ جب وہ منسٹر نہیں تھے بلکہ صرف بلاریڈی تھے تو ایک بار یہی آدمی گاؤں میں آیا تھا۔ اس نے لوگوں کو نظام کی جاگیرداری جبریت کے خلاف ورغلایا تھا۔ کسانوں کو زمین چھین لینے کے خواب دکھائے تھے اور جاگیرداروں و سیٹھوں کے خلاف لڑنے پر تیار کیا تھا۔ اس نے سارے گاؤں کو اپنی اس میٹھی مسکراہٹ سے موہ لیا تھا جو ابھی تک اس کے لبوں پر زندہ تھی۔ جب گاؤں کے نوجوان اس کی باتیں سننے جاتے تھے تو بڑے بوڑھوں نے بہت ڈرایا تھا۔ کہ تم لوگ نواب احمد حسین کو مت بھولو جو ایک ہی دن میں سب کو جیل میں سڑوا دے گا۔

مگر نوجوان تو طوفانی ہوا ہوتے ہیں۔ انھوں نے عظیم سے ملنے کے بہت سے راستے ڈھونڈ نکالے تھے۔

ان دنوں یلاّ ریڈی اپنے گاؤں کے اسکول میں بچوں کو پڑھاتے تھے۔ پھر ایک دن سیم ان کے اسکول بھی آنکلا اور بچوں کو پڑھانے کے نئے طریقے اور نئے سبق سکھانے بیٹھ گیا اور وہاں سے اٹھتے وقت وہ بچوں سے بیگم وہاں کے ماسٹروں تک کو اپنا دوست بنا چکا تھا۔ ایک پرانی کہانی کے بانسری والے کی طرح وہ سارے گاؤں کا دل اپنے نغمے میں سمیٹ کرلے گیا تھا۔ وہ معمولی سی صورت شکل کا دبلا پتلا آدمی۔

ان دنوں قیصر اور سنجیوا کے بڑے چرچے تھے۔ سنا ہے وہ لوگ دلم (تلنگانہ تحریک کے چھاپہ مار دستے) کی رہنمائی کرتے تھے۔ قیصر کسی جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن وہ مشین گن لے کر نظام کی فوج سے لڑ رہی تھی۔

اس وقت تک یلاّ ریڈی کی نظر میں دکھنی مسلمانوں کے صرف دو ہی روپ تھے۔ یا تو نواب احمد حسین جن کے قہر سے سارا گاؤں کانپتا تھا۔ یا پھر سلاّرو موچی جو ہر روز صبح پھٹے پرانے جوتوں کے درمیان خود بھی ایک سڑے ہوئے جوتے کی طرح آبیٹھتا تھا۔ سلاّرو کہتا تھا کہ اللہ میاں تو ہر مسلمان کو نواب احمد حسین بنا کر بھیجتے ہیں۔ اب یہ ان کے اپنے اعمال ہیں کہ وہ سلاّرو کی اندھی بیوی بن کر گھر گھر بھیک مانگتے پھریں۔

کچھ دن اور گزر جاتے تو ممکن تھا کہ یلاّ ریڈی بھی ان سر پھرے نوجوانوں کے بہکاوے میں آکر اپنا بیڑا غرق کر ڈالتے۔

مگر کرنا خدا کا یوں ہوا کہ سوامی آنند راؤ جی نواب احمد حسین کے مہمان بن کر دہلی سے آئے۔ کانگریس کے اتنے بڑے نیتا ہونے کے باوجود اس بار انھوں نے عوام سے چندہ وصول کیا اور نہ نذریں قبول

کیں۔ بلکہ صرف یہ بشارت دی کہ اب انگریز اپنا بوریا بستر سمیٹ رہے ہیں۔ لہٰذا وقت آگیا ہے کہ کانگریس اپنی طاقت کو اکٹھا کر کے نظام کے پنجے سے عوام کو نجات دلائے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کمیونسٹ پورے تلنگانے پر ہی قبضہ جمالیں۔

ان دنوں گاؤں میں ہر رات قیامت کو ہم رکاب لاتی تھی۔ پہلے اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے اتحاد المسلمین کے رضاکار نکلتے۔ جنھیں نواب احمد حسین خاں نے اپنی حفاظت کے لیے شہر سے بلوایا تھا۔ پھر ان سے لڑنے کے لیے سرخ جھنڈے والوں کی فوج پہاڑوں سے کود پڑتی۔ ــــ صبح پشیمان سا، پریشان سا سورج گاؤں میں جھانکتا تو کھیتوں کی ٹوٹی منڈیروں پر لاشیں پڑی ملتیں اور چاول کے دانوں سے بھری فصل، خون کے چھینٹوں سے نہائی ہوئی نظر آتی۔

اس لیے دیکھتے ہی دیکھتے نواب احمد حسین خاں اور سوامی جی نے مل کر گاؤں کے سمجھدار نوجوانوں کی ایک اور جماعت بنائی۔ بہت سے خطرناک دماغوں کا دھارا موڑ دیا ــــ یلاّ ریڈی کانگریس پنچایت کمیٹی کے صدر چنے گئے ــــ اس دن کی بھی کیا برکت تھی کہ یلاّ ریڈی سیڑھیاں چڑھتے ہی چلے گئے۔ انھوں نے نواب احمد حسین کی بتائی ہوئی راہ پکڑی اور آج منسٹری کی مسند پر آبیٹھے۔

ان کے سامنے وہی دبلا پتلا سانولا آدمی بیٹھا تھا۔ اپنے چہرے پر دائمی مسکراہٹ لیے۔ اپنے ساتھ وہی آہنی عزم لیے جس نے اسے کبھی جھکنے پر مجبور نہیں کیا۔ اس نے اپنے سینے پر گولیاں سہیں اور پھانسی کا پھندا اس کے پیچھے پیچھے بھاگا ــــ مگر وہ اپنی جگہ سے نہ سرکا ــــ یلاّ ریڈی نے اسے بڑے سبز باغ دکھائے۔ دہلی میں کوئی بڑا عہدہ دلوانے کا بھی لالچ دیا۔ مگر اسے جانے کس چیز کا لالچ تھا کہ اس نے کسی عہدے

کی سرد آہ ۔ ۔ ۔ وقت نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔

وہ آج بھی پھٹی چپلوں کو گھسیٹتا اسی طرح جلسوں اور نشستوں میں گھومتا نظر آتا تھا۔ اسے منٹ بھر کی فرصت نہیں تھی۔ وہ ایک ایک لمحہ سوچ سوچ کر خرچ کرتا تھا۔ اور اس وقت جب وہ ڈائس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا یلار یڈی کو دیکھ رہا تھا تو اس کے پیچھے اس کے چاہنے والوں کا ایک ہجوم تھا ___ ادیب ___ شاعر ___ دانشور ___ عوام ___ اللہ کی پناہ ___ آج "ایوانِ غزل" میں کتنے لوگ سمٹ آئے تھے!

دس برس پہلے جب وہ عظیم سے ڈر کر بھاگے تھے تو انھیں کیا خبر تھی کہ ایک دن اسی عظیم کی دعوت پر انھیں ایک اردو کے ایک جلسے کی صدارت کرنا پڑے گی جہاں غزل کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا ہوگا

وہ بھی ایسا جلسہ جہاں جوتوں کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں تھا اور بیٹھنے کے لیے اتنی تکلیف دہ کارچوبی مسند کا انتظام کیا گیا تھا کہ ان کی نئی دھوتی اس میں الجھ الجھ کر پھٹ رہی تھی ___ یہ سب جاگیرداروں کے نخرے تھے۔ انھوں نے "ایوانِ غزل" کے اس عظیم الشان ہال کو دیکھا اتنا بڑا محل ___ اتنا خوبصورت ہال ___ جھاڑ فانوس لگے ___ قیمتی مخمل کے قالین بچھے ___ سنہری فریموں میں جڑے ہوئے ان تمام جاگیردار شاعروں کے فوٹو لگے تھے جو اس محل کے مالک تھے اور ان کی اولاد نے یہ محل اور اس کی لائبریری اردو کے لیے عوام کو دیدی تھی۔

لیکن عظیم کے دوست سرور کو آج بارہ سال بعد "ایوانِ غزل" میں آکر سخت اکتاہٹ سی ہو رہی تھی۔ سرور جدھر بیٹھا تھا لڑکیوں کی نگاہیں اسی طرف تھیں۔ وہ حیدرآباد کا بے حد مقبول شاعر تھا۔ اس نے بڑی بڑی مغرور حسیناؤں کو جھکایا تھا۔ جانے کتنی نگاہیں اس کی راہ میں بچھی تھیں پھر بھی وہ کنوارا تھا۔ چالیس برس کا کنوارا ___

آج "ایوانِ غزل" میں آکر وہ اُداس ہوا جا رہا تھا۔ اپنے بے مصرف ہاتھوں کو دیکھ کر سوچتا کہ اب ان کا کیا کرے۔ کہاں رکھے ___

ذہن میں بڑی کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ جیسے کوئی بہت اچھا شعر تکمیل پانے کو ہو۔ جیسے آج تک اس نے ایک شعر بھی نہیں کہا۔ اس کے دونوں مجموعے ابھی تک بھاری پتھر بنے اس کے دماغ پر رکھے ہیں اور بوجھ کے مارے اس کا سر پھٹا جا رہا ہے۔

گردن اٹھا کر اس نے اوپر دیکھا ___

ڈاکٹر یعقوب حسین اپنی لحیم شحیم شخصیت کو سنبھالے، گرج دار آواز میں دھاڑ رہے تھے۔ انھوں نے ایک ہاتھ میں مائک یوں تھام لیا تھا جیسے ان کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی وہ چھوٹ بھاگے گا ___

جنابِ صدر!

"میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ غزل ہمارے ادب کی سب سے تابناک شمع ہے۔ بلکہ آپ اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ ادب سے غزل کو نکال دیں تو شاعری کا شبستاں تاریک ہو جائے گا ___ بلکہ میرا اپنا تو یہ خیال ہے کہ میں ___ میری ذاتی رائے ___ میرا نقطۂ نظر میں ___ میں ___ میرا ___" سرور نے زور زور سے پیر ہلاتے ہوئے۔ سوچا کہ پرانے مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے کے باوجود ___ یعقوب حسین اتنے بُرے آدمی نہیں ہیں۔ ان کی بے تکی توند ___ ہونٹوں کے کونوں سے بہتی ہوئی پیک اور ان کے اپنے ذاتی خیال بھی برداشت کیے جا سکتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے غزل کے بارے میں بڑی خوبصورت اور صحیح بات کہی ہے۔ غزل کے بغیر تو دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ ایک شبستاں کی کیا حقیقت ہے ___ سامنے پھیلے ہوئے حسینوں کے ہجوم نظر نہیں آتے ___ ساری شاعری بے کیف

ہوجاتی ہے   بے روح

تالیوں کے شور سے سرور چونک پڑا۔ اور سگریٹ کیس اٹھاکر کھڑا ہوگیا کہ غزل کے سمینار کا پہلا اجلاس ختم ہوگیا ہے۔

مگر ڈاکٹر یعقوب حسین کے ہٹتے ہی سراج ہاشمی مائیکروفون کو اپنے قبضے میں لے چکے تھے۔

سراج ہاشمی کو گڑے مردے اکھیڑنے کا بڑا شوق تھا۔ قلی قطب شاہ سے لے کر عظیم تک کا شجرہ نسب، ان کے خاندانی حالات ان کے عیوب اور خطائیں، اور ان کے مرنے کی تاریخیں سب انھیں زبانی یاد تھیں۔ چنانچہ آتے ہی انھوں نے غزل کے بھی بخیے ادھیڑنا شروع کر دیئے۔

"غزل کے متعلق ایک قدیم روایت یہ ہے کہ غزل کا تعلق دراصل غزال سے ہے۔ شکاری جب غزال کا شکار کرتے ہیں تو وہ زخمی ہونے کے باوجود بھاگتا ہے۔ شکاری بھی اس کا پیچھا کیے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ زخموں سے چور ہوکر گر پڑتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں جو کرب اور مایوسی ہوتی ہے۔ اسے "غزل" کہتے ہیں۔"

سرور کے سگریٹ سلگاتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ اس کے ہونٹ حیرت کے مارے کھلے ہوئے تھے۔ اور بے خواب سرخ آنکھیں ایک جگہ ٹھہر سی گئی تھیں ـــــــ وہ پتھر کا بت بنا سراج ہاشمی کو گھورے جا رہا تھا ـــــــ اس کے اندر بڑا شور مچا ہوا تھا ـــــــ گھمسان کا رن پڑ رہا تھا ـــــــ ہزاروں شکاری ایک زخمی ہرنی کو گھیرے میں لیے تیر برسا رہے تھے ـــــــ

اُف ـــــــ اس کا بیان پڑھتے نے شاید مرتے

وقت غزل کا چہرہ دیکھ لیا تھا ـــــــ شاید وہ غزل اور "ایوان غزل" سے پوری طرح واقف ہے!

جلسہ ختم ہوگیا ـــــــ سب چلے گئے ـــــــ اکیلے، سنسان "ایوان غزل" میں بیٹھا ہوا سرور غزل کے خیال میں کھویا ہوا تھا ـــــــ

صبح

ہر صبح کتنی خوبصورت ہے۔ کتنی نئی اور حوصلہ آمیز ـــــ ہر روز صبح اٹھ کر کیسی نئی خوشی ہوتی ہے۔ جیسے دروازے پر پوسٹ مین دستک دے رہا ہو ـــــ کون جانے اس ڈاک میں کتنی خوشخبریاں بھری ہوں گی ـــــ کتنے اچنبے چھپے ہوں گے ـــــ؟

صبح ایک پوسٹ مین کی طرح دل کے دروازے کھٹکھٹاتی ہے۔ زندگی کے ایک نئے دن کی آمد ـــــ ایک ناول کا پہلا ورق ـــــ ایک نئی غزل کا پہلا مطلع۔

اور یہ سوچ کر کیسی خوشی ہوتی ہے کہ اس صبح کو وہ لوگ نہ چھو سکیں گے جو ہم سے پہلے تھے اور وہ لوگ اس کے بارے میں سوچا کریں گے جو ابھی پیدا نہیں ہوئے ـــــ یہ لمحے جن کے حق دار صرف ہم ہیں ـــــ کیسے جاندار ہیں ـــــ وقت کی اس ملکیت پر دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور چاروں طرف فوارے کی طرح بکھر جاتی ہے؛

سپوٹے کے پیڑ تلے باغ میں کرسی پر بیٹھے واحد حسین سوچے جا رہے تھے۔ صبح کے مضمون کو ایک شعر میں ڈھالنے کے لیے وہ فجر کی نماز سے پہلے ہی یہاں چپ چاپ آ بیٹھے تھے ـــــ

سامنے کھلی ہوئی بیاض میں کئی بھی غزل کا کٹا پھٹا ڈیڑھ مصرعہ لکھا ہوا تھا ـــــ اس کے اوپر عینک رکھی تھی اور عینک کے اوپر وہ سمن جو عدالت سے کل ہی ان کے نام جاری ہوا تھا۔

"بھلا کسی شاعر نے اس طرح شاعری کی ہوگی!"

انھوں نے اپنے آس پاس کی فضا کو مخاطب کر کے کہا۔ اور پھر انھوں نے سوچا کہ مجھ سے پہلے جانے والے شاعروں کو کیا کامل سکون ملتا تھا۔؟ سکون جو موت بھی ہے اور حیات بھی۔ اسی سکون کی تلاش میں انسان نے زمین چیر پھینکی۔ سمندر کھنگال ڈالے اور آسمانوں کو چھان ڈالا۔ مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ واحد حسین نے سکون کے لمحوں کا اکثر تجزیہ کرنا چاہا ـــــ سکون کی قسموں کو یاد کیا ـــــ کیسا سکون؟ انھوں نے ملازمت کے تیس برس اسی سکون کی تلاش میں گزار دیئے تھے۔ مگر اب بھی انھیں کسی چیز کا انتظار سا تھا ـــــ موت کا ـــــ! یا آنے والے اس وقت کا جو کوئی تبدیلی لائے گا ـــــ کوئی خوشخبری ـــــ خوشخبری بھی عجیب و غریب چیز ہے۔ راشد ٹھیک کہتا ہے آج کل خوشخبری کے معنی ہیں اپنا فائدہ ـــــ واحد حسین اس بات کو کبھی نہ مانتے۔ انھیں اپنے مفاد پرست بیٹے کی اس بات پر تعجب بھی ہوتا اور افسوس بھی ـــــ جانے کیسے "ایوان غزل" میں رہنے کے باوجود ـــــ شاعروں کی نسل سے تعلق رکھنے کے باوجود راشد اتنا خشک مزاج تھا۔ ہر وقت نفع اور نقصان کی ترازو لیے بیٹھا رہتا ـــــ لیکن واحد حسین نے اس خوف کو دل سے نکال پھینکا تھا۔ نقصان جو انسان کا مقدر ہے۔ جس کا حق دار صرف اس کی اپنی ذات ہے ـــــ کیوں کہ نقصان انسان صرف تنہا برداشت کرتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہوتا ـــــ

اکتا کر انھوں نے سوچا کہ بیاض اٹھا کر اندر چلے جائیں۔ اب تک گوہر بیگم نے بادام کا حریرا تیار کر لیا ہوگا۔ لیکن اب شاعری ان کے لیے خمیرہ مروارید بن گئی تھی کہ ہر نئی غزل سے ان میں نئی توانائی آجاتی تھی۔ وہ چاروں طرف سے گھیرنے والی فکروں کو بھگانے میں کامیاب نہ ہوتے تو کسی نئے مضمون کو شعر میں ڈھالنے بیٹھ جاتے۔ ساتھ ہی وقت کا اندازہ کرنے کے لیے سپوٹے کا سایہ بھی دیکھتے جاتے تھے۔

سائنس نے کتنی ہی ترقی کر لی ہو۔ وقت دیکھنے کے لیے کیسی ہی نئی نئی گھڑیاں ایجاد ہو چکی ہوں۔ مگر واحد حسین تو اب بھی دھوپ اور سایوں سے ہی وقت کا اندازہ لگاتے تھے، پنشن ہونے کے بعد انھوں نے انتقاماً گھڑی دیکھنا چھوڑ دی تھی۔ اسی گھڑی نے انھیں پینتیس برس تک دنوں اور گھنٹوں کی گردان کرائی تھی۔

اب وہ آرام سے سوچ سوچ کر وقت ضایع کرتے تھے موسم کی خفیف سی لرزش بھی انھیں محسوس ہو جاتی تھی۔

آج آسمان کتنا گہرا نیلا ہے۔ رات کو سردی خوب ہوگی۔

آج بڑا حبس ہے۔ اردی بہشت کا مہینہ آرہا ہے۔

"انجیر میں کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ بس اب بہار آنے والی ہے یہ شاعر جانے بہار کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں!"

راشد سوچتا۔ اچھا صاحب مان لیا بہار آگئی۔ باغ میں دو چار پھول زیادہ کھل گئے۔ ایک آدھ رنگین چڑیا کہیں پھدکتی نظر آگئی ___ لیجیے صاحب اللہ اللہ خیر صلا ___

راشد کو یوں دن رات روپے پیسے کے الٹ پھیر میں الجھتے دیکھ کر واحد حسین کے دل پر کوئی کنکر مار دیتا تھا۔ یہ آج کل کے لڑکے

کتنے مادہ پرست ہوتے جا رہے ہیں! لطیف جذبات تو انھیں چھو کر نہیں گئے۔ راشد کو یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ ان کا باپ گرمیوں کی کیا کیا تیاریاں کر رہا ہے! ململ کے کرتے تیار ہیں۔ ہولی جلنے سے پہلے مٹی کی صراحیاں خرید لی گئی ہیں۔ باغ میں پھولوں کی نئی پنیری لگائی جا رہی ہے۔ انگور کی بیلوں کی کٹنگ ہو چکی ہے۔ اور اب لگان کا حساب کتاب کرنے گاؤں جاتا ہے۔

واحد حسین ہر موسم کا یوں استقبال کرتے تھے جیسے کوئی تیوہار آرہا ہو۔ ورنہ باقی گھر والوں کو دیکھیے، اٹھتے بیٹھتے سردی کا دکھڑا۔ گرمیاں آئیں تو گرمیوں پر لعنت بھیجنا شروع کر دی۔ یہ نہیں دیکھتے کہ گرمیاں آتی ہیں تو اپنے ساتھ آم بھی تو لاتی ہیں؟

واحد حسین کی ایسی شاعرانہ گفتگو کو سن کر ایک بار سروجنی نائیڈو نے کہا تھا۔

"واحد نواب، اگر تم اپنے ان نازک خیالات کو شاعری میں ظاہر کرتے تو کتنا اچھا ہوتا ___؟"

اس بات پر حاضرین ہنس پڑے تھے۔ کیوں کہ واحد حسین اپنے آپ کو سوائے شاعر کے اور کچھ نہ سمجھتے تھے ___

ویسے یہ حقیقت تھی کہ واحد حسین جتنی خوبصورت باتیں سوچتے تھے وہ ان کی شاعری میں کبھی نہ ڈھل سکیں۔ کیوں کہ وہ رنگ داغ کی پیروی کرتے تھے۔ سراپا نگاری اور سستے قسم کے جذبات کی چمک دمک کے سوا ان کی شاعری میں اور کچھ نہ تھا۔ اس معاملے میں وہ سارا فلسفہ اور اپنے ذہن کی الجھنوں کو الگ ہٹا دیتے تھے۔ کیوں کہ ان کی سات پشتوں سے شاعری کی یہی روایت چلی آرہی تھی۔

"ایوانِ غزل" کے بام و در شاہد تھے کہ انھوں نے معشوق کی

مدح سرائی کے سوا اور کچھ نہ سنا تھا۔

اس وقت واحد حسین کے چاروں طرف صبح کا سکون آمیز سناٹا چھایا ہوا تھا۔ "آذر" کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ اس لیے صبح کے دھندلکے میں ایک ہلکی سی خنکی تھی جو ذرا ذرا سی بات پر جسم میں ٹھنڈ کی لہر دوڑا دیتی تھی۔ ابھی دن نہ نکلا تھا۔ مگر درختوں کے اوپر چڑیاں جاگ چکی تھیں اور دنیا بھر کے مسائل پر ان میں زوردار بحث ہو رہی تھی۔

سڑکوں پر گشت کرنے والی اکا دکا پرچھائیوں میں رنگ بھرنا شروع ہو چکے تھے۔ مالی نے پائپ لگا کر ابھی ابھی لان کی گھاس پر پانی چھڑکا تھا۔ اس لیے دوب کی کچی کچی خوشبو میں تازہ کھلے ہوئے رنگ برنگے پودوں کی کڑوی خوشبو کھلی ہوئی تھی۔ نل بند تھا لیکن اس میں سے گرنے والے پانی کے قطروں کی متوازن آواز آ رہی تھی۔ جیسے کوئی ایک ہی رفتار سے چل رہا ہو۔ ——

واحد حسین کے سرپہ سپوٹے کے پیڑ پر چڑیاں جی بھر کے شور مچانے میں مصروف تھیں اور انھیں اس بات کی بالکل پروا نہیں تھی —— کہ واحد حسین آج بہت پریشان ہیں ——۔

ان چڑیوں کے بھی مسائل ہیں، اپنے نظریے اور عقائد، جنھیں منوانے کے لیے انھیں اتنی زور زور سے چلانا پڑتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تل جاتی ہیں —— اپنے ہم خیالوں کے ساتھ گروہ بنا کر رہتی ہیں —— انسان نے تو زیادہ بڑھ کر، زیادہ سوچ کر مسائل پیدا کر لیے ہیں —— انسان علم حاصل کرنے چین تک جا سکتا ہے۔ مگر وہاں سے لوٹتے وقت ساتھ کیا لاتا ہے —— ؟ کیا کسی مسئلے کا حل ممکن ہے؟ —— انھوں نے عینک کو اپنی غزل کے ڈیڑھ مصرعہ پر رکھ کر سوچا۔ اور اخبار کا انتظار کرنے لگے ...... کسی نئی اہم

خبر کا صبح کتنا انتظار ہوتا ہے۔ اور پھر مایوس ہو کر اخبار تہہ کر کے وہ رکھ دیتے۔ عینک اتار کر خود ہی بڑبڑاتے۔ آج کے اخبار میں کچھ نہیں ہے۔ لیکن بعض دن اخبار میں بہت کچھ ہوتا —— نازیوں کی سازش یورپ میں بھڑکتی ہوئی آگ —— گاندھی جی کی سول نافرمانی کی تحریک پر احتساب —— اس دن واحد حسین کا بلڈ پریشر اور بڑھ جاتا —— جیسے ان کی نبض کا تعلق اخبار ہی سے ہو —— حالاں کہ وہ اپنے دوستوں سے اور اپنے بیٹے راشد سے یہی کہا کرتے تھے کہ "اجی اپنے کو کیا کرنا ہے دوسروں کی باتوں سے۔ اپنے ملک میں چین و امن رہا تو بس ہے ——"

لیکن خود واحد حسین کی ڈیوڑھی "ایوانِ غزل" کے سوا جیسے ساری دنیا میں کہیں چین و امن نہیں رہا تھا۔

سٹی شی —— شو شو —— وو —— وو

رنگین پروں والی ننھی سی چڑیا اپنی ننھی سی تیز سیٹی جیسی آوازیں واحد حسین سے باتیں کرنے آ گئی —— یہ چڑیا دن میں کئی بار واحد حسین کے پاس آ کر یوں باتیں کرتی جیسے کوئی میم انگریزی بول رہی ہو —— اتنے کے بعد وہ چڑیا کے لیے روٹی کا ذرا سا چورا آنگن میں بکھیر دیتے۔ اس کے بدلے میں وہ چڑیا ان کی ہر نئی غزل سننے کو آمادہ رہتی تھی۔ ان کے تمام مداحوں اور شاگردوں پر تبادلۂ خیال کرتی —— واحد حسین کے دشمنوں پر اس نے ہمیشہ ان کے ساتھ مل کر لعنت بھیجی۔

چڑیا کے ساتھ ہی تتلیوں کے رنگین جھنڈ بھی تفریح کرنے نکل کھڑے ہوتے تھے اور چھوٹے چھوٹے پودوں پر رنگین پنکھڑیوں کی طرح بکھر بکھر جاتے تھے۔

سرخ مورم کی روش ان کی کرسی سے بچھتی ہوئی دور پھاٹک تک

چلی گئی تھی۔ جہاں "ایوان غزل" کا دل کی وضع کا پھاٹک بہت دیر ہوئی کھل چکا تھا۔ پھاٹک کے دونوں طرف حینا کے پھولوں کی باڑھ تھی۔ اور اس کے پیچھے کروٹن کے کونڈوں کی قطاریں شروع ہو جاتی تھیں۔ گیٹ کے داہنی جانب سرخ اور سفید بوگن ویلیا کی بیل نے "ایوان غزل" کی زنگ آلودہ دھندلی تختی کو بالکل ڈھانپ لیا تھا۔ مگر اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ حیدرآباد کا ہر شخص اس ڈیوڑھی کو اور اس کے مکینوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ پھاٹک سے اندر تک روشوں کے دونوں طرف ہری گھاس کو کاٹ کاٹ کر پھولوں کی بڑی بڑی کیاریاں بنی تھیں جن میں اودے اور سفید پھول جیسے کسی نے ٹوکروں سے الٹ دیئے تھے۔ پھولوں کے ڈھیروں کا یہ سلسلہ اوپر سیڑھیوں تک چلا گیا تھا۔ جہاں سے "ایوان غزل" کا سب سے بڑا ہال "بیت الغزل" نظر آتا تھا۔ سامنے بڑے بڑے اونچے ستونوں کے سہارے لمبا چوڑا ورانڈا تھا۔ اس کے دونوں طرف اندر جانے کے راستے اور بیچ میں "بیت الغزل" کا دروازہ۔ یہ ہال اس ڈیوڑھی کا سب سے بڑا کمرہ تھا۔ اور ڈیوڑھی کے ہر پورشن کا سلسلہ بالآخر اسی ہال میں آ کر ملتا تھا۔ ہال کے اندر سرخ قالینوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ بے حد قیمتی پرانے اخروٹ کی لکڑی کے بھاری بھرکم مخمل کے صوفے پڑے تھے۔ اس کے پیچھے سنہرے کام والی منقش کرسیوں کا سلسلہ تھا اور بیچوں بیچ اونچا سا تخت، جس پر زریں قالین بچھا تھا اور کارچوبی تکیے رکھے تھے۔ یہاں بیٹھ کر حیدرآباد آنے والے ہر اہم شاعر نے اپنا کلام سنایا تھا۔ اس ہال میں واحد حسین کے جن آبا و اجداد نے شاعری کی اور مشاعرے منعقد کیے تھے، وہ سب بڑے بڑے سنہری فریموں میں جڑے اس ہال میں موجود تھے۔ ایک سے ایک رعب داب والی صورتیں تھیں۔ کہیں گل مچھے لہرا رہے ہیں اور کہیں لمبی لمبی داڑھیاں ملتی نظر آئیں۔

دستار پہنے۔ کمر سے تلواریں باندھے۔ حالاں کہ وقت پڑے پر ان میں سے کسی کو تلوار چلانا نہیں آتی۔ وہ سب کے سب تو قلم کے دھنی تھے اسی لیے جب کبھی شہ پڑی ان کو مات ہوئی۔ "ایوان غزل" کی لائبریری میں ایک سے ایک قیمتی نایاب کتاب بھری ہوئی تھی۔ ان ہی کتابوں کا فیض تھا کہ "ایوان غزل" کے ٹھاٹ باٹ پر زوال آتا گیا۔ جاگیریں کم ہوتی گئیں۔ بے ایمانیوں اور سازشوں کے جال پھیلے اور جھک مار کے واحد حسین ڈیوڑھی سے باہر نکلے، تحصیلداری جیسی حقیر نوکری کرنے ___ اور ان کا بیٹا راشد انجینیری پڑھنے ولایت گیا ___ ایسے بُرے دن دیکھنا لکھے تھے۔ اس ڈیوڑھی کے نصیبوں میں ___

زیادہ پڑھنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے ___ بعض وقت واحد حسین سوچتے تھے۔ ___ اور زیادہ الجھاوے ___ زیادہ مسائل ___ شکوک و شبہات ___ کیا علم کے ذریعے آدمی کسی ایک قطعی فیصلے پر پہنچ جاتا ہے ___؟

سڑک پر چہل پہل شروع ہو چکی تھی ___

کبھی کبھار کوئی انجن کھٹ کھٹ کرتا گزر جاتا۔ یا کوئی گوالہ بھینسوں کو ہانکتا سر پر چارے کا ٹوکرا لیے گزر جاتا تھا۔ پھر دلھے نواب کی ڈیوڑھی پر کوئی ماما چلانے لگی ___ سیتارام کے مکان کے سامنے ان کی بڑی لڑکی نے گوبر کے پانی کا چھڑکاؤ کر کے سفید چونے سے رنگولی بنانا شروع کر دی۔

سیتارام برہمن تھے۔ مگر عید بقرعید کو بڑی پابندی سے آ کر واحد حسین کے ہاں شیر خرمہ کھاتے۔ ان کے ہاں کی ہر پوجا اور تیوہار میں واحد حسین اور ان کے بیوی بچے شریک ہوتے تھے۔ وہ وکیل تھے اور واحد حسین کے سارے جھوٹے سچے مقدموں کی پیروی کرتے۔ ان کے لیے جھوٹے گواہ ڈھونڈ کر لاتے اور ان کی ہاں میں ہاں ملائے جاتے تھے راشد کے ساتھ ہی ان کے لڑکے ملشیم نے بی۔ اے پاس کیا تھا۔ مگر

راشد انجینیری میں گیا تو وہ بلڈنگیں بنانے کا چھوٹا موٹا کاروبار کرنے لگا۔ اس کام کے لیے بھی وہ راشد اور واحد حسین کی خوشامد میں لگا رہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دولھے نواب اپنی ڈیوڑھی سے باہر آئے۔ زربفت کی پرانی شیروانی پہنے، دستار لگائے، دبلے دبلے پتلے، سفید بالوں کی پیچھے جھالر سی لٹکتی تھی۔ اپنے چھوٹے سے پوتے کو سینے سے لگائے سڑک پر ٹہلنے لگے۔۔۔۔ دولھے نواب کے گھر میں دسیوں نوکر چاکر تھے۔ آیائیں اور چھوکریاں تھیں۔ مگر روز صبح وہ اپنے سال بھر کے پوتے کو لے کر ٹہلا کرتے۔ جیسے کہ یہ ان کی سب سے قیمتی شے ہو۔ دولھا نواب کو دیکھ کر واحد حسین کو بھی حرص ہوتی کہ اپنے تین برس کے پوتے شاہین کو لے کر دولھے نواب کے ساتھ ٹہلا کریں۔ مگر ان کا بیٹا اپنے بیٹے کو بالکل انگریزی اصولوں پر پال رہا تھا اور اس کی موٹی کرسچین آیا بچے کو سات بجے سے پہلے نہیں اٹھنے دیتی تھی۔ اس پر بھی پابندی کہ بچے کا منہ مت چومو۔ اسے بے وقت کھٹے میٹھے پھل مت کھلاؤ۔ ننگے پیر مت اتارو زمین پر۔ جب زمین پر اتنی تلخی اور نفرت پھیلی ہو تو یہی جی چاہتا ہے کہ دولھا نواب کی طرح کسی کو سینے سے لگا کر سب کچھ بھول جائیں۔ ۔۔۔ مگر نکلتے ہوئے دن کی حقیقت ۔۔۔۔ اور سورج کی موجودگی کو کیسے فراموش کر دیں گے آپ!"

"بندگی عرض کروں قبلہ" دولھے نواب کو گیٹ کے قریب سے گزرتے دیکھ کر واحد حسین کھڑے ہو کر تعظیماً جھکے۔

"جیتے رہو۔۔۔ حیات بڑی ہو۔۔۔ دولت و اقبال میں ترقی ہو" دولھا نواب رک گئے۔

"آج چھوٹے پاشا، بڑی جلدی آپ کو باہر لے آئے"

"جی ہاں۔ ذرا چھوٹے نواب کو چھاتی سے لگا لوں تو آرام ملتا ہے۔۔۔" دولھا نواب نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔

"جی بجا ارشاد۔۔۔ وہ منصب کا بھی ابھی تک کچھ نہیں ہوا شاید" واحد حسین جانتے تھے کہ دولھا نواب کا سکون کیوں کھو گیا ہے

"کب ہوتا اللہ کو مالوم۔ لوگاں بول رئیں کتے حضور کی سلور جوبلی کی خوشی میں سب کا منصب بڑھنے والا ہے"

"جی۔ انشاء اللہ۔۔۔" واحد حسین ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے تھے۔ کیوں کہ بزرگوں کے ساتھ بات کرنے کا یہی انداز تھا۔

"مگر اتنا منصب بڑھا تو کیا ہوتا میاں۔" دولھا نواب حقارت سے بولے۔

"بڑے بھائی صاحب کے محل میں چار بیگماں ہیں۔ چھ سات اور لونڈیاں چھوکریاں ہیں۔ اپنے محل میں دو بیگمات کے اخراجات ہیں۔ جاگیر تو صرف ڈیڑھ ہزار روپے مہینے کی رہ گئی ہے۔ صاحبزادے کی بھی شادی ہو گئی۔ گھر میں داماد اور ان کے بال بچے ہیں۔ آپ ہی بولو۔ گزر بسر کیسا ہو نگی۔۔۔"

"جی بجا ارشاد فرمائے حضت"

واحد حسین کی باتوں کے اختصار سے پریشان ہو کر دولھے نواب آگے بڑھ گئے تو واحد حسین کمر کے پیچھے ہاتھ باندھ کر ہری گھاس پر ننگے پاؤں ٹہلنے لگے۔ بھلا کبھی دولھا نواب کے باپ دادا نے یوں آمدنی اور خرچ کے بارے میں غور کیا ہوگا! اس نئے انگریز ریزیڈنٹ نے تو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ جاگیرداروں کی ساری جمع و خرچ کا حساب کتاب دیکھنے کی فکر۔ ہر بات کی نگرانی۔ خرچ کوئی کرے۔ فکر کسی کو۔۔۔ دولھے نواب کہتے تھے کہ ڈیوڑھیوں کی حرم سرائیں تک چھان

ڈالی تھیں ان اجاڑ صورت فرنگیوں نے۔

ڈر کے مارے اعلا حضرت کو "انسداد بے رحمی بر انسان" کا محکمہ قایم کرنا پڑا۔ جو گھروں اور ڈیوڑھیوں کے چھوکروں اور لونڈیوں کو باہر بلا کر پوچھتے تھے کہ ان پر کیا ظلم ہوا ہے۔ اب ان نوکر پیشہ لوگوں کی تو عادت ہوتی ہے چغل خوری کرنے کی۔ پیٹھ یا ہاتھوں پر کسی زخم کا نشان دیکھا اور ان لوگوں نے لاری میں لڑکی کو ڈال کر بحق سرکار ضبط کیا۔ اب لاکھ سر پٹکیے "کوئی شنوائی نہ ہوتی تھی۔ حالانکہ یہ چھوکریاں کوئی مفت میں آسماں سے نہ ٹپکتی تھیں۔ باقاعدہ پیسے خرچ کر کے خریدی جاتیں۔ لیجیے۔ اب کام کون کرے۔ ! تنخواہ دار نوکر رکھو تو ان کے ہزار نخرے — اپنی یہ قدر دیکھ کر اب تو کا ماٹین تک اترائی اترائی پھرتیں — بھیا مجال کہ کوئی اندھیرے اجالے ان کا ہاتھ تو پکڑ لے۔ دھیڑوں کی پوری پلٹن آجاتی ہائے واویلا مچاتے۔

واحد حسین پھاٹک پر کھڑے دور تک پھیلے ہوئے بنگلوں کی قطاریں دیکھنے لگے۔ باہر سے فقیروں کے پیوند لگے کپڑوں کی طرح پرانے بدشکل مکان اپنے اندر کیا کیا چھپائے ہوئے تھے — ہر مکان کے اندر کتنی کہانیاں ہوتی ہیں۔ آنسوؤں اور قہقہوں میں چھپی ہوئی باتیں — محرومیوں کی لمبی قطاریں۔

اکتا کر انھوں نے اپنے گھر کو دیکھا۔ یہاں انھوں نے کیسے سلیقے کا باغ لگایا تھا کہ سارے حیدرآباد میں ان کے باغ کی دھوم مچی ہوئی تھی ورنہ اس سے پہلے "ایوان غزل" صرف اپنے مکین شاعروں کی وجہ سے مشہور رہا۔ وہ لوگ چار پشتوں سے شاعری کرتے آئے تھے کیوں کہ فکر سخن کے سوا اللہ نے انھیں اور کوئی فکر نہیں دی تھی "بیت الغزل" میں لگی ہوئی تصویروں میں وہ سب بڑے جاہ و جلال کے ساتھ بیٹھتے

تھے۔ لیکن واحد حسین جانتے تھے کہ یہ سب کے سب کتنے بودے عاشق تھے۔ اس ڈیوڑھی میں ہمیشہ مرنے جینے کا کھیل کھیلا گیا اور ایک کافر ادا بت طناز نے یہاں ہمیشہ خدائی کی۔

اس گھر کو ایک نیا رنگ و روپ دے کر اسے چمنستان بنانے میں صرف واحد حسین کا ہاتھ تھا۔ اب اس ڈیوڑھی میں آپ کسی ساقی بہ جلوہ دشمنی ایمان و آگہی کو ڈھونڈتے پھریں تو یہ سراسر حماقت ہوگی کیوں کہ واحد حسین نے جس غنچہ دہن سے ایوان غزل کو سجایا تھا وہ اپنے کھچڑی بال منہ پر بکھیرے، اپنے نواسوں، پوتوں کے ننھے ننھے کپڑے سینے میں مشغول تھی۔ اس کے باوجود واحد حسین کے فراق کا یہ عالم تھا کہ ساتوں بیاضوں کے سارے ورق ہجر کی بیقراری اور فراق کی آگ سے جل رہے تھے۔ کیوں کہ خود سر اور بے رحم ساقی انھیں پیالہ دیتا تھا نہ شراب۔ وہ ساری جوانی ایک موم کی گڑیا سے کھیلتے رہے جسے اٹھاؤ تو آنکھیں کھول دیتی ہے۔ لٹاؤ تو خوابوں میں کھو جاتی ہے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ واحد حسین نے اپنی خاندانی روایتوں کے خلاف ایک ہی بیوی پر اکتفا کر لیا اور اپنے گھر میں نئے نئے پھول کھلانے میں مصروف ہو گئے۔ ان کے باغ میں ہر ہر شاخ سلیقے سے جھکی ہوتی تھی۔ ہر پھول مہذب، انسانوں کی طرح مسکراتا تھا۔ کیا مجال کہ گھاس پر بچھا ہوا ایک تنکا بھی ڈسپلن کو توڑ سکے۔ ان پودوں کے ساتھ واحد حسین وہی سلوک کرتے تھے جو انھوں نے تحصیلداری کے زمانے میں ماتحتوں کے ساتھ کیا تھا۔

کبھی کبھی راشد ہنس کر کہتا۔

"ابا جان تو سارے باغ کو مارچ پاسٹ کرواتے ہیں۔"

اپنے اکلوتے بیٹے کی یہ بات واحد حسین کو بہت اچھی لگی تھی۔ ویسے

انھیں راشد کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ راشد کی پیدائش کے بعد ہی اُن کے جنون کو قرار سا آگیا تھا اور انھوں نے بی آپی کی خود سری سے اپنا دھیان ہٹا لیا تھا۔

کاش راشد اپنے دادا کے زمانے میں پیدا ہوتا تو اس کی قابلیت کو سراہا جاتا۔ کم سے کم صوبہ داری تک تو پہنچ جاتا۔ جاگیر اور خطاب ملتا یہ دن تھوڑی دیکھنا پڑتے کہ نزاکت جنگ کا پوتا انجنیری پڑھ کر پانچ سو روپے کما رہا ہے۔ دن دن بھر مزدوروں کے ساتھ چھتری لگائے دھوپ میں کھڑا ہے۔ دوروں پر گھوم رہا ہے۔ ویسے یہ بات نہیں تھی کہ سرکار نے راشد کی قابلیت کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہو۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی بلڈنگ بنانے سے پہلے اسے گورنمنٹ نے اپنے خرچ پر ولایت بھیجا تھا کہ وہاں کی اچھی بلڈنگوں کو دیکھ کر آئے۔

خیر۔ یوں بھی راشد اور اس کی اولاد کی واحد حسین کو زیادہ فکر نہ تھی کیوں کہ ان کے چھوٹے بھائی احمد حسین کی شادی مناسب جنگ کی اکلوتی پوتی اُجالا بیگم سے ہوئی تھی۔ اور اُجالا بیگم نے تیس برس گزرنے کے باوجود احمد حسین کی ڈیوڑھی میں اپنے وجود سے کوئی چراغ نہیں جلایا تھا۔ اس لیے واحد حسین کو قرض کی دیمک چاٹتی ہوئی اپنی جائیداد کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اپنی رہی سہی پونجی انھوں نے دونوں بیٹیوں بشیر بیگم اور بتول بیگم کی شادی میں خرچ کر ڈالی تھی۔ اب ہر سال "ایوان غزل" پر قرقی کا نوٹس آتا اور وہ کچھ نہ کچھ گڑ بڑ کر کے ٹال دیتے تھے ـــــ اب ان کی نظریں اورنگ آباد کی طرف لگی رہتیں جہاں احمد حسین بے شمار دولت کو سمیٹے بیٹھے تھے۔

احمد حسین نے واحد حسین کی طرح نہ تو صرف شاعری کی اور نہ بڑے عہدے ڈھونڈے اور نہ شاہی سازشوں میں شریک ہوئے۔ کیونکہ

بیوی کی دولت نے انھیں تونمند بنا دیا تھا۔ اس لیے وہ اپنے گاؤں والی ڈیوڑھی ہی میں رہتے تھے۔ راجہ اندر کی طرح انھوں نے دنیا کا ہر عیش اپنے لیے مہیا کر لیا تھا۔ انھیں دنیا کے جھمیلوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔

واحد حسین کو اپنے چھوٹے بھائی کی قسمت پر رشک آتا تھا ـــــ احمد حسین صرف اپنے لیے جیتے تھے۔ اس لیے وہ کتنے مزے میں تھے ـــــ مگر واحد حسین لاکھ ڈھونڈتے انھیں اپنا وجود "میں" کبھی تنہا نہ ملتا کسی نہ کسی سرے سے کوئی نہ کوئی ضرور بندھا ہوتا ـــــ یہ "میں" کیا ہے۔

میرا اپنا وجود جس میں کوئی اور شامل نہ ہو ـــــ خدا کی طرح ـــــ مگر خدا کو تنہا ماننے کے لیے بھی انسان کے وجود کو اس سے علاحدہ کیا جاتا ہے ـــــ تھک ہار کے واحد حسین پھر اپنی بیاض میں پناہ لیتے تھے۔"

تھوڑی دیر بعد اخبار آگیا ـــــ :

واحد حسین وہیں کیاریوں کی منڈیر پر بیٹھ گئے اور عینک لگا کر جلدی جلدی "صحیفہ" کے ورق پلٹنے لگے۔ کسی خاص چیز کا انتظار نہیں تھا۔ مگر پھر بھی سرخیاں پڑھتے وقت ان کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔

کون سے عہدہ دار کا تبادلہ کہاں ہوا۔ کون مرا۔ کس پر عتاب نازل ہوا اور کون سر چڑھ گیا ـــــ ؟ اس وقت تک دکن میں باہر کی خبریں بہت کم چھپتی تھیں۔ کوئی بڑی اہم دنیا کو ہلا دینے والی نیوز ہوتی تو کسی کونے میں آ پڑتی۔ واحد حسین سب سے پہلے "فرمان مبارک" پڑھتے تھے۔ فرمان پر نظر ڈالنے سے پہلے وہ بے ساختہ ٹوپی اٹھا کر سر پر

رکھ لیتے اور مودب ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ آج کے فرمان پر بھی انھوں نے بڑے اہتمام سے نظر ڈالی۔۔۔۔

انعقاد محافل مشاعرہ

" فرمایا آج کل جو اس کی کثرت ہو گئی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس زبان اردو کا استحکام یا احیا ہوگا، تو سمجھ میں نہیں آتا کہ چند گھنٹے اس میں صرف کر کے اور شعرا کے کلام کی داد دے کر چلتے پھرتے نظر آنا ۔۔۔ بقول کسے نشستند گفتند برخاستند ۔ سے کیا فائدہ ہوگا۔ بلکہ یہ صرف ایک تفریح طبع کا مشغلہ ہوگا۔ مثل متحرک تصاویر ۔۔۔ البتہ وہ بات جدا ہے کہ اگر واقعی زبان اردو کی اشاعت یا ترویج یا استحکام مطمع نظر ہے تو ایک صیغہ اس کا قایم ہونا چاہیئے تاکہ جو دوسری زبانوں میں مفید کتب ہیں اس کا ترجمہ کرایا جائے۔ یا کوئی لٹریچر جدید وجود میں لایا جائے۔ یا کمیاب کتابوں کو چھپوایا جائے اور ان کی اشاعت کا باضابطہ انتظام ہو۔ مگر مشکل یہ ہے اس کے لیے کافی پیسے کی ضرورت ہے تاکہ ایک فنڈ قایم ہو سکے اور قابل لوگ اس کام کو ہاتھ میں لے لیں اور شوق و ذوق سے اس کو انجام دیں۔ اور جب تک یہ بات پیدا نہیں ہے تو مشاعرے بے سود ہیں یا باعث تضیع اوقات!

الحاصل! یہ میری ذاتی رائے ہے جس سے بہت سے ذی علم اصحاب کو اتفاق ہے۔ ورنہ بے ضرورت دوسرے کاموں میں مجھے دخل دینے کا حق نہیں ہے اور نہ مشاعرے کی میرے ہاں کوئی قدر و قیمت ہے۔ مگر ایک چیز جو میرے سامنے ہے، یعنی ایک طرف مسلم قوم مفلس و نادار ہے اور دوسری طرف بے سود کاموں میں پیسہ جا رہا ہے۔ جو ضرور قابل دید شنید ہے۔"

لیجیے مشاعروں کا تو یوں بیڑا غرق ہو گیا۔ شاعروں کی اس ناقدری پر وہ کھسیانے سے ہو گئے۔

فرمان پڑھ کر انھیں یوں لگا جیسے کنگ کوٹھی کی دنیا بھی احمد حسین کی دنیا سے مختلف نہیں ہے جہاں صرف "میں" کا وجود ہے ابھی واحد حسین اخبار کی اہم خبروں میں غرق تھے کہ عین اسی وقت ان کی نواسی چاند حسب عادت پھولوں کی شاخوں میں اپنا فراک الجھاتی دوڑی ہوئی آئی۔

" نانا حضت۔ جلدی اندر چلیے۔ چھوٹے نانا حضت کا خط لے کر اردلی اورنگ آباد سے آیا ہے۔"

" ایں ۔۔۔! " وہ چونک پڑے۔ جلدی کے باوجود فرمان مبارک والا اخبار انھوں نے احتیاط سے تہہ کر کے ہاتھ میں تھاما۔

" کتنے چھوٹے نانا حضت کو بیٹا ہوا ہے۔" چاند کروٹن کے پتے کھسوٹنے لگی۔

"آ۔ ایں ۔۔۔؟" اس بار اخبار پھڑپھڑاتا ہوا دور جا گرا اور وہ بیاض چھوڑ کر اندر بھاگے۔

چند منٹ بعد وہ بیش دالان میں سب کے بیچ بیٹھے عینک کو ناک کی پھننگ میں اٹکائے خط کا آخری پیرا گراف سب کو سنا رہے تھے

" بیگم اور نومولود سلمہ سب بزرگوں کی خدمت میں قدم بوسی عرض کرتے ہیں۔ میری جانب سے بھی جمیع بزرگان کی خدمت میں قدم بوسی اور سب خورد دعا مطالعہ فرمادیں۔

والسلام
حقیر پر تقصیر
احمد حسین خاں عفی عنہ

خط خود بخود واحد حسین کے ہاتھ سے چھوٹ گرا۔ مگر ان کے ہاتھ اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ ایک وہ ہی کیا۔ یہ خط تو یہاں بیٹھنے والے سب ہی کو پتھر بنا گیا تھا، سوائے لنگڑی پھوپو کے جو منہ ہی منہ میں جانے کیا بڑبڑا رہی تھیں۔

کئی منٹ بعد واحد حسین نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو جنبش دی اور بڑی بے بسی سے ہاتھ ملنے لگے۔

"دیکھا۔ آخر اجالا بیگم نے ہمارا بیڑا کر دیا۔!"

"اونہہ اس بچے کی پیدائش ایسی کونسی اہم بات ہے۔ ایسے تو جانے کتنے بچے چچا حشمت کی ڈیوڑھی میں پل رہے ہوں گے۔"

راشد کی دلہن رضیہ کسی طرح اس بات کو ماننے پر تیار نہ تھی کہ واحد حسین کی اتنی بے شمار جائیداد کا وارث اس کے شوہر کے سوا اور کوئی بھی ہو سکتا ہے۔

"اللہ میاں" بی جانی کے نصیب کیسے کھولے۔ آن کی آن میں بیگم بن گئی۔" لنگڑی پھوپو نے بڑے رشک بھرے انداز میں کہا۔

"تھو۔ وہ اجاڑ صورت کیوں بنی چچا حشمت کی بیگم۔" واحد حسین کی بڑی لڑکی بشیر بیگم نے تنک کر کہا۔

"دیکھ لینا۔ اجالا جی تو اسے اپنی چپل کے نیچے دبا کر رکھیں گی۔ اس پر حق ہی کیا ہے۔ دو ٹکے کی چھوکری ـــــ" بشیر بیگم کو بی جانی پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا اس چھوکری کی بوٹیاں بکھیر کے پھینک دے۔

"تو کیا بی جانی واحد بھائی کی بیگم نہیں بنے گی۔" بی بی نے پہلی بار اس بحث میں حصہ لیا۔ اور واحد حسین نے دیکھا کہ بی بی کا دوسرا دانت بھی گر گیا ہے۔ مگر ان کی زہریلی مسکراہٹ میں وہی طنز تھا

جو انھوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔

بیگم بننا ہر عورت کے نصیبوں میں تھوڑی ہوتا ہے۔" اتنے عظیم سانحے کے وقت بھی واحد حسین بی بی کو جواب دینا نہیں بھولے۔

"کیا ہوا ـــــ؟ کون بیگم بن گئی ـــــ؟" قیصر کی ماں فاطمہ بیگم سوپ میں چاول لیے دالان میں آ گئیں۔

"ائی وہ تمہارے بھائی احمد میاں کے ہاں ایک چھوکری تھی۔ بی جانی کہتے۔ اس کے نصیبوں میں بھی بیگم بننا لکھا تھا۔" بی بی اپنے پوتے شاہین کا دھلا کرتا گھٹنوں پر رکھ کر ہاتھوں سے استری کرنے لگیں۔

"بیٹا ہوا ہے تمہارے بھائی صاحب کے ہاں۔ اور نام کیا رکھا ہے نگوڑا 'نومولود' کہتے۔" لنگڑی پھوپو نے طنز کیا۔

"دونوں باتیں غلط ـــــ" واحد حسین نے عینک بھنا کر تخت پر پٹکی اور شیروانی کے بٹن کھسوٹنے لگے۔

"نہ تو احمد میاں کے لڑکا ہوا ہے اور نہ اس کا نام نومولود رکھا ہے۔"

"اور یہ جو آپ نے ابھی خط پڑھا تھا ـــــ؟" رضیہ نے تعجب سے پوچھا۔ سب ہی حیران ہو کر انھیں دیکھنے لگے۔ جیسے واحد حسین نے سب کو پریشان کرنے کے لیے کوئی ناٹک کھیلا تھا۔

"میں نے یہ بھی پڑھا تھا کہ لڑکے کا نام نصیر حسین خاں رکھا گیا ہے اور لڑکا احمد میاں کے نہیں ان کی بیگم بی جان کے ہوا ہے ـــــ" انھوں نے چلا کر کہا۔ اتنی دیر میں ان کا بلڈ پریشر کئی پوائنٹ آگے بڑھ چکا تھا۔ اور وہ غصے کے مارے تھر تھر کانپ رہے تھے۔

ہاہاہا ـــــ قیں قیں قیں ـــــ فاطمہ بیگم۔ لنگڑی پھوپو رضیہ اور بشیر بیگم ہنس رہی تھیں اور اس بات کو بھول چکی تھیں کہ واحد حسین

کے آگے انھیں نہیں ہنسنا چاہیئے۔

غصے کے مارے واحد حسین کا بلڈ پریشر بڑھا اور رنج کے مارے رضیہ کے پیٹ میں پلنے والی ننھی سی جان بھی بے چین ہوگئی — اور وہ ہنستے ہنستے اندر جاکر کراہنے لگی۔

اس خبر سے سب سے زیادہ خوش ہونے والی لنگڑی پھوپو تھیں، مگر انھوں نے کسی پر اپنی خوشی ظاہر نہ ہونے دی۔

لنگڑی پھوپو کا نام گوہر بیگم تھا۔ وہ راشد کی ہم عمر تھیں اور واحد حسین کی چچا زاد بہن تھیں۔ سنا ہے وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں۔ چودہ برس کی بیٹی کے لیے ان کے ابا رشتہ ڈھونڈ رہے تھے کہ ٹرین کے ایک حادثہ میں ان کے ماں باپ دونوں مر گئے — لنگڑی پھوپو مع اپنی جائداد اور زیور، دولت کے، واحد حسین کے والد کی سرپرستی میں آگئیں۔ وہ بچارے اپنی لاوارث پوتی کے لیے اتنی احتیاط سے رشتے تلاش کرتے رہے کہ وہ پچیس برس کی ہوگئیں۔ اور جب ان کی ننھیال والوں نے دادا کو طعنے دینا شروع کیے کہ واحد حسین اور احمد حسین گوہر بیگم کی دولت پر دانت لگائے بیٹھے ہیں اس لیے ان کا ہر پیغام لوٹا دیتے ہیں، تو کرنا خدا کا یوں ہوا کہ گوہر بیگم عید کا چاند دیکھ کر اپنی قسمت جاگنے کی دعا مانگنے چھت پر گئیں اور وہاں سے چکرا کے جو گری ہیں تو نیچے سڑک پر ہوش آیا تو ان پر یہی وہم سوار رہتا کہ انھیں کسی نے پیچھے سے دھکا دے دیا — مگر "ایوان غزل" میں کون ان کی جان کا دشمن تھا! اسپتال سے گھر آئیں تو کولھے کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ ایک پاؤں لنگ کھاتا تھا۔ اب وہ لکڑی کے سہارے پورے بدن سے دوہری ہوکر چلتی تھیں۔ اب سوچیے بھلا ایسی ٹوٹی پھوٹی لڑکی سے کون بیاہ کرتا! اسی لیے "ایوان غزل" میں لنگڑی

پھوپو کے نام سے انھیں سب پکارتے تھے۔ لونڈیوں چھوکریوں کے اوپر حکم چلانے اور تمام ڈیوڑھی کا انتظام کرنے میں وہ دن بھر مصروف رہتیں۔ سب انھیں بے حد چاہتے تھے۔ ان کی ساری کڑوی کسیلی باتیں بڑوں سے لے کر بچوں تک کو ماننا پڑتیں۔ گھر کی لڑکیوں کو ان کا حکم سننا پڑتا۔ واحد حسین تو ان کی ذرا سی بیماری پر گھبرا جاتے تھے۔ اپنی بہن کی دلجوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ بچاری قسمت کی ماری بہن پر انھیں بڑا ترس آتا تھا۔ سارے گھر پر لنگڑی پھوپو کی حکومت تھی وہ اپنی جلی کٹی زبان میں جیسے جو جی میں آتا کہہ دیتی تھیں ہر ایک کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کو تیار۔

اس گھر میں صرف واحد حسین کی بیوی بی بی سے ہی ان کی مڈبھیڑ کا امکان تھا کہ نند بھاوج کی ازلی دشمنی مشہور ہے۔ مگر بی بی بڑے ٹھنڈے خون کی تھیں۔ اور تیس برس گزرنے کے باوجود وہ اپنے آپ کو "ایوان غزل" کی ملکہ کی بجائے ایک چپراسی کی لڑکی ہی سمجھتی رہیں۔ انھوں نے اپنے سارے اختیارات لنگڑی پھوپو کو سونپ دیے تھے۔ اور خود سارے گھر کی ذمہ داریوں سے الگ تھلگ بناؤ سنگار کیے، خوشبو میں بسے۔ چم چم کرتے کپڑے پہنے، کلائیوں میں سنہرے نگوں کا جوڑا چمکاتی مسہری پر بیٹھی رہتی تھیں۔ یا پھر ناولیں پڑھنے میں وقت گزرتا۔ ماماؤں سے شہر کی اہم خبروں پر تبصرہ ہوتا۔ یا پھر پردہ لگی موٹر میں بیٹھ کر وہ رشتہ داروں کے ہاں ملنے چلی جاتیں — انھیں بالکل خبر نہ ہوتی کہ آج گھر میں امباڑے کی بھاجی پکی ہے یا پالک کی۔ واحد حسین کا کن کن چیزوں سے پرہیز ہے۔

البتہ واحد حسین کمرے میں آتے تو وہ نئی دلہنوں کی طرح سمٹ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کی ہر خواہش، ہر حکم کو بسر و چشم قبول کرنے کو تیار،

واحد حسین کو نوابی قسمت ملی تھی نہ شاہانہ ٹھاٹ۔ اسی لیے ان کی
آواز میں بڑی شائستگی تھی۔ ان کی زبان بڑی مصلحت پسند تھی جو
ضرورت پڑنے پر شہد بھی بن جاتی اور زہر بھی۔ اس لیے ان کی
بات کرنے کے بھی دو اسٹائل تھے۔ ایک وہ پرمزاح اور شفقت
آمیز زبان، جس سے وہ نوکروں اور دوستوں سے بات کرتے تھے۔
اور ایک وہ پرشکوہ انداز جو اپنے آگے اور کسی کو نہ مانتا تھا۔ لیکن
اس کے علاوہ بھی واحد حسین کا ایک اور روپ تھا۔ وہ عاجزانہ اور
نیازمندانہ ایک عاشق کا انداز جو صرف بی بی کے لیے مخصوص تھا
کیوں کہ بندگی بھی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ کبھی کبھی اپنا سب
کچھ کسی کو سونپ کر۔ کسی کے حوالے کر کے بھی کیسی راحت ملتی ہے۔
اپنے وجود سے انکار کر کے ۔۔ واحد حسین نے بھی بی بی کو اپنی ساری
چابیاں سونپ دی تھیں ۔۔ یہ وہ عورت تھی جس نے پچیس برس کی
عمر میں پچیس عشق کرنے والے واحد حسین کو اپنے پاس بٹھایا تو پھر وہ
اور کسی طرف نہ دیکھ سکے۔ مگر اس ڈیوڑھی میں لاکر۔ تین بچوں کی
ماں بنا کر بھی بی بی ان کے ہاتھ نہیں آتی تھیں۔ اب وہ بیچارے باغ
میں بیاض کھولے صبح کا انتظار نہ کرتے تو کیا کرتے!

خط ہاتھ میں تھامے واحد حسین بڑی دیر تک سوچتے رہے کہ
آج صبح ہی بڑی بے تکی ہوئی تھی۔ کبھی ایسا ہوا نہ تھا کہ اتنے ہاتھ
پاؤں مارنے پر بھی ایک مصرعہ ہاتھ نہ آئے ۔۔ اخبار میں کوئی
اچھنبا نہ نکلے۔ مگر اچھنبا تو کمبخت خط کے اس پرزے میں چھپا بیٹھا تھا
یہ چاند بھی کیسی نکمّی نکلی۔ جانے کیوں اپنے دادا کا گھر چھوڑ کر
یہاں پڑی رہتی ہے۔ صبح ہی صبح سبق پڑھا نہ نماز۔ بس چلی آئی
یہ منحوس خبر سنانے۔ جبھی تو لوگ لڑکیوں کی پیدائش پر سر پیٹ

لیتے ہیں۔

"دلہن بھابی، آپ آج ہی بشیر بیگم سے اجالا بھابی کو خط لکھوا دیں
کہنا کہ اس اجاڑ صورت بی جانی کو زیادہ منہ نہ لگاؤ۔ بچے کے لیے
کوئی کرسٹان آیا رکھو۔ نہیں تو اس کمینی کا دودھ پی کر بچہ بھی ویسا ہی نیچ
ہو جائے گا۔

"پھر تو وہ سچ مچ کا نواب بنے گا نا گوہر بیگم۔" بی بی نے مسکرا کے
گوہر بیگم کی طرف دیکھا۔ "اچھا ہوا اجالا بیگم کو اپنی دولت کا وارث
مل گیا۔"

"تھو ۔۔ کیا دولت ہے ان کے پاس۔" رضیہ نے بھنویں سکیڑ
کے کہا۔۔"

"بس اجالا جی اتراتی بہت ہیں اپنی دولت پر۔"

"اجی نہیں رضیہ دلہن، ہاتھی مرا بھی تو سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔
اجالا بیگم کے خاندان والے بڑے پیسے والے لوگ تھے۔ وہ جو
قصے کہانیوں میں دولت مندوں کی باتاں لکھی ہیں نا، وہ سب اسی
خاندان کی باتاں ہیں۔ میں سب سن چکی ہوں وہاں کے قصے۔ لنگڑی
پھوپو گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کے اجالا بیگم کا ماضی دیکھنے لگیں۔

اندر والے کمرے میں شاہین رو رہا تھا۔ رضیہ اپنے کمرے میں
جا کر کراہنے لگی ۔۔ جہاں واحد حسین بیٹھے تھے، اس کے بالکل پیچھے
والے کمرے میں چاند ناچ ناچ کر گا رہی تھی۔

"میرے چھوٹے سے من میں چھوٹی سی دنیا رے۔

چاند آٹھ برس کی تھی۔ مگر ابھی سے اس کی ماں بشیر بیگم، بیٹی کی
خوبصورتی پر نظر ڈال کر کانپ جاتی تھیں۔ ان کے خاندان میں تو خوبصورت
لڑکیاں زہر کھا کر مریں یا کسی محل میں قید کر دی گئیں۔

حسن چاہے بی بی کی طرح کسی چپراسی کی جھونپڑی میں چھپا بیٹھا ہو مگر فتنے کھڑے کر ہی دیتا ہے۔ اور دکن کی کہانی تو بھاگ متی سے لے کر بی بی تک عشق ہی کے مختلف رنگوں سے چمک رہی تھی۔ مگر اب زمانہ بدل گیا تھا اور اس بدلے ہوئے زمانے کا سب سے بڑا ثبوت بشیر بیگم کے شوہر حیدر علی خاں تھے۔ حیدر علی خاں یوں تو بشیر بیگم کے دور کے رشتے سے بھائی بھی لگتے تھے۔ لیکن وہ لندن سے بیرسٹری پاس کر کے آئے تھے۔ اور بڑے نیشنلسٹ خیالات کے حامی تھے۔ ابھی حیدر آباد میں قوم پرستی کی کوئی لہر نہیں ابھری تھی۔ اتحاد المسلمین کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ لیکن بہادر یار جنگ کی سیاسی اہمیت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ حیدر آباد کے دفاق کے سخت مخالف تھے۔ اور حیدر آباد کو ایک خود مختار ریاست دیکھنا چاہتے تھے۔

اس کے برعکس حیدر علی خاں جیسے باشعور لوگوں کا بھی ایک حلقہ تھا جو یورپ کی سیاسی تحریکوں کا مطالعہ کر چکا تھا۔ پنڈت نہرو کی بنائی ہوئی کانگریس کی پالیسی کو پسند کرتا تھا یہ لوگ فاشزم کے خطرے کو سروں پر منڈلاتا ہوا دیکھ رہے تھے یوں تو ہندوستان میں ہٹلر اور مسولینی کے خلاف عوام متحد تھے۔ مگر ابھی حیدر آبادی عوام دنیا کی سیاست سے بہت کم واقف تھے۔ جب حیدر علی خاں نے لندن سے آ کر بشیر بیگم سے شادی کی ہے تو حیدر آباد کی سیاست بھی کروٹیں بدل رہی تھی۔ جوش کی شاعری اور قاضی عبدالغفار کی کوششوں سے کچھ نئے رجحانات بیدار ہو رہے تھے۔ سروجنی نائیڈو کانگریس میں شریک ہو کر کام کرتی تھیں۔ اور ان کی قیادت میں حیدر آباد میں بھی نئے رجحانات رکھنے والوں کا ایک حلقہ ابھرنے لگا تھا۔ اس کے سب سے سرگرم کارکن حیدر علی خاں تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال "بال جبریل" لکھ کر

ہندوستانی نوجوانوں کو بیداری کا پیغام دے رہے تھے اور ٹیگور 'گیتانجلی' سنا چکے تھے۔ مگر حیدر آباد میں اقبال کی غزلیں ڈیوڑھی میں ہونے والی قوالیوں میں سنی جاتی تھیں اور نا انصافیوں تلے پسنے والے بوڑھے جاگیردار، حقیقت منتظر کو لباسِ مجاز میں بلانے پر اپنی ڈاڑھیوں سے آنسو پونچھ لیا کرتے تھے۔ بشیر بیگم نے کبھی کوشش نہیں کی کہ اپنے دولھا کے خیالات کو سمجھیں۔ وہ ابھی چھٹی ساتویں کلاس میں تھیں کہ ان کی شادی ہو گئی۔ اس زمانے میں عام طور سے لڑکیوں کا پڑھنا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جہیز کی دولت اور اونچا خاندان ہی انھیں سسرال میں برتری کا احساس دیتا تھا۔ بشیر بیگم تو بی بی کی خوبصورتی کا حصہ بھی لائی تھیں۔ یوں بھی "ایوان غزل" کا حسن کا جادو مشہور تھا۔ اس لیے وہ اپنے ولایت پاس میاں کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ اور اس بات پہ اترائی اترائی پھرتیں کہ ان کا دولھا بالکل انگریزوں کی طرح روز صبح نہاتا ہے۔ انگریزی میں باتیں کرتا ہے۔ اور اس نے ایک اونچی پہاڑی پر ایسا مکان بنوایا ہے جس کے دروازوں میں کنڈیاں اور زنجیریں نہیں ہیں۔

حیدر علی خاں نے طے کر لیا تھا کہ ان کی بیٹی چاند سلطانہ ڈاکٹر بنے گی۔ اس لیے انھوں نے چاند کو کانوینٹ میں داخل کیا تھا۔ اسے نئے زمانے کی ایک خود مختار عورت بننا تھا۔ اس لیے شام کو وہ ایک ڈانس اسکول بھی جاتی، اسکرٹ پہنتی۔ اس کے بال میموں کے ڈھنگ پر کٹے ہوئے تھے اور وہ اپنے ڈیڈی سے انگریزی میں بات کرتی تھی۔

چاند کی اس بدلی ہوئی روش پر اس کی ننھیال میں بڑی لے دے ہوئی۔ خود داحد حسین کو اپنی نواسی کی ننگی ٹانگیں بالکل اچھی نہ لگتی تھیں۔ مگر وہ اپنے ولایت پلٹ داماد سے بڑے مرعوب تھے۔ اور ان کی ہر بات کو بے سوچے سمجھے مان لیا کرتے تھے کہ قابل آدمیوں کی ہر بات میں کوئی

نہ کوئی اچھی بات پوشیدہ ہوتی ہے۔

لیکن چند برس بعد شمالی ہند کے ادب میں ایک نئی تحریک ابھری اور حیدرآباد میں سروجنی نائیڈو کی زیر قیادت ترقی پسند ادیبوں کا پہلا جلسہ ہوا تو اس کے کرتا دھرتا حیدر علی خاں تھے۔ داماد کے کرتوتوں سے واحد حسین بہت خوف زدہ تھے۔ جب داماد ہی کمیونسٹوں اور دہریوں کی حمایت کرنے کھڑا ہو جائے تو اپنا بیڑا ہی غرق سمجھو۔

فرض کرو کسی باریابی کے موقع پر حضور، حیدر علی خاں کے بارے میں سوال کر ڈالیں تو واحد حسین کیا جواب دیں گے؟

اس لیے ایک دن حیدر علی خاں سسرال کی دعوت کھا کر جانے لگے تو واحد حسین نے بڑی میٹھی زبان میں بولنا شروع کیا۔

"آپ انگریزوں کے خلاف تقریراں کرے تو ٹھیک ہے۔ مگر ان دہریے غنڈوں کی باتوں میں آکے پولیس کے ہتے چڑھ گئے تو میرے کو نکو بولو۔ بھلا شریف خاندانی لوگوں کا ان غنڈوں چھوکروں میں کیا کام" ——— پھر انھوں نے سوچا نوجوانوں کو ہمیشہ مستقبل کے خوف سے ڈرانا چاہیئے کہ وہ صرف اسی طرف دیکھا کرتے ہیں۔

ذرا تو سوچو حضت! اگر ان کمنسٹوں کا راج ہو گیا تو شریف لوگوں کی عزت کاں باقی رہنگی! کبھی دنیا میں ایسا ہوا ہے کہ غریب اور امیر برابر ہو جائیں۔ پھر کاہے کو آپ جپ چپ بوم ٹپارہ مچاویں؟

حیدر علی خاں جانتے تھے کہ ان کے خسر جس انداز سے سوچتے ہیں، وہ صحیح ہے۔ کیوں کہ ہر انسان کے ساتھ اس کا ماضی، اس کا تجربہ اور مفاد ہوتا ہے۔ جو اسے ایک خاص نقطۂ نظر قایم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن یہی مصیبت خود حیدر علی خاں کے ساتھ تھی۔ ان کی نظر تمام دنیا کے حالات پر تھی۔"

ہندوستان کی سیاست اور ہندوستانی عوام کی جدوجہد کے نتائج کو وہ کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کے سر پر وطن پرستی کا جو بھوت سوار تھا، وہ رزق کے بھوت سے کسی طرح کم نہیں تھا۔"

اس کے باوجود جب وہ سسرال آتے تھے تو واحد حسین سے ایک چھیڑا کرنے میں انھیں کافی لطف آتا۔

"جی فرمایئے اباجان کچھ نئی خبریں ——— ؟" وہ کھائی کر اطمینان سے بیت الغزل کے آراستہ ہال میں جا بیٹھتے۔

"ہم کیا خبریں سناتا ——— ؟" واحد حسین بھی فوراً پائپ سلگا کر آرام کرسی پر دراز ہو جاتے تھے۔

"وہ آپ کی صوبائی خود مختاری کا خواب تو خوب سچا ہوا میاں" واحد حسین کو ہنسی آجاتی۔"

لیکن سوٹ بوٹ میں ملبوس حیدر علی خاں کو خسر کے سامنے بڑے ادب کے ساتھ سر جھکا کر بیٹھنا پڑتا تھا۔

"جی ہاں ـــ بجا ارشاد فرمایئے آپ۔ لیکن دیکھیئے تو اباجان ایک یہی فایدہ ہو گیا نا کہ ہمارے دلوں سے ہر چیز کا خوف نکل گیا ـــ غیر ملکی طاقت کا خوف ـ نئے تجربوں کا خوف ـــ نئے اقدامات کا خوف اظہار رائے کا خوف ـــ یہ بھی بہت بڑی بات ہوئی ہے۔"

"اجی کیا باتاں کرتے آپ دولھا بھائی ———" راشد بھی ایک کرسی کھینچ کر ان کے قریب آبیٹھا تھا۔ ویسے اسے پالیٹیکس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن شمالی ہند میں جو طوفان اٹھ رہے تھے ان کا تھوڑا بہت اثر یہاں بھی ہر سمجھدار و تعلیم یافتہ انسان پر ہوا تھا۔

"اپن تو ایک بات بولتے ہیں دولھا بھائی کہ ریاستوں کا الحاق

ہوا تو اپنے ٹھاٹھ باٹ ختم ہو جائیں گے۔ منصب، جاگیریں سب چھن جائیں گی۔ بڑے بڑے عہدے سب ہندوستانیاں جھپٹ لیں گے!

"خیر۔ جاگیرداری تو بہرحال ختم ہو ہی جائے گی ـــــــــ لیکن جمہوریت میں ترقی پسند عناصر ـــــــ" حیدر علی خاں ٹھہر ٹھہر کر بات کرنا چاہتے کہ واحد حسین ان کی بات کاٹ دیتے۔

"معاف کرنا میاں۔ آپ کے ان ترقی پسندوں سے تو اللہ بچائے کیا بے معنی شاعری۔ کیا مخش کہانیاں ـــــ استغفراللہ ـــــ اور آپ ہیں کہ ان کے سب سے بڑے حامی بنے پھرتے ہیں۔"

حیدر علی خاں سٹپٹا جاتے۔ ہزاروں سال سے عیش کرنے والے ان بڈھوں سے نپٹنا مشکل تھا۔ ان کی بیرسٹری والی زبان کا سارا زور ختم ہو جاتا اور وہ رک رک کر کہتے۔

"بات یہ ہے اباجان کہ ادب میں بھی نئے تجربے کیے جا رہے ہیں جاگیرداری سماج میں ادب کو صرف عیش و عشرت اور تفریح کا ایک ذریعہ سمجھا گیا۔ غزل میں صرف عورت کے حسن کے سوا اور کوئی موضوع نہیں ملتا ـــــ لیکن اب ادب میں نئے موضوع ـــــــ

"اجی رہنے دو میاں ـــــ شاعری کا کون سا موضوع ہے جو نیا ہوں گا ـــــ؟" واحد حسین باپ کی ممتا کو جھٹک کر کہتے ـــــــ "وہی عشق و عاشقی کا موضوع ـــــ بھلا اس میں کیا جدت ہو سکتی ہے ـــ"؟

(ایسے وقت وہ خود اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتے کہ انھوں نے عشق میں کیسی جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔)

"اب آپ ہی بتاؤ حضت کہ شاعری میں معشوق کی بجائے شاعر کس کی سراپا نگاری کرے گا؟ بھلا مزدوروں کے کام پر کہیں غزل لکھی جاتی ہے؟" یا پھر مشینوں کے پرزوں کی تعریف ہوتی ہے۔

(اس بات پر راشد اور واحد حسین کو بڑے زور کی ہنسی آجاتی تھی ـ")

"اور پھر یہ بتایئے دولھا بھائی کہ آپ کے کمیونزم کے دور میں یہ کیا انصاف ہوگا کہ ہماری دولت چھین کر آپ غریبوں کو دیدیں گے۔ یہ بھی تو سخت ناانصافی ہوگی تاکہ ڈھیمڑ چمار کسی خاندانی نواب کے برابر ہوجائیں۔" راشد کافی سنجیدہ ہوگیا تھا۔

"لیکن ایسی تو بہت سی ناانصافیاں سہنے کے لیے تیار ہو ہی جایئے راشد میاں۔" حیدر علی خاں کی آواز میں اب کافی تلخی آجاتی تھی۔

"جب الیکشن جیت کر کوئی کھیت مزدور آپ کا آقا بن جائے گا تب آپ انصاف کی بات سوچنا۔"

ایسے موقعوں پر واحد حسین کا بلڈ پریشر اچانک بڑھ جاتا تھا اور وہ بڑے غصے میں کہتے۔

"دیکھو حیدر پاشا! آپ کے خلاف سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹ اعلیٰ پاشا تک پہنچ گئی ہے کہ آپ فاشزم کے بہانے بین الاقوامی حالات کا سہارا لے کر اندرونی سیاست پر تقریریں کرتے ہیں۔ کمیونسٹوں کے جلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔" وہ داماد کو خطرے سے آگاہ کرتے۔

یہ شہریور کا مہینہ تھا۔

فضا میں ایک طرح کی غنودگی اور مستی آمیز کیف سا چھایا ہوا تھا۔ "ایوانِ غزل" میں فضا اور بھی خوشگوار سی لگتی۔ کیوں کہ اس ڈیوڑھی کے مکین اپنی اپنی ذات میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان کا باہر کی

دنیا سے بہت کم رابطہ تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کرپس کی تجاویز کانگریس نے رد کر دی تھیں اور جناح کے پیچھے مسلمان چلاتے پھر رہے تھے۔

لے کے رہیں گے پاکستان ـــــ پل ٹوٹ رہے تھے۔ ریاستیں لڑھک رہی تھیں۔ ہندوستان کے تمام اہم لوگوں نے "سر" کے خطاب واپس کر دیے تھے۔ لیکن حضور نظام کو ان خبروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ روز رات کو ایک غزل کہتے تھے جو مقامی اخباروں میں استاد جلیل کی رائے کے ساتھ پہلے صفحے پر شائع ہوتی تھی۔ اور اس اخبار کو عوام احتراماً کبھی ردی کی ٹوکری میں نہ پھینکتے تھے۔ مالک سے وفاداری اور محبت دکن کے عوام کے دلوں میں سرایت کر چکی تھی۔ ہر روز جب حضور نظام کی سواری سڑکوں سے گزرتی تھی تو قطاروں میں کھڑے ہوئے عوام ان کے دیدار کے لیے گھنٹوں ٹھہرتے تھے۔ اور تا ابد اس ریاست کے قائم رہنے کی دعائیں صبح شام کرتے تھے۔

اس دن بھی "ایوان غزل" میں حسب معمول صبح کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ واحد حسین باغ کی سیر سے فارغ ہو کر اخبار لیے اندر آئے تو چاند سامنے دالان میں ناچ رہی تھی۔ مگر نانا حضرت کو اندر آتے دیکھ کر وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپاتے رضیہ کے کمرے میں بھاگ گئی۔ چھٹی کا سارا دن وہ اپنی ننھیال میں گزارتی تھی۔ کیونکہ گھر میں ڈیڈی بات بات پر اسے ٹوکتے تھے۔ لیکن یہاں وہ اپنے ماموں اور ممانی کی بڑی چہیتی تھی۔

چاند کی اس بدلی ہوئی روش پر سب سے زیادہ بی بی خوش تھیں۔ کیوں کہ وہ ایک جھونپڑی سے اس ڈیوڑھی میں آئی تھیں اور جانتی تھیں کہ عورت چاہے محل میں ہو یا جھونپڑی میں وہ ایک ہی دائرے میں گھومتی رہتی ہے۔ لیکن چاند کو پڑھتے دیکھ کر انھیں آس بندھتی کہ وہ اس دائرے کو توڑ کر نکل جائے گی۔

واحد حسین اندر آئے تو ان کی آمد کا خلاف توقع کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ کیوں کہ اندر رضیہ دردوں سے تڑپ رہی تھی اس لئے لنگڑی پھوپو اور بی بی وہیں اسے تھامے بیٹھے تھے۔ دالان میں سرخ مدرے کا دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ اس پر بڑی بڑی قابوں میں کھچڑی مسکہ، قیمہ، اچار، پاپڑ، اور واحد حسین کے لیے ابلے ہوئے انڈے رکھے تھے۔ اور مالن بی سر پر پلو ڈالے ہاتھ میں پنکھا لیے بیٹھی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ واحد حسین کھانا شروع کر دیں۔ واحد حسین معاملے کی نزاکت سمجھ گئے۔ اس لیے آواز کو دھیما کر کے مالن بی سے پوچھا۔

"راشد میاں کہاں ہیں ـــ؟

"جی انوں موٹر لے کر ڈاکٹرنی کو لانے گئے ہیں۔"

"ہونھ ـــ" واحد حسین نے بے دلی سے بیسن کے آگے ہاتھ بڑھا دیے اور جب سلارو نے ان کے ہاتھ دھلا کر تولیہ بڑھائی تو انھوں نے دسترخوان پر بیٹھ کر وہی تولیہ اپنے گھٹنوں پر پھیلا دی اور بسم اللہ کر کے کھچڑی کی قاب کھولی۔ مگر آج ان کا جی کھانے میں نہیں لگ رہا تھا۔ دوسرے پوتے کی آمد کی خوشی اور گھبراہٹ دونوں بیک وقت انھیں بے چین کیے دے رہی تھیں۔

آج اس گھر میں ایک نئے فرد کی آمد ہے ـــ ابھی کل ہی انھوں نے راشد کے پیدا ہونے کی خوشخبری سنی تھی ـــــ بالکل ایسی ہی صبح تھی ـــ ایسا ہی موسم ـــــ اور آج راشد کا دوسرا لڑکا آ رہا ہے ـــ یہ نئے نئے بچے کیا کرنے آ رہے ہیں ـــــ واحد حسین کا ہاتھ رکابی میں تھم گیا ـــــ ٹھیک کو رکھتے ہیں خدا دنیا سے

مایوس نہیں ہے اس لیے نئے بچے کو بھیجتا ہے۔ لیکن وہ ہر پرانے بچے سے مایوس ہو چکا ہے۔ یہ بھی تو دیکھیے۔ قرض اور رہن کی دبی بھری جائداد کے لیے بھائیوں کی لڑائیاں بے ایمانی اور دھاندلی۔ اونچے عہدوں اور خطابوں کے لیے بھاگ دوڑ ۔۔۔ اور پھر کسی عورت کے لیے سب کچھ ہار دینا ۔۔۔ بس واحد حسین کے لیے زندگی کا مقصد یہی تھا ۔۔۔ ہر انسان صرف اپنے ہی لیے تو جیتا ہے۔ نواسوں پوتوں کی خوشی دیکھنا۔ بیٹے کو پھلتے پھولتے دیکھنا۔ تاکہ اپنی انا کی تسکین ہو سکے ۔۔۔ آج وہ اپنی ترکی ٹوپی کو ذرا اور اونچا کر کے نکلیں گے دو پوتوں کے دادا ۔۔۔ دو لاکھ کے مالک ۔۔۔ ہر پوتے کو وہ ایک پرامیسری نوٹ بنا کر کیش کر لیں گے ۔۔۔ اسی لیے تو بیٹے کی آمد پر خوشی منائی جاتی ہے۔

آنگن میں بسم اللہ بی اپنے بچے کو مار رہی ہے۔

شاہین کی آیا اسے جو کپڑے پہنا رہی ہے وہ شاہین پہننا نہیں چاہتا اس لیے وہ بار بار قمیض اتار کے چلا رہا ہے۔ شاہین کو ضد کرتے دیکھ کر واحد حسین نے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا اور آیا کو ڈانٹ دیا کہ چھوٹے نواب کی مرضی کے بغیر ان کا کوئی کام نہ کیا جائے۔ انھیں اپنا پوتا بے حد عزیز تھا۔ اتنا پیارا کہ اس کے مقابلے میں اپنا پڑھا لکھا جوان بیٹا بھی اچھا نہ لگتا۔ وہ لوگوں سے مسکرا کے کہتے تھے ۔۔۔ " بات یہ ہے کہ اصل سے سود پیارا ہوتا ہے۔"

" اری او قیصر۔ ذرا بابا کی ریتی اٹھا لانا۔" آیا نے پکارا تو قیصر دوڑی دوڑی آئی۔ نو دس برس کی دبلی پتلی سی لڑکی تھی۔ اٹنگا سا پاجامہ اور پھٹا ہوا میلا کرتا پہنے۔ اس کی صورت دیکھیے تو سب سے پہلے اس کی روشن آنکھوں پر نگاہ جاتی جو دیوں کی طرح

جھلملاتی سی لگتیں۔ اور وہ پلٹ کر جانے لگتی تو اس کی غیر معمولی لمبی چوٹی پر نظر ٹھہر جاتی تھی۔ اتنی سی لڑکی کی اتنی بڑی چوٹی ۔۔۔!

قیصر آ کر واحد حسین کے پاس کھڑی ہو گئی تو انھوں نے غور سے دیکھا۔ آج انھیں بڑا تعجب ہوا۔ یہ اتنی بڑی ہو گئی!

" یہ فاطمہ بیگم کی بیٹی ہے نا۔؟ قیصر اکثر ڈیوڑھی میں آتی رہتی تھی مگر واحد حسین نے اسے بہت زمانے سے نہیں دیکھا تھا۔

" جی ہاں بھائی ۔۔" فاطمہ بیگم چاول صاف کرتے کرتے سر پر پلو سنبھال کر پیچھے آ کھڑی ہوئیں

" اتنی بڑی ہو گئی ہے بھائی جان بچی۔ پڑھنے کی بہت ضد کرتی ہے۔ کیا کروں۔ اس کے باوا کا انتظار کرتے کرتے ہار گئی۔" آن زمانے سے انتظار میں بیٹھی ہوئی فاطمہ بیگم نے اپنی عرضی ان کے حضور میں پیش کر دی۔ مگر بہت ڈرتے ڈرتے نہایت دھیمی آواز میں۔ واحد حسین شاہین کو سنبھالے خاموش بیٹھے رہے۔

" ہاں واقعی تمھیں بڑی مشکل ہو رہی ہو گی۔ خیر اگلے مہینے سے دس روپے ہر مہینہ یہاں سے لے جایا کرو۔"

" مگر قیصر کے باوا ۔" فاطمہ بیگم سے شرم اور غم کے مارے پوری بات نہیں کہی گئی۔

" وہ تو مجبوری ہے فاطمہ بیگم " واحد حسین نے انھیں رسان سے سمجھایا۔

" احمد میاں بچارے کیا کر سکتے ہیں؟ اگر غلام رسول کو چھوڑ دیں تو دوسرے کھیت مزدور بھی کہیں گے کہ ہمیں بھی چھوڑ دو ۔۔۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی بچی کو لے کر اورنگ آباد چلی جاؤ۔"

" جی ہاں ۔۔ مگر قیصر نہیں جاتی۔ اسے اجالا بھابی سے بہت

ڈر لگتا ہے۔ یہ اجاڑ صورت تو مجھے کہیں چین نہیں لینے دیتی۔" فاطمہ بیگم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور مایوسی کے ساتھ پھر چاول صاف کرنے لگی۔

فاطمہ بیگم وہ خاردار جھاڑی تھیں جو پھولوں کی کیاری میں نکل آتی ہے واحد حسین کے ابا بچوں کی آئے دن کی پیدائش سے گھبرا گئے۔ اور کسی ستم پیشہ معشوقہ کے غم میں نڈھال پڑے تھے تو جی بہلانے کے لئے انھوں نے فاطمہ بیگم کی ماں سے عقد کر لیا۔ مگر سال بھی نہ گزرا تھا کہ وہ بیوی بھی میاں کی صورت دیکھ کر ابکائیاں لینے لگی۔ کہتے ہیں جب نواب صاحب نے یہ خبر سنی تو مارے طیش کے اس عورت کو کوٹھری میں بند کر دیا۔ اور پھر جب یہ خبر سنی کہ ایک عدد صاحبزادی تشریف لائی ہیں تو نڈھال ہو کر گر پڑے۔ واحد حسین کہتے تھے کہ اس دن کے بعد اباجان کو لوگوں نے لحد میں اتارنے کے لیے ہی اٹھایا بعد میں واحد حسین اور احمد حسین نے وصیت نامہ دیکھا تو اس میں کہیں فاطمہ بیگم کی ماں کا ذکر نہ تھا۔ اور نہ اس بات کا کوئی ثبوت ملا کہ ان کے ابا نے کوئی اور نکاح کیا تھا۔

احمد حسین تو یہ سمجھتے تھے کہ اب یہ بلا زندگی بھر کے لیے گلے پڑ جائے گی مگر واحد حسین نے بڑی ہمدردی سے کام لے کر فاطمہ بیگم کی ماں کو کچھ ماہانہ مقرر کر دیا کہ لاوارث بے سہارا عورتوں کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے اور پھر بارہ تیرہ برس کی فاطمہ بیگم کا عقد احمد حسین کے ایک کھیت مزدور غلام رسول سے کر دیا۔ یہ شادی انھوں نے اپنے خرچ سے کی تھی۔ مگر اتنے بڑے جاگیردار کی منہ بولی بہن کو بیاہنے کے لیے غلام رسول کے باپ کو کچھ پیسے کی ضرورت پڑی اس لیے اس نے احمد حسین کے ہاں اپنے بیٹے کو پانچ سو روپے کے

عیوض رہن رکھ دیا۔ اس وقت گاؤں میں کھیت مزدوروں کو بڑی آسانی سے رہن رکھا جاتا تھا۔ مقررہ میعاد تک مزدور دن رات مالک کا کام کرتا تھا۔ اس میں اس کا کھانا اور کپڑا شامل نہیں ہوتا۔ اس دوران اسے مالک کے پیسے لوٹا دیتے ہوتے۔ ورنہ رہن کی میعاد اور بڑھ جاتی تھی۔ اور کوئی مزدور معاہدے کی خلاف ورزی کر کے کہیں بھاگ جاتا تھا تو گاؤں میں اس کی کوئی عزت باقی نہ رہتی۔ کیوں کہ انسان کی زبان ہی تو سب سے زیادہ قابل بھروسہ شے ہے۔ جو شخص اپنی زبان سے پھر جائے اسے کون عزت دے گا یہ بھی گاؤں کا ایک ایسا قانون تھا جو دوسرے قوانین کی طرح ہر ایک کو قبول کرنا پڑتا۔ اس لیے غلام رسول بھی دن بھر احمد حسین کے کھیتوں میں کام کرتا۔ وہاں کام نہ ہوتا تو اجالا بیگم ڈیوڑھی میں دوسرے کاموں پر لگوا دیتیں۔ لکڑیاں پھاڑنا۔ سرکار کے پاؤں دبانا بیگم صاحب کے کپڑے دھونا۔ گوڑی بھیرا بازار کا کرنا۔ یہ اور دوسرے سارے چھوٹے موٹے کام تھے۔ فاطمہ بیگم بھی چلی جائیں تو ایک ماما اور ایک چھوکری کو اجالا بیگم اور نکال دیتیں۔ تنخواہ دے کر نوکر رکھو تو اس کے چلے جانے کا بھی ڈر ہوتا ہے۔ مگر انھیں معلوم تھا کہ فاطمہ بیگم اور قیصر کہیں نہیں جائیں گی۔ اس لیے وہ دن رات جوتی لیے ان کے سر پر سوار رہتیں۔ فاطمہ بیگم ہر ظلم سر جھکا کر سہہ لیتیں۔ مگر قیصر بڑی منہ پھٹ اور زبان دراز تھی۔ کئی بار اس نے پلٹ کر اجالا بیگم کو منہ توڑ جواب دیا اور اپنا منہ ان کے جوتوں سے کچلوا کے وہاں سے نکلی۔ اس طرح بارہ برس گزر گئے۔ فاطمہ بیگم کا دولہا اپنا قرض ادا نہیں کر سکا تھا اس لیے رہن پڑا تھا۔

فاطمہ بیگم شہر آ گئی تھیں۔ کہیں ایک جھونپڑی میں رہتی تھیں۔

پیٹ بھرنے کے لیے پاپڑ اور اچار بنا کر بیچتیں۔ قیصر اسکول جاتی تھی۔ باقی وقت میں فاطمہ بیگم عزیزوں رشتہ داروں کے ہاں چھوٹے موٹے کام کر کے کچھ پیسے لے آتیں۔ ہر مہینے چار پانچ دن کے لیے وہ بی بی کے ہاں آجاتی تھیں۔ اچار ڈالنے۔ مسالے کوٹنے اور چاول صاف کرنے کے بہانے بی بی انھیں تین چار روپے دے دیتی تھیں۔ اس کے علاوہ پھٹی پرانی ساڑیاں جی سے اترے ہوئے کپڑے اور خیر خیرات کی مستحق بھی وہی سمجھی جاتی تھیں۔ قیصر اوپر کے کام پر لگادی جاتی۔ مگر قیصر اپنی ماں کے برخلاف بڑی تیز مزاج تھی۔ محلے کے ہر بچے سے فوراً لڑنے بیٹھ جاتی جب وہ چھوٹی سی تھی تو چاند اسے پیپرمنٹ کی گولی کے بہانے کونین کی گولی کھلا دیتی تھی۔ راشد ایک پیسہ دینے کے بدلے اسے ایک گھنٹے تک گرمی کی دھوپ میں کھڑا کر دیتا تھا۔ پھر جب وہ پیسے کا مطالبہ کرتی تو اسے انگوٹھا دکھا کر سب کا ہنستے ہنستے برا حال کر دیتا تھا۔

"توبہ۔ پیسے کا کتنا لالچ ہے اس چھوکری کو ابھی سے۔" جتیر بیگم ناک سکوڑ کر کہتیں۔

جب بعنیہ اپنے جہیز کے گراموفون پر ببّو اور سریند رکا ریکارڈ بجاتی۔

"تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا" تو قیصر سخت حیران ہوتی۔ اسے یقین تھا کہ یہ سب چاند کی شرارت ہے۔ وہی اس صندوق میں چھپ کر گاتی ہے۔

سارا گھر قیصر سے نوکروں کی طرح کام لیتا تھا۔ لنگڑی پھوپو اس سے اپنے پاؤں دبواتیں۔ بتول اپنے بچوں کو تھما دیتی۔ واحد حسین کو فاطمہ بیگم کے ہاتھ سے بنے ہوئے اچار چٹنیاں بہت پسند تھیں۔

اس لیے فاطمہ بیگم سم چھیلتیں تو قیصر مسالہ کوٹتی۔ چاول صاف کیے جا رہے ہیں۔ دونوں ماں بیٹیاں مل کر چولھے سنوارتیں۔ رضائیوں لحافوں میں دھاگے ڈالتیں۔ زندگی گرم دودھ بن گئی تھی کہ نگلتے بنتی نہ اگلتے۔ بدلے میں تین چار دن کھانا مفت مل جاتا تا بشیر بیگم چاند کی پرانی فراکیں دے دیتیں کہ یہ چاند کے چھوٹی ہو گئی ہیں حالاں کہ قیصر چاند کی ہم عمر تھی اور قد میں چاند سے لمبی لگتی تھی۔ وہ چاند کی اترن پہنتے وقت بہت روتی تھی۔ کیوں کہ چاند کی اس سے کبھی نہ بنتی۔ وہ چاند کی اترن پہنتے وقت خوب شور مچاتی اور دانتوں سے فراک پھاڑ دیتی تھی کیوں کہ چاند اور اس کی سہیلیاں مل کر اسے خوب چڑاتی تھیں۔ چاند کا خیال تھا کہ قیصر نانی کے ہاں سے بہت سی چیزیں چرا کر لے جاتی ہے۔ جبھی تو ایک بار اس کی ربن کھو گئی تھی اور ایک بار فاطمہ بیگم کے جاتے ہی رضیہ کے پرس میں ایک روپیہ کم تھا۔

مگر بتول بیگم اور بشیر بیگم کو رشک آتا تھا تو قیصر کے لمبے بالوں پر بشیر بیگم نے چاند کے بال بڑھانے کے لیے تمام نسخے آزما ڈالے اور آخر اپنے میاں کی بات مان کر اس کے انگریزی فیشن والے بال کٹوا دیئے۔ اسی لیے بشیر بیگم بار بار فاطمہ بیگم کو ٹوکتی تھیں۔

"اجی فاطمہ پھوپو لوگ تو بولتے کہ لمبے بال نحوست کی نشانی ہوتے ہیں۔ اس کے بال کٹوا دو تو تمہارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔ کبھی وہ ہنس کر کہتیں — "قیصر کی چوٹی خوب لمبی ہے نا۔ شوہر کو چوٹی پکڑ کے نکالنے میں آسانی ہو گی۔"

ان کی بات پر دونوں بہنوں کو ہنسی آ گئی۔ پھر بتول بیگم نے ہنستے ہنستے کہا۔

"اور یہ قیصر ہے کیسی زبان دراز۔ دیکھنا ایک دن بھی سسرال

میں نہ کھلے گی۔" پھر وہ سنجیدہ ہو کر فاطمہ بیگم سے کہتیں۔

"تم تو خود ہی دمڑی دمڑی کو محتاج ہو۔ اس کے اتنے بہت سے بالوں کے لیے کتنے کانٹے منگوانا پڑتا ہوگا۔ تھوڑے بال کاٹ دو۔"

مگر فاطمہ بیگم کسی بات کا جواب نہ دیتیں۔ سر پر پلو کھینچ کر چاولوں میں سے کنکر نکالے جاتی رہتیں۔

"تم نہیں کاٹتیں تو لاؤ میں کاٹ دوں۔" بشیر بیگم ادھر ادھر قینچی ڈھونڈنے لگیں۔

واحد حسین دالان سے اٹھ کر کمرے میں آئے تو غالباً رضیہ کی طبیعت کچھ ٹھیک ہو چلی تھی۔ کیوں کہ بی بی اور لنگڑی پھوپو دالان میں میٹھی باتیں کر رہی تھیں اور بی بی سلاآرو سے جھگڑ رہی تھیں۔

"جب ٹماٹر چار آنے سیر تھے تو تم پانچ آنے سیر کیوں لائے؟"

"زمانہ کدھر جا رہا ہے۔" واحد حسین نے پائپ کا کش لگا کر سوچا۔

"چلو جانے دو بھابی پاشا۔ دلہن کی طبیعت خراب ہے۔ شور نکو کرو۔" لنگڑی پھوپو نے کہا۔

"مگر کیسے جانے دوں گوہر بیگم۔ ایک آنہ پھکٹ آتا گیا۔؟"

بعض وقت بی بی کو بیگم بننے کا خبط سوار ہوتا۔ مگر ہمیشہ بے موقع۔

ٹھیک ہے — واحد حسین نے سوچا۔ اور پھر انھیں اپنے دادا کی وہ کہانی یاد آئی جو خاندان کے بچے بچے کو زبانی یاد تھی کہ ایک دن دادا حضرت نے اپنے مالی سے شرط لگائی کہ گلاب کی یہ کلی فلاں دن تک کھلے گی۔ مقررہ دن جب نواب صاحب فجر کی نماز کے بعد تسبیح پڑھتے ہوئے باغ میں آتے تو مالی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"سرکار آج اس پھول کو نئیں دیکھے —؟"

"ہوں، اچھا ہے۔"

"مگر اس دن سرکار شرط لگائے تھے کہ وہ جمعرات تک کھلے گا اور آج بدھ ہے (اس مالی کا قلم بھی اسی ڈیوڑھی میں بویا گیا تھا)

"ارے ہو — " سرکار رک گئے۔" میں تیرے سے کوئی شرط بھی تو لگایا تھا!"

"جی — جی سرکار —" مالی ہاتھ جوڑ کر کھسیا گیا۔

"تو پھر کیا ہونا تجھے —؟" انھوں نے لاپرواہی سے پوچھا۔

"ہیں ہیں ہیں۔ سرکار مائی مائی باپ ہیں۔" مالی کچھ نہ بولا۔

"منشی صاحب کو بلاؤ —"

اتنے سویرے کی طلبی پر ہانپتے کانپتے منشی صاحب حاضر ہوئے۔

قلمدان میں کتنی رقم ہے —؟ سرکار تسبیح پڑھ رہے تھے۔ اس لیے انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔

"جی سرکار کل ہی تحصیل کے روپے آگئے ہیں۔ میرا خیال ہے ساڑھے چار ہزار — پانچ ہزار —"

"وہ رقم مالی کو دے دی جائے۔" انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا۔ مالی کے ساتھ ہی جو دوسرے نوکر اس حکم کے منتظر تھے منتشر ہو گئے کیوں کہ یہ کوئی غیر معمولی بخشش نہیں تھی۔

گوہر پھوپو جانتی تھیں کہ اس مالی کا بیٹا پڑھ لکھ کر کہیں نوکر ہو گیا اور اس کا پوتا میثم راشد کے ساتھ انجنیر تھا اور اب راشد کے ساتھ ہی بزنس کرتا تھا۔ سامنے ہی نیا فیشن کا ان کا بنگلہ تھا۔ دونوں پکے یار تھے کیوں کہ واحد حسین کے اس خاندان سے گہرے تعلقات تھے۔ میثم کے باپ کو واحد حسین "راجہ" کہتے تھے۔ ہولی دیوالی اور دسہرے کے دن سب میثم کے ہاں جاتے تھے۔ راشد دیوالی کی رات میثم کے ساتھ

ضرور جوا کھیلتا۔ بونال کی پوجا دیکھنے وہ دونوں ساتھ ساتھ سکندرآباد جاتے تھے۔ اس دن پوجا کے لیے آنے والی، نہائی دھوئی سنگار پٹار کرنے والی عورتوں کو چھیڑنا اور ایک آدھ کو بہکا کر اپنے ساتھ لے آنا ان کے لیے ضروری تھا۔

ملیشم کا لڑکا ناسا "تنا چاند کا کلاس فیلو تھا اور دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی۔ چاند نارا "تنا سے کھیلنے کے لیے ہی ہر چھٹی کے دن "ایوان غزل" آتی تھی۔

"اجی گوہر بیگم کیا بیٹھے بیٹھے سو گئے۔؟"

بی بی نے انھیں جھنجھوڑا تو وہ چونک پڑیں۔

"کیا ہے۔! کیا درد پھر بڑھ گیا۔!" وہ چونک کے اٹھ بیٹھیں۔

"بتول بیگم کی سسرال سے اردلی آیا ہے۔"

"ایو۔ کیا خبر لایا ہے جانے۔؟"

پیش دالان میں لوگوں نے گھیرا سا ڈال لیا تھا۔ بیچ میں سفید وردی میں ملبوس، صافہ باندھے کمر پر "الف لیلہ" کی بیلٹ کسے، ایک سیاہ فام اردلی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مہر لگا ہوا ایک بڑا سا لفافہ تھا۔

بتول کی سسرال "الف لیلہ" میں لوگ اسی ٹھاٹ سے جیتے تھے۔ ہر بات میں اصول اور ضابطے اور وہ تمام قاعدے قرینے برتے جاتے تھے جو آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے ان کے لکڑ دادا نے مقرر کیے تھے۔"

بتول کے خسر الحاج مسکین علی شاہ طوطا چشمی کے ہاتھوں سے زمانے کی ہوائیں ساری رو بتول کو اڑائے لیے جا رہی تھیں۔ ان کے باپ دادا ایک زمانے تک حیدرآباد کے نوابوں جاگیرداروں کی حاجتیں پوری کرتے رہے۔ کیوں کہ وہ درگاہ حضرت رحمت علی شاہ کے سجادہ نشین ہیں۔ یہ بہت بڑے بزرگ کا آستانہ تھا جہاں ہر مذہب و ملت کے لوگ سر جھکانے آتے تھے۔

اس لیے یہ وہ دولت تھی جسے کبھی زوال نہیں آتا۔ سب دولت مندوں کی حاجت روائی اور جاگیرداروں کے بگڑے کام بنانے کا ٹھیکہ خود الحاج مسکین علی شاہ کے مبارک مشکل کشا ہاتھوں میں تھا۔ مگر جانے کیوں اب اس خاندان کے ہاتھوں میں وہ مسیحائی نہیں رہی تھی۔ اور اس درگاہ سے بھی حاجت مند خالی ہاتھ لوٹنے لگے تھے۔ مسکین علی شاہ طوطا چشمی یہ سوچ سوچ کر حیران تھے کہ روایتوں کے گرتے ہوئے ان ستونوں کو کیسے تھامیں! جدھر دیکھیے روایتیں، رکھ رکھاؤ اور ٹھاٹ باٹ کی محفلیں تتر بتر ہو رہی تھیں۔

اب یہ عالم تھا کہ اپنی چاروں بیویوں کو ان کے اٹھارہ بچوں سمیت انھوں نے "الف لیلہ" میں بند کر دیا تھا۔ اور خود آنکھیں بند کیے دل کے دوروں کو دباتے، درگاہ کے ایک حجرے میں پڑے رہتے تھے۔ درگاہ "الف لیلہ" کے احاطے ہی میں تھی ـــ بلکہ درگاہ کو دنیا کے لہو و لعب سے بچانے کے لیے سرکار نے جو زمین عنایت کی تھی، مسکین علی شاہ کے دادا نے اس پر ایک شان دار محل "الف لیلہ" تعمیر کروا دیا تھا تاکہ ان کی اولاد، درگاہ کو ہر قسم کی بلاؤں سے پاک رکھنے کے لیے اس محل میں بیٹھی رہے۔ کہتے ہیں ایک بار مسکین علی شاہ کے دادا کو ایک جھونپڑے میں پڑا دیکھا تو کہا جا تیرے لیے ہم ایک الف لیلہ کی کہانی جیسا محل

بنوا دیں گے ـــ" چنانچہ انھوں نے اپنی ڈیوڑھی کا نام " الف لیلہ" ہی رکھا۔

اب مسکین علی شاہ طوطا چشتی کا یہ عالم تھا کہ شہر میں کچھ ہو جائے، عزیزوں رشتے داروں میں موت ہو یا شادی۔ وہ کبھی درگاہ سے باہر نہ نکلتے تھے۔

اس درگاہ کے بارے میں مشہور تھا کہ رحمت علی شاہ ایک دن مسکین علی شاہ کے دادا کے خواب میں آئے اور کہا کہ فلاں جگہ میرا مزار کھود کر برآمد کیا جائے تو ان کی اولاد کبھی بھوکی نہ رہے گی۔ چنانچہ اس درگاہ کے فیض کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے خود سر یہاں آکر سر جھکا لیتے تھے۔

اب کوئی مسکین علی شاہ طوطا چشتی سے، باہر نہ نکلنے کی وجہ پوچھتا تھا تو وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتے۔

" مجھے جو حکم ملتا ہے سو تعمیل کرتا ہوں۔"

اسی وجہ سے تو یہ بات مشہور تھی کہ مسکین علی شاہ کے تعویز گنڈے وہ کام کرتے ہیں جو وکیلوں اور دلالوں کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

" الف لیلہ" کے ٹھاٹ باٹ کے بارے میں بڑی شاندار روایتیں مشہور تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ رحمت علی شاہ ہر رات مسکین علی شاہ کے سرہانے ایک ہزار روپے کی تھیلی رکھ جاتے تھے۔ مسکین علی شاہ جناتوں کو پڑھاتے ہیں جو روزانہ ایک تھیلا بھر کے کوئلے انھیں دیتے ہیں۔ مگر صبح کو وہ کوئلے سونے کے ٹکڑے بن جاتے ہیں۔ کوئی ان باتوں سے انکار بھی کیسے کرتا! کیوں کہ اس ڈیوڑھی کی عورتیں اور لڑکے وہ ٹھاٹ کرتے جو بڑے بڑے جاگیروالوں کو بھی نصیب نہ تھے۔

اسی لیے مسکین شاہ طوطا چشتی کی کرامتیں عورتوں میں بہت مشہور

تھیں۔ کیوں کہ جس طرح امیروں اور غریبوں کے بازار اور سوسائٹی الگ الگ ہوتی ہے، ویسے ہی درگاہیں اور مندر بھی بٹ جاتے ہیں۔

رحمت علی شاہ کے مزار کی سونے کی جالی، سچے موتیوں کا شامیانہ اور عالیشان عمارت کی ایک ایک اینٹ ان نامور سخی داتاؤں کا نذرانہ تھی جنھوں نے سلطنت آصفیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اسی لیے بڑی بڑی بیگمات یہاں آکر سجدے کرتی تھیں اور اپنی کسی سوکن کی موت کا فرمان لے کر اٹھتیں۔

بڑے بڑے جاگیردار آتے اور اپنے حریف کی شکست کا اعلان لے کر جاتے۔ یہاں سے عورتوں نے گودیں بھریں اور مردوں نے تجوریاں عرس ہوتا تو ایک ہزار مسکینوں کو مفت کھانا کھلایا جاتا تھا۔

مسکین علی شاہ بڑی مسکین صورت بنا کر کہتے تھے کہ فقیر تو خود دانے دانے کو محتاج ہے۔ اس کی بھلا کیا جرات ہو سکتی ہے کہ اتنے لوگوں کو کھانا کھلاتے۔ یہ سب پیرومرشد کی برکت ہے" ان کا کرشمہ ہے

اسی لیے مسکین علی شاہ کا گورا چٹا رنگ، خضاب لگی سیاہ داڑھی والا چہرہ زلفوں کے بیچ چاند کی طرح دمکتا تھا۔ جس وقت وہ سیاہ زرق برق عمامہ پہنے سر پر مشہد کا رومال باندھے، ہاتھ میں تسبیح لیے، اپنی سرخ سرخ بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر کسی بی بی کو دعا دیتے تھے تو عجیب سا نور چاروں طرف پھیل جاتا تھا۔ ملائک ادھر ادھر اپنے نیل گوں لباس پر حریری پنکھ لگائے گھومتے کہکشاں کا راستہ مسکین علی شاہ کے قدموں تلے سے ہو کر عرش بریں تک چمکتا نظر آتا تھا۔

پھر اپنا وجود غائب ہونے لگتا۔ گناہ گار بدن جھڑ جھڑ گرنے لگتا اور ننگی روح سنسنا کے چاہتی کہ مسکین علی شاہ میں سما جائے۔

مسکین علی شاہ کو عورتوں کی اس بے پناہ عقیدت نے بڑا پریشان

قصے سے ان کی راہ ٹھیک پڑی۔ کیوں کہ جب سے جاگیر کی ناؤ ڈگمگانے لگی تھی تو وہ بچاؤ کے لیے چاروں طرف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے انھوں نے راشد کی شادی شہر کے سب سے بڑے بزنس مین کی لڑکی رضیہ سے کی تھی۔ بشیر بیگم اور بتول بیگم بھی اپنی صورت شکل میں "ایوان غزل" کی تمام روایتوں کو سمیٹ لائی تھیں۔ اسی لیے انھوں نے بشیر بیگم کے لیے تولنٹن پلٹ حیدر علی خاں منتخب کیے۔ کیوں کہ بشیر بیگم بے حد تیز مزاج خود سر اور تیز زبان تھیں۔ مگر بتول بیگم اپنی ماں کی صورت کے ساتھ ساتھ مزاج بھی وہی لائی تھیں۔ چپ چاپ۔ اپنے آپ میں گم اور حالات کے آگے سپر ڈالنے کو تیار۔ اسی لیے مسکین علی شاہ نے اپنے بیٹے ہمایوں علی شاہ کا پیغام بتول بیگم کے لیے بھیجا تو "ایوان غزل" میں چراغ جل اٹھے۔

بتول بیگم اب سسرال سے میکے آتی تھیں تو ساتھ میں: وہیرے دار اور ایک لونڈی بھی آتی۔ میکے کے علاوہ انھیں اور کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی کہ یہ مرشدوں کا دستور تھا کہ لوگ ان کے آستانے پر حاضری دیں۔ وہ خود کبھی اپنی چوکھٹ نہ لانگیں۔ میکے جانے سے پہلے بھی بتول بیگم کو ایک عرضی مسکین علی شاہ کے دربار میں پیش کرنا پڑتی تھی تب احکام صادر ہوتے۔ یہ ضرورت یوں پیش آئی کہ مسکین علی شاہ کی کئی بیویوں نے یوں میکے جانے کے جھوٹے بہانے گڑھ کے راہ فرار اختیار کی تھی۔ اس طرح کئی دن دفتری کارروائی میں گزر جاتے۔ "الف لیلہ" میں ہر بات کا وقت مقرر تھا۔

مسکین علی شاہ کہتے تھے کہ فقیر کی کٹیا ہے جہاں پر قدم مولا کی مرضی لے کر اٹھانا پڑتا ہے، کسی جاگیردار کی ڈیوڑھی نہیں ہے۔ کہ من مانی موج مناؤ۔

کیا تھا۔ سنا ہے مراد علی کی جوان لڑکی تو اسی لیے پاگل ہو گئی تھی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر مسکین علی شاہ کو پکارتی تھی اس کی طویل بیماری سے عاجز آ کر ایک دن مراد علی اپنی لڑکی کو لائے اور مسکین علی شاہ طوطا چشمی کے قدموں میں ڈال دیا۔

مسکین علی شاہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک نوجوان نامحرم لڑکی کو کیسے اپنے حجرے میں پڑا رہنے دیں۔ بالآخر ان کی اعلیٰ ظرفی کام آئی اور انھوں نے مجبوراً اس لڑکی سے نکاح کر لیا۔

"الف لیلہ" کا ایک کمرا اس لڑکی کو دیدیا گیا۔ اب کیا تھا! مسکین علی شاہ کی اس عنایت کی دھوم مچ گئی۔ سارے نوابوں جاگیرداروں کی بیگموں کو ایک سستا نسخہ ہاتھ آ گیا۔

ادھر لڑکیاں تھیں کہ اٹھتی جوانی کی سرشاری میں کھونے کی بجائے مسکین علی شاہ کی صورت دیکھتے ہی لوٹن کبوتر بن جاتی تھیں۔ اس طرح "الف لیلہ" کے احاطے میں نئے نئے کمروں کا اضافہ ہوتا گیا۔ اور بچارے مسکین علی شاہ کو بہت سی پرانی وفادار بیویوں کو محض اس لیے طلاق دینا پڑی کہ اللہ میاں نے بیک وقت چار سے زیادہ نکاح جائز قرار نہیں دیتے۔

مگر نجات کی تلاش میں بھٹکنے والی یہ روحیں ان کمروں میں بھی یوں تڑپتی تھیں جیسے جال میں مچھلیاں۔ دیواروں سے سر پھوڑتیں۔ بچوں کو مارتیں۔ سوکنوں سے لڑتیں اور مسکین علی شاہ کی صورت دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی تھیں۔

لوگ کہتے تھے کہ مسکین علی شاہ کے ہاں اتنے ہیرے ہیں کہ ان کے ہاں ہر عورت ہیرا چاٹ کر مرتی ہے۔

واحد حسین نے بھی "الف لیلہ" کے ان شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے

جب کبھی بتول بیگم اور ہمایوں علی شاہ ذاحد حسین کے یہاں آتے تھے تو کئی دن پہلے سے خط و کتابت شروع ہو جاتی۔ وقت مقررہ پر ہمایوں علی شاہ برآمد ہوتے۔ ہمروکی سرخ شیروانی، زریں شملہ عطر میں مہکتے جھلملاتی ہیرے کی انگوٹھیوں والے ہاتھ سے رومال منہ کو لگائے ہوئے جس کار سے اترتے اس پر "الف لیلہ" کا بورڈ لگا ہوتا۔ جن طرے پوشوں میں ان کے ساتھ میوا، مٹھائی آتی، ان پر الف لیلہ کی چٹ لگی ہوتی۔ مسکین علی شاہ کہتے تھے کہ یہ ساری چیزیں درگاہ کی ملکیت ہیں کیوں کہ رحمت علی شاہ کی دین ہیں۔ اس لیے میرا کیا اختیار ہے۔

بتول بیگم کی شادی کو یہ پانچواں برس تھا اور اب وہ مسکین علی شاہ کے لیے تیسرا سجادہ نشین پیدا کرنے والی تھیں۔

"الف لیلہ" سے آج جو رقعہ آیا تھا وہ نہایت مسجع مقفیٰ اردو میں لکھا ہوا تھا۔ پہلے بی بی نے اسے غور سے دیکھا اور اندازہ لگایا کہ اس میں کیا لکھا ہوگا! پھر وہ رقعہ رضیہ کے پاس پہنچایا گیا۔ اس نے اپنے پیٹ میں مچلتے ہوئے طوفان کو تھام کر بار بار پڑھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس نے میٹرک تک پڑھا تھا۔ مگر پھر بھی اسے اردو لسی واجبی سی آتی تھی لیکن لنگڑی بھوپو کو تو عیب نکالنے کی عادت تھی۔ اس لیے وہ کئی بار دبی زبان سے کہہ چکی تھیں کہ دلہن کی پڑھائی کے بارے میں ہمیں صاف دھوکا دیا گیا ہے۔

آخر راشد کو باہر سے بلوایا گیا۔

راشد نے میٹرک سے انجینیری تک کے تمام امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیسے تھے۔ اس کے باوجود وہ رقعہ فرفر تو نہ سنا سکا۔ البتہ یہ مطلب نکال کر بتا دیا کہ دلہن بیگم تیسرے صاحبزادے کی آمد کا انتظار کر رہی ہیں۔ لہذا دلہن بیگم کی والدہ محترمہ اور دیگر خواتین کو مطلع کیا جاتا ہے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آوے۔"

"یہ الف لیلہ کے کام ہیں۔" لنگڑی بھوپو نے کہا۔

"یہ رقعہ کل کا چلا ہوا ہوگا اور اب تک اصل خیر سے متول بیگم کا

بچہ بارہ تیرہ گھنٹے کا ہو چکا ہوگا۔

اللہ آمین۔" فاطمہ بیگم سر پر بڑی ہوئی ساری کا پلو کھینچتی ہوئی آئیں

"بھابی پاشاہ، آپ نواسوں پوتوں میں کھیلیں۔ اللہ کرے زچہ بچہ خیریت سے ہوں۔ بھابی پاشا! کیا میں بھی چلوں آپ کے ساتھ بتول پاشا کو دیکھنے ۔۔۔؟" فاطمہ بیگم نے بڑے چاؤ سے پوچھا۔

"تم ۔۔۔؟" رضیہ نے ان پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ میلی ساری پھٹا ہوا کرتا ۔۔۔ ننگے پاؤں۔ فاطمہ بیگم کو ساتھ بھیجنے کا مطلب تھا کہ بی بی انھیں اپنا ایک پرانا جوڑا پہننے کو دیں۔ قیصر کے لیے بھی چاند کی ایک پرانی فراک ہو۔ پھر اس کے بالوں کے لیے تیل۔ بھلا ایسے لوگوں کو سمدھیانے لے جانے سے کیا رعب پڑے گا؟

"اب تم کاں جاتے فاطمہ بیگم۔ سب کام چوپٹ ہو جائیں گے۔ آج دلہن بیگم کا مزاج بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

بی بی کو گھر میں آئے تیس برس ہو گئے تھے۔ مگر ان کی ہر بات کا جواب لنگڑی پھوپو دیتی تھیں اور اب ان کی بہو نپٹ لیتی۔ وہ صرف دستخط سی کرتی چلی جاتی تھیں۔

"اچھا اچھا" فاطمہ بیگم سہم کر دور ہٹ گئیں۔ انھوں نے بڑے جوش میں ایک بات تو کہہ دی تھی۔ مگر یہ امید نہیں تھی۔ کہ لنگڑی پھوپو اتنے رسان سے اس کا جواب دیں گی۔

امی امی! میں بھی جاؤں گی۔" گھر میں کہیں جانے کی چہل پہل دیکھ کر قیصر مچلنے لگی۔

"ممی دیکھیے قیصر بھی آپ کے اور بی بی کے ساتھ جانے کی ضد کر رہی ہے۔" چاند نے اپنی ماں بشیر بیگم سے کہا۔

"یہ ایسے نہیں مانے گی ابھی جلتی لکڑی سے اس کی خبر لیتی ہوں۔"

بشیر بیگم مسی لگا کر چونے کی ڈبیہ پر گئے آئینے میں اپنا منہ دیکھنے لگیں۔

"چپ چپ مردار!" فاطمہ بیگم جلدی سے اٹھیں اور قیصر کو گھسیٹ کر چولھے کی طرف لے جانے لگیں۔ مگر قیصر اور مچل گئی۔ اس پر بشیر بیگم کا پارہ چڑھ گیا۔ ویسے بھی انھیں قیصر کے لمبے بالوں سے بڑی چڑ تھی۔ اور وہ بات بے بات قیصر کی چوٹی پکڑ کے اسے خوب پیٹا کرتی تھیں۔

"ٹھہرو میں آتی ہوں۔" بشیر بیگم نے اپنے کاندھوں تک لہراتے بالوں میں کنگھی کرتے ہوتے کہا۔ ان کے بال کسی بھی دوا سے نہیں بڑھے اس لیے چاند بھی قیصر کے لمبے بالوں سے بہت جلتی تھی۔ اکثر اپنی ماں کی گود میں لیٹ کر پوچھتی:

"ممی! میرے بالاں قیصر کے بالاں جیسے لمبے ہوں گے ۔۔۔؟"

"نام نکو لوجی میرے سامنے اس اجاڑ صورت کا" بشیر بیگم غصے میں آگئیں۔

"میں بھی چھوٹا بچہ دیکھنے جاؤں گی۔" قیصر ضد کیے جا رہی تھی۔

"اللہ میاں رحم کرو۔ میری بیٹی خیریت سے ہو۔" بی بی منہ ہی منہ میں دعائیں بدبداتی جانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

"اری مردار کیوں اس وقت رو رو کر نحوست پھیلا رہی ہے تیری صورت کو انگار لگو۔" فاطمہ بیگم قیصر پر دھڑا دھڑ تھپڑ برسانے لگیں تو اس کی چیخیں اور بڑھ گئیں۔

پھر بشیر بیگم تخت سے اٹھیں اور دوسرے لمحے انھوں نے غڑاپ سے کوئی چیز آنگن میں پھینک دی ۔۔۔ فاطمہ بیگم نے مڑ کے دیکھا ۔۔۔ وہ قیصر کی چوٹی تھی ۔۔۔!

لنگڑی پھوپو اور بی بی اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ صرف چاند کا لمبا قہقہہ گونجتا رہا۔

"میں پہلے ہی بولی تھی میرے سامنے ضد نکو کر۔ میرا غصہ تیرا

ہوتا ہے"۔ بشیر بیگم نے ہانپتے ہوئے قینچی ٹیک دی۔

بی بی نے بڑی مشکل سے نگاہیں اٹھا کر اپنی بیٹی کو دیکھا۔ انھوں نے خود ان سپولوں کو اپنا دودھ پلا کر پالا تھا۔ اور پھر انھوں نے پلٹ کر لنگڑی پھوپو کو دیکھا کہ وہ بتائیں اس وقت بی بی کو ہنسنا واجب ہے یا رونا!

مگر لنگڑی پھوپو خود سر تھامے بیٹھی تھیں۔

"ہمارے مرشدوں میں آج تک کوئی سینے مانئیں دیکھا۔ مگر تمہاری یہ بیٹی ہمارے صاحبزادے کو بھی پھٹکار رہی ہے۔ وہ تو اپنی دلہن کی بات کو حدیث شریف سمجھتا ہے۔"

باہر بتول بیگم کی ساس بڑبڑانے جا رہی تھیں۔ اور اندر اندھیرے بغیر روشندان والے کمرے میں بی بی اور بشیر بیگم کا دم گھٹ رہا تھا۔ سامنے چوڑی سی مسہری پر بتول بیگم یوں نڈھال سی پڑی تھی۔ جیسے کئی پہلوانوں سے بیک وقت لڑنے کے بعد ہار چکی ہو۔ اس نے دانتوں سے ہونٹ کاٹ کاٹ کر لہولہان کر لیے تھے۔ جب درد کی لہر کچھ مدھم ہو جاتی تو وہ کبھی اللہ کو پکارتی اور کبھی بی بی کو۔ اندھیرے میں جلتی ہوئی مومی شمع نے اندھیرے کے احساس کو کم کر دیا تھا۔

جب وہ جادوگرنیوں کی صورت دا ایا۔ تازہ دم ہو کر پھر بتول بیگم پر ٹوٹنے والی تھی تو بی بی نے اسے پکڑ کے کھینچ لیا۔

"ٹھہرو اس کے پاس مت جاؤ"

"الف لیلہ" اور "ایوان غزل" میں جو فرق تھا اس کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ الف لیلہ میں کبھی ڈاکٹر یا ڈاکٹرنی نہیں آتے تھے۔ وہ لوگ

ڈاکٹروں سے علاج کروانے کے قائل نہ تھے اور نہ ابھی ہر ہر مرض کے لیے الگ الگ ڈاکٹروں کا فیشن شروع ہوا تھا۔

سیکڑوں انگریزی ناموں والے ان گنت مرض بھی ابھی رائج نہیں ہوئے تھے۔ اسی لیے یہ کبھی نہیں سنا تھا کہ گاؤں میں کسی مرض کا علاج نہیں ہو سکتا کہ حیدرآباد مریض کو لے جائیں۔ ابھی ہارٹ اٹیک بلڈ پریشر اور کینسر سے مرنے والوں کے بارے میں بہت کم سنا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ قدیم وضع دار خاندانوں میں ڈاکٹرنی کو دکھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اور انگریزی دواؤں میں "حرام شے" کی ملاوٹ ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے بڑے بوڑھے مرتے مرجاتے مگر ان دواؤں کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

مسکین علی شاہ کے ہاں بھی انگریزی دواؤں اور ڈاکٹرنی کو آنا بری بات سمجھا جاتا تھا۔ اور یہی پہلوان نما دایا مسکین علی شاہ کی نسل کا چراغ روشن رکھنے کی ذمہ دار تھی۔

"اجی گوری بیگم! ذرا ایک لیمپ تو بھجوا دو یہاں۔ اندھیرے میں دم گھٹ رہا ہے۔" انگلینڈ پلٹ میاں کی بیوی، بنجارہ ہلز کے نفیس اکیلے بنگلے میں رہنے والی بشیر بیگم نے منہ بنا کر کہا۔

"نکو ماں۔۔۔ ہم لوگاں اپنے بیٹیوں کو پہلی بار رحتی کے چِلّے کا چراغ نہیں دکھاتے ہیں۔" بتول کی ساس نے باہر سے جواب دیا۔

"اللہ توبہ۔۔۔" بشیر بیگم نے صبر کیا۔ ان کے ہاں ڈاکٹرنی نہیں آتی۔ انگریزی دوائیں دی جاتی۔۔۔ بچہ اسی تہہ خانے میں پیدا ہوتا ہے۔ جہاں بچے کے لکڑ دادا کے خواب میں رحمت علی شاہ آتے تھے ساتھ ہی دلہن بیگم کو حکم تھا کہ خبردار جو کسی نے باہر ان کی ہائے ہائے سنی۔۔۔"!

"ہماری ساس تو پہلے سے جتادیتی تھیں کہ دیکھو دلہن مجھے پوتا چاہیئے۔ اگر چھوکری ہوئی تو میکے میں پھنکوا دوں گی۔ میں ساس کی نصیحت سنتی تھی اور اسی پر عمل کرتی۔ بتول کی ساس کہہ رہی تھیں۔

"کیسے —— ؟ بشیر نے حیرانی سے پوچھا۔" تو اللہ کے اختیار میں ہے خالہ جان کہ وہ بیٹا دے یا بیٹی —— اور پھر ہماری بتول بیگم کے تو ماشاءاللہ پہلے سے دو بیٹے موجود ہیں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے ؟" وہ بگڑ کے بولیں۔

"مرشدوں کی بیٹی سے کوئی شادی نہیں کرتا۔ بیٹا ہوا تو سب اس کے ہاتھ چومتے ہیں۔ عزت کرتے ہیں۔ مجھے تو تیسرا بھی پوتا ہی چاہیئے۔ میں دلہن بیگم کو جتا رہی ہوں۔"

" انھوں نے انگلی اٹھا کر بڑی قہر آلود نظروں سے بتول بیگم کو گھورا اور باہر چلی گئیں۔

بشیر بیگم کو یوں لگا جیسے بتول کی ساس کوئی جادوگرنی ہیں جو شہزادیوں کو کتیا بنا دیتی ہے اور شہزادے اس کے سحر سے پتھر بن جاتے ہیں۔

اور مسکین علی شاہ کی دوسری یا تیسری بیوی کے ہاں لڑکیاں میلاد شریف پڑھ رہی تھیں۔

جب باغِ جہاں کے مالی نے کی دیکھا بھالی پھولوں کی
اک پھول کو سب میں چھانٹ لیا، تھی جتنی ڈالی پھولوں کی

اندر بھی بڑی دھوم مچی تھی۔ جیسے کوئی برات آنے والی ہو۔ ویسے تو مسکین علی شاہ کی درگاہ میں محفل سماع اور گانے کا رواج تھا۔ مگر ایسے خوشی کے موقعوں پر ڈھولک اور ہیجڑوں کا ناچ بھی ہو جاتا تھا ——

دروازے پر نوبت والے منتظر تھے کہ کب صاحبزادے بلند اقبال اس دہشت ناک منظر کو دیکھ کر چیخ ماریں اور طبل پر چوٹ مار کے ایک

اور ستارے کے طلوع ہونے کی اطلاع مسکین شاہ کو دیں۔ بتول کی ساس اپنی تینوں بڑی سوکنوں کے مقابلے میں ہمیشہ نظرانداز کی گئی تھیں۔ بلکہ مسکین شاہ کی سب سے بڑی بیوی تو انھیں اپنے شوہر کی نکاحی بیوی ماننے پر تیار رہی نہ تھیں۔ ان پر کنوارپنے میں کسی جن کا سایا ہو گیا تھا۔ وہ حضرت کے پاس علاج کے لیے لائی گئیں۔ سایہ بڑا اَنگیلا تھا اور بچارے مسکین علی شاہ کو گھنٹوں ریاضت کرنا پڑتی تھی۔ اس لیے جب ہزار جتن کے بعد وہ اچھی ہوئیں تو انھوں نے اپنے ماں باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور مسکین علی شاہ کا دامن پکڑ کے بیٹھ رہیں۔ بعد میں جب ہمایوں کی پیدائش قریب آ گئی تو مسکین شاہ نے باقاعدہ اعلان کیا کہ انھوں نے اس لڑکی سے نکاح کیا ہے۔ اس لیے مسکین علی شاہ کی نظروں میں اپنا کوئی بیٹا سمایا تھا تو وہ ہمایوں تھا۔ ان کی تینوں بیویاں خواہ کتنے ہی دلائل سے غلط ثابت کریں مگر انھیں سو فی صدی یقین تھا کہ ہمایوں ان کا اپنا بیٹا ہے۔ اسی لیے اس گھر میں مرشدوں کی روایتوں اور حضرت کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت تھی تو وہ صرف ہمایوں کی اماں میں تھی۔ ان کا ڈھیلا ڈھالا بدن چاروں طرف سے لٹکتا تھا۔ سر میں اکا دکا سفید بال بھی نظر آنے لگے۔ اور سامنے کے دو دانت غائب ہو گئے تھے منہ کے اندر ایسی سیاہی تھی جیسے ان کی روح میں بھی آ جانے کی کوئی رمق باقی نہ ہو۔ وہ جس طرف سے گزرتیں زیور ریوں بجتے تھے جیسے ہاتھی چل رہا ہو۔ کوئی زیور ایسا نہ تھا جو ان کی پاس نہ ہو اور کوئی وقت ایسا نہ تھا جب وہ زیور سے لدی نہ ہوں۔ صرف پیروں میں ہی پائلوں، گھنگرو اور پازیبوں کا ڈھیر بجا کرتی تھی۔ ہمایوں کہتا تھا کہ ایک بار اماں جان نے پیروں میں سے تمام زیور اتار ڈالے تھے تو لڑکھڑا کے گر پڑی تھیں۔ کانوں میں موٹے

ے تنکے اور جھکے گلے میں ٹھسی، مست لڑا چندن ہار اور کالی پوت کا گپھا تو سہاگ کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ ہر وقت مسی سے آراستہ رہا کرتی تھی۔ چاند بھی زیور کی پہاڑی کہا کرتی تھی۔ اس لئے جب بھی بشیر بیگم اپنی بہن سے ملنے "الف لیلہ" جاتی تھیں چاند ضرور ان کے ساتھ جاتی۔

"اماں اماں میں مرجاؤں تو اچھا ہے"۔ بتول بیگم نے پوری قوت سے بی بی کو پکڑ لیا تھا۔

"اوئی ایسی کیا دنیا سے نرالی تکلیف ہے۔ کوئی پہلوٹھی کا بچہ تو ہے نہیں" بتو بیگم جانتی تھیں کہ ایسے وقت زچہ کے دلار کرنے سے تکلیف اور بڑھ جاتی ہے۔

"چپ چپ ــــ" بی بی نے لرز کے کہا۔ وہ بھی ایک عورت تھیں۔ ہر عورت کو انسان کی تخلیق کا اختیار اللہ میاں سونپ دیتے ہیں۔ مگر کوئی عورت یہ نہیں چاہتی کہ اس کے بطن سے اسی کی طرح مجبور اور بے بس ہستی جنم لے۔ اگر اللہ عورت کو یہ اختیار دیتا، اگر بتول کی ساس یہ سمجھتی تھی کہ اس وقت اپنی عاقبت سنوارنا خود اس کی بہو کے ہاتھ میں ہے تو بتول یہاں بیٹی مرنے کی دعائیں کیوں مانگتی؟ انھیں لرزہ کیوں چڑھتا؟ بتول کی ساس اپنی سب سوکنوں پر حکمرانی کیوں کرتی؟ دنیا میں صرف مرد ہوتے جو اپنے مزے میں جی رہے ہوتے۔ نہ عورتوں کی طرح ہائے ہائے نہ بچوں کی چیخ پکار ــــ زندگی کیسے مزے میں گزرتی!

ہمایوں دالان میں ٹہل رہا تھا۔ سگریٹ پر سگریٹ سلگائے جاتا۔ اس کے قدم بڑی سست رفتاری سے اٹھ رہے تھے مگر دماغ نوے میل فی منٹ کے حساب سے دوڑ رہا تھا۔

بتول پر اس نے پہلی نظر نہ جانے کس وقت ڈالی تھی کہ پھر ہٹا ہی نہ سکا۔ زندگی کے ستائیس برسوں میں اس نے صرف دو کام کئے تھے۔ ایک تو ابا حضور کی آرزو پر ساتواں درجہ پاس کرلیا تھا۔ اور پھر بتول سے شادی کی۔ شادی سے پہلے دن بھر رحیم میاں کے ساتھ رمی کھیلتا تھا۔ لیکن کبھی کبھار رحیم میاں کے بہکاوے

میں آکر وہ دونوں کہیں اپنا کوئی ادھ شوق پورا کرنے چلے جاتے تھے۔ مگر جس دن سے اس نے بتول کا گھونگھٹ اٹھایا تو بس وہیں چپک کر بیٹھ گیا۔ رحیم میاں گھنٹوں مردانے میں سوکھتے نئے نئے اور تازہ تازہ مال آنے کی خوش خبریاں بار بار اندر بھجواتے۔ مگر ہمایوں راجہ اب دولھا پاشا ہوگئے تھے، کبھی باہر نہ نکلتے۔

جو سنتا، بتول کی قسمت پر رشک کرتا۔ اللہ نے کیسا محبت کرنے والا دولھا دیا ہے۔ آخر بتول کی بے زبانی اور صبر شکر والی طبیعت کا پھل اسے مل گیا۔ کیا مجال کہ بتول پل بھر کے لئے نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ پھر بتول نے اسے آیا نہ دیا۔ اور دادا دادی نے اس کی پیدائش پر اتنا شور مچایا کہ ہمایوں اپنے رقیب کی آمد پر گھبرانا بھول گیا ــــ دوسرے ہی سال شہزادہ آگیا ــــ رفتہ رفتہ ہمایوں بتول سے دور سرکتا گیا ــــ

مگر ایاز کے دادا کی باچھیں کھل گئیں۔ "یہ دو لڑکے نہیں دو لاکھ کی پونجی ہیں ہماری لٹی ہوئی دولت کا بدل ہیں" یہ سن کر ہمایوں کو کچھ تسلی سی ہوئی۔ پھر وہ بتول کی ناز برداری میں لگ گیا۔ اس نے بیوی کو اتنا چاہا کہ "الف لیلیٰ" کی تمام روایتوں کو توڑ کے پہلی بار "شیریں فرہاد" دکھانے لے گیا۔

لیکن شیریں کے غم میں جب فرہاد نے اپنے کلیجے پر تیشہ مارا تو وہ ٹھیک بتول کی کوکھ میں چھپی ہوئی ننھی سی جان کے دل میں گھس گیا۔ رنجیدہ فلم دیکھتے وقت بتول یوں رویا کرتی تھی جیسے کسی جادو اثر ذاکر سے شہادت کا واقعہ سن رہی ہو۔ مگر اس کے پیٹ میں پھڑکنے والی جان تو اس سے بھی زیادہ نرم دل نکلی وہ بھی ایسی بے صبر کہ ادھر تو فرہاد کے غم میں شیریں دھاڑ رہی تھی ادھر بتول اپنا پیٹ تھامے چلا رہی تھی۔

آس پاس عورتوں کا ہجوم ہوگیا۔ راستے بھر ہمایوں سخت پریشان رہا کہ صاحبزادے کہیں موٹر میں تشریف لاکر سنیما دیکھنے کے راز کو عام نہ کر ڈالیں ہمایوں کی ماں کو تو جیسے کسی نے گرم تیل میں ہی جھونک دیا۔ بہو کو کوسنے

پٹنے کا انھیں بہترین موقعہ ہاتھ آگیا تھا۔ اگر اس وقت ہمایوں کمرے میں نہ ہوتا تو آج وہ بہو کی چٹیا پکڑ کر مارنے کا ارمان بھی پورا کرلیتیں۔ کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے، ہمایوں بے قراری سے تیسرے بیٹے کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ ستائیس برس کا ہونے کے باوجود اس نے اپنے باپ کے ہاتھ میں ایک دھیلا بھی کما کر نہیں دیا تھا بلکہ اسے تو ہر وقت اس بات کا انتظار تھا کہ کب دل کا کوئی دورہ اس کے بوڑھے باپ کو کھینچ لے جائے گا اور اس کی قسمت کے پٹ کھل جائیں گے۔ ابا حضور لاکھ کہیں کہ وہ لاکھوں کے مقروض ہیں، مگر ہمایوں نے کبھی ان کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔

اس کے سوتیلے بھائی باپ کی جانب سے مایوس ہو کر جوتے گھسیٹتے اسکول جانے لگے اور پھر اپنی قسمتوں کا لکھا پورا کرنے کے لئے ادھر ادھر نوکریاں کرنے لگے۔ مگر ہمایوں کی محنت کے نام سے جان نکلتی تھی۔ وہ خوش قسمت تھا ہمیشہ قسمت اس کا ساتھ دے گی۔ پھر اس کے تینوں بیٹے جوان ہوں گے۔ ان کے لئے وہ باپ دادا کی بھیک کا ٹھیکرا رحمت علی شاہ کے مقبرے کی کوئی اینٹ نہ چھوڑے گا۔ اس کے باوجود اس کے تینوں بیٹے مل کر سونے کا محل بنائیں گے۔

اس نے پھر دروازے کی طرف کان لگا دیے۔ اندر گہرا سناٹا تھا۔ جیسے سب مر چکے ہوں۔ جیسے کسی دشمن نے اس کے بیٹے کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ وہ زیادہ تیزی سے ٹہلنے لگا۔

"اجی اماں جانی میرے نیگ کے روپے اب نکالو۔ تیسرے پوتے پر ایک سو ایک سے کم نہیں لوں گی۔" اندر کہیں ہمایوں کی بہن اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔

آج رت جگا ہوگا ـــــ سب کو اپنے کپڑوں لتوں کی پڑی تھی۔ ہمایوں پریشانی کے مارے بیٹھ گیا۔ جیسے ایک لاکھ کی لاٹری کا رزلٹ آرہا ہو۔

پھر کہیں سے ایاز اور شہزاد لڑتے ہوئے آگئے۔ تین برس کا ایاز اپنے دو سال کے بھائی کو ایسی گالیاں دے رہے تھا جن کا مطلب وہ بالکل نہیں جانتا تھا۔ وہ اپنے باپ کو بھی گالیاں دیتا تھا اور جوتا اٹھا کر دھڑا دھڑ ماں کو پیٹا کرتا تھا۔ لیکن شہزاد

بالکل نی ماں پر گیا تھا ویسا ہی خاموش اور ڈرپوک۔ ذرا ذرا سی بات پر رو دیا۔
اس وقت ہمایوں کو ان دونوں کی صورت زہر لگ رہی تھی۔ نالائق ہیں سالے ـــــ ادبدا کے وہی حرکتیں کرتے جن سے ہمایوں کو بے انتہا نفرت تھی۔ آنے والے بچے پر تو وہ اس جاہل اور بزدل عورت کی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دے گا۔ اگر یہ دونوں ستائیں گے تو سب سے چھوٹے والے کو ہی درگاہ کی سجادہ نشینی ـــــ

ہانپتی کانپتی پسینے میں شرابور اس کی بڑی سالی بشیر بیگم کمرے سے باہر نکلی۔

"مبارک ہو ہمایوں میاں۔ آپ کی صاحبزادی تو شیریں سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔"

اور ہمایوں کے بھیجے پر کسی نے فرہاد کا تیشہ کھینچ مارا۔

اس نے یوں اپنی سالی کو دیکھا جیسے اس نے ایک لاکھ کی تھیلی بے ایمانی سے چھپا لی ہو۔

پوتی مبارک ہو ـــــ پوتی مبارک ہو ـــــ یہ خبر "الف لیلہ" میں یوں پھیلی جیسے ایک بھیانک آندھی چراغ بجھاتی چلے ـــــ

باہر نوبت نقاروں والوں نے پیدائش کی خبر سنی تو بغیر سوچے سمجھے تڑاتڑ نوبت پر ہاتھ مارنا شروع کر دیے۔

"اوئی یہ میری موت پر نگاڑے کیوں بج رہے ہیں ـــــ؟"

ہمایوں کی ماں بیچ آنگن میں دل تھام کر بیٹھ گئی۔ "الف لیلہ" میں جب بیٹی پیدا ہوئی تو اپنے ساتھ ستر بلائیں لائی ہے۔"

"خالہ جان داماد مبارک ـــــ" بشیر بیگم نے اقبالی مجرموں کے انداز میں خالہ جان کو داماد کے خوش آئند تصور سے خوش کرنا چاہا۔ پھر بھیانک خاموشی چھا گئی۔

ہمایوں کی بہن جلدی جلدی ہیجڑوں کو چپ کرانے لگی۔ اور دیوار کے اس پار سے قہقہے بلند ہونے لگے جس طرف ہمایوں کی سوتیلی مائیں رہتی تھیں۔

خانقاہ کے اندھیرے کمرے میں دونوں ہاتھوں میں سر کو تھامے سکین شاہ

بیٹھے ہوئے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ اس لڑکی کا بر کیسے ملے گا۔ مرشدوں کی بیٹی کو بیاہنا بڑا مشکل مسئلہ تھا۔

"ممی۔ ممی ـــــ تو کیا یہ بچی بھی بڑی ہو کر شیریں کی طرح کلیجے میں چھری مارے گی۔" چاند نے شیریں کی طرح خوبصورت سی ننھی بچی کو دیکھ کر اپنی ماں سے پوچھا۔

"چپ چپ منہ جلی ہو گئی ہے کیا ـــــ؟ بی بی نے اسے ڈانٹ دیا۔

چاند اس وقت سات برس کی تھی۔ مگر اسے ہر فلم کی پوری کہانی یاد ہو جاتی تھی۔ سب ہی چلتے ہوئے فلمی گیت اسے یاد تھے۔ وہ لیلا چٹنس کی شیدائی تھی۔ ڈانس کرنے پر اسے گود بھر بھر انعام ملتے تھے۔ جو بشیر بیگم کو اپنے میکے والوں سے چھپانا پڑتے تھے۔ چاند کی ددھیال یوں تو زیادہ دور نہ تھی مگر پھر بھی ذہنی طور پر صدیوں کا فاصلہ درمیان تھا۔

جب "ایوانِ غزل" کی بیبیاں موٹروں میں پردے لگا کر سوار ہوتی تھیں تو چاند کی پھوپیاں اپنے میاؤں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سکندر آباد کلب ڈانس کرنے جاتی تھیں۔ بغیر آستینوں کا بلاؤز، ہونٹوں کی سرخی اور اونچی ایڑی کے سینڈل کا فیشن پہلے پہل حیدر آباد میں اسی گھرانے سے نکلا۔ لڑکے تو خیر اور خاندانوں میں بھی پڑھنے کے لئے ولایت جا چکے تھے لیکن بال کٹا کر فراکیں پہنے اسی گھرانے کی لڑکیاں پہلی بار کرسٹانوں کے اسکولوں میں بھیجی گئیں۔ اور پھر آگے کبھی ان کے کارنامے لوگ سنا کرتے۔ کوئی ہوا خوری کو نینی تال گئی اور وہیں کسی گورے سے نکاح کر لیا۔ کوئی باپ دادا کی آنکھوں کے سامنے دولہا پسند کرتی اور ماں باپ تالیاں بجا کر اس کے انتخاب کی داد دیتے تھے۔ وہاں کے قصے بشیر بیگم سے سن سن کر لنگڑی پھوپو خود ہی توبہ کرتی تھیں۔

بشیر بیگم کی سسرال تھی کہ کسبیوں کا اڈا۔ دنیا کانوں پر ہاتھ دھرتی۔ اس لئے

بشیر بیگم میکے کم آتی تھیں، کیوں کہ نندوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی ٹیڑھی مانگ نکال کر گوہر بائی کے انداز میں پٹیاں جمانے لگی تھیں۔ اور مسّی کے بجائے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگاتیں۔ ساڑھی بھی کمر پر کس کس کر باندھتیں۔ البتہ بغیر آستینوں والے بلاؤز کے نام سے انھیں تھر تھری چھوٹتی تھی۔ اس کے باوجود ان کے میکے میں اعتراضوں کا پتھراؤ ہوتا تھا۔ کوئی ان کی ترچھی مانگ پر اعتراض کرتا، کوئی چاند کی ننگی ٹانگوں پر۔ اس لیے وہ بتول بیگم کی سسرال تو بہت کم جاتی تھیں۔ بس کسی ایسے ہی موقعہ پر آنا پڑتا تھا جیسے آج آنا پڑا۔

"اس کا نام "غزالہ" رکھیئے خالہ جان۔ بڑی خوبصورت آنکھیں ہیں۔ ماشاءاللہ" بشیر بیگم نے شاعر کی بیٹی ہونے کا ثبوت پیش کیا۔

"ہاں کچھ بھی نام رکھو نام میں کیا دھرا ہے ـــ" خالہ جان نے ٹھنڈی سانس بھری۔

دوسرے دن واحد حسین اپنی نئی غزل کا مصرعہ گنگناتے ہوئے اندر آئے تو ان کے ہاتھ میں "الف لیلہ" کا مخصوص بھاری بھر کم لفافہ تھا ـــ لنگڑی پھوپو جا نماز پر سیدھی بیٹھ چکی تھیں۔ اور لاحول پڑھ کر کانوں کو ہاتھ لگانے ہی والی تھیں کہ واحد حسین کو دیکھ کر ہاتھ نیچے چھوڑ دیئے۔

"کیوں بھائی پاشا! خیریت تو ہے؟

"کیا نام رکھا بچی کا ـــــ؟" خالہ بیگم نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"غزل ـــ غزل ـــ" انھوں نے لاپرواہی سے کہا اور پھر اپنا ادھورا مصرعہ گنگنانے لگے ـــ محبوب ـــ مجوب ـــ مجذوب ـــ اور جانے کون سا قافیہ رہ گیا ہے جو وہ بھول رہے تھے ـــ

کل سے وہ تلفیے کو طرح طرح سے گھیر رہے تھے مگر وہ ایک شوخ محبوبہ کی طرح کسی طور ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ آج اس معشوق کی آمد ہے جس سے بازار حسن میں جنس وفا سستی ہو جائے گی۔ دل وجان والے دامن بچاتے پھریں گے ——— کیسا نیا مضمون ہے ——— کیا آمد ہے ——— !

" اوئی یہ "غزل" کیا نام ہوا ——— ؟ پھوپو نے ناک پر انگلی رکھ کر راشد سے پوچھا۔ راشد بھی شیو کرتے کرتے رک گیا۔

" غزل ——— ؟ کس نے رکھا ہے یہ نام ——— ؟ ابا جان نے ؟

خوب ——— ! (وہ بڑے طنز کے ساتھ پھر آئینے کی جانب مڑ گیا)

" چلیے اچھا ہوا ——— ایوان غزل تھا مگر کوئی غزل نہیں تھی ہمارے ہاں ———"

راشد اس خاندان کا پہلا فرد تھا جسے شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور اس بات پر واحد حسین بڑے شرمسار تھے کہ ان کا اکلوتا بیٹا اپنے خاندان کی روایتوں کو توڑ رہا تھا۔

" مگر شریف لڑکیوں کا ایسا نام ——— ؟ بی بی نے سر پر پلو سنبھال کر کہا۔

" غزل تو عشق و عاشقی کی باتوں کو کہتے ہیں۔" انھوں نے کچھ شرما کر اور کچھ گھبرا کر ان غزلوں کو یاد کیا جو ان کے میاں صرف انھیں کو چپکے چپکے سنایا کرتے تھے۔

" ہاں ———" راشد نے منہ ٹیڑھا کرکے آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ استرے والا اس کا ہاتھ گالوں پر یوں لپ جھپ دوڑ رہا تھا۔ جیسے قصائی بکرے کی کھال اتار رہا ہو۔

" فارسی میں ایک خیال یہ بھی ہے کہ غزل اس کرب کو کہتے ہیں جو زخمی ہرنی کی آنکھوں میں مرتے وقت ہوتا ہے

" رہنے دیجیے اپنی تنقید ———" راشد کی بیوی رضیہ نے اپنے پیٹ کی ہل چل

کو تھام کر کہا ———" اچھا خاصا نام ہے ——— غزل تو عورتوں کی باتوں کو کہتے ہیں ——— ہم نے میٹرک میں پڑھا تھا۔"

" تو ٹھیک ہے ———" لنگڑی پھوپو نے اطمینان کی سانس لے کر دوبارہ نماز کی نیت باندھ لی۔ اگرچہ دلہن کا میٹرک والا دعوا انھوں نے بالکل نہیں مانا۔

راشد نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور باہر بھاگا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی عمارت "شہرت" ورا ڈی کمیٹ میں بنائی جارہی تھی۔ راشد کو بھی ایک بڑا کنٹریکٹ ملا تھا۔ اس کام کو بہت جلد پورا کرنا تھا۔ اس لئے بھی کہ اعلیٰ حضرت کی خواہش تھی اور اس لئے بھی کہ کنٹریکٹ کا روپیہ ملے تو "ایوان غزل" کو قرق ہونے سے بچایا جائے۔ کیوں کہ وہ ان انجنیروں میں شامل تھا جو جامعہ عثمانیہ کا نقشہ بنانے کے لئے پورے یوروپ اور مڈل ایسٹ کا دورہ کرنے بھیجے گئے تھے

"دالان میں پہنائے ہار کیا خوشنما لگا کے۔"

قالین پر بیٹھی ہوئی میراثنیں حلق پھاڑ پھاڑ کر چلّا رہی تھیں۔

بڑے دالان میں تخت پر سرخ مخمل کی کارچوبی مسند بچھی تھی اس کے اوپر پھولوں اور مقیشوں کا منڈوا پڑا تھا۔ شہ نشیں پیچھے اس کی پھولوں والی جھالریں نوچ نوچ کر بھاگ رہے تھے۔ ڈیوڑھی مہمانوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ڈیوڑھی کے پچھلے حصے میں پیاز لیمو اور لہسن کے چھلکے بکھرے پڑے تھے۔ بڑی بڑی دیگیں اور برتن ادھر سے ادھر گھسیٹے جا رہے تھے۔ چولہے جل رہے تھے۔ گوشت چاول گھی اور مسالوں کے ڈھیروں کے آس پاس باورچیوں کے ساتھ غلام رسول دوڑتا پھر رہا تھا — کوئی ادھر سے چلاتا — "غلام رسول پانی" — کوئی ادھر سے چلاتا — "غلام رسول پان" —۔ پھر بیگم ساب دہاڑتیں — غلام رسول جوتے —؟"

مہمان کبھی کے آنا شروع ہو چکے تھے۔ باہر دالان میں شامیانے تلے دریوں پر سفید چاندنیاں بچھی تھیں اور اس پر ایرانی قالین بچھائے گئے تھے۔ بیچ بیچ میں چاندی کے ورق لگی گوریوں کے خاصدان رکھے تھے۔ باہر مردانے میں جہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ گورے چٹے اونچے پورے، ہنستے مسکراتے احمد حسین جھک جھک کر لوگوں کا استقبال کر رہے تھے۔ آج انھوں نے تنگ مہری کے پاجامے پر ہمرد کی شیروانی

پہنی تھی اور ترکی ٹوپی کا پھندنا ان کے ماتھے پر جھول رہا تھا۔ بار بار انھیں مہمانوں کو رسیو کرنے کے لیے گیٹ تک آنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھار پردا لگی کار کو دیکھ کر وہ ہاتھ سے اشارا کر دیتے تھے۔

"زنانہ سواری ادھر لے جاؤ —"

کام دھندے میں بولاتی ہوئی اجالا بیگم اپنی زریں جارجٹ کی ساری سنبھالتی پھر رہی تھیں۔ بار بار ان کے جھلملاتے ہوئے چہرے پر بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ اجالا بیگم شادی بیاہ اور تقریبوں کا انتظام کرنے میں مشہور تھیں۔ اس کے باوجود آج ان کے خوبصورت چہرے پر بڑی تھکن سی تھی۔ آج وہ بار بار کچھ نہ کچھ بھول جاتیں لونڈیاں چھوکریاں تو خیر ہمیشہ کی کام چور ہیں۔ کام کے وقت سب غائب ہو جائیں گی وہ اکیلی ہی باورچیوں کی نگرانی بھی کر رہی ہیں اور مہمانوں کا استقبال بھی کر رہی ہیں۔ برابر والیوں سے ہنسی مذاق، اور بچوں کو قالین پر کیچڑ بھرے پیروں سے آنے سے روکنا یہ سارے کام بیک وقت نبٹانا اجالا بیگم نے اپنی دادی سے سیکھا تھا —۔

وہ اونچی پوری لحیم شحیم خاتون تھیں۔ چالیس کو پار کر چکی تھیں۔ اس کے باوجود ان کا سبک سبک ناک نقشہ، اور چقندر کی طرح سرخی آمیز گورا رنگ، اس پر کہیں کہیں جھلکتی ہوئی ایرانی حسن کی جھلک۔ وہ اب بھی کسی کو مار ڈالنے والی صلاحیت رکھتی تھیں۔ ان کے بے پناہ حسن اور رعب داب نے کبھی اتنا اضافہ نہیں کیا تھا، جو جادو ان کی زبان میں تھا۔ وہ ایک ایسی زبان کی مالک تھیں جس نے شکست کھانا نہیں سیکھا تھا۔

ڈیوڑھی کے مختلف کمروں میں خواتین مختلف گروپ بنائے ہوئے ہنسی مذاق میں مصروف تھیں۔ پھولوں اور عطروں کی خوشبو باہر سے آنے والی بریانی بگھارے بیگن اور کبابوں کی خوشبو پر چھائی جا رہی تھی۔

جدھر باورچی پکا رہے تھے، اسی پچھلے راستے سے خواتین اندر آ رہی تھیں۔ سارے میں، دیگیں، برتن، ترکاریوں اور انڈوں کے چھلکے پڑے تھے۔ باورچیوں نے پانی بہا بہا کر

چھپک چھپا کر دی تھی۔ اس لیے جو بی بی مٹھیا تنکرم سے اترتی، اجالا بیگم اسے خبردار کر دیتیں ـــ

"اجی گوری ماں، ذرا ساری اوپر اٹھا کر آدماں، یہ مردار باورچی چو طرف پانی پھیلا دیے ہیں۔"

بڑے بڑے چولھوں کا دھواں چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ اور چولھوں کے درمیان شجو میاں ڈنڈا ہاتھ میں تھامے ہوئے، اجلے کپڑے پہنے باورچیوں کی نگرانی کر رہے تھے۔

"دیکھوں میٹھے میں کتنی شکر ڈالی ہے ـــ" وہ ذرا سا میٹھا چکھتے۔

"یہ ٹوٹے ہوئے انڈے ادھر دے دو ـــ" جلدی جلدی انڈوں کو منہ میں رکھتے ہوئے وہ دوسری طرف مڑتے۔

ذرا دکھانا لقمی خستہ تو ہے نا ـــ؟" وہ سالم لقمی کو منھ میں رکھ کر اس کا خستہ پن محسوس کرتے۔

بچے چاندنیوں اور قالینوں پر آنکھ مچولی کھیلتے پھر رہے تھے۔

دالان کے اس کونے میں جہاں سب جوتے اتار کر اندر جا رہے تھے، آیاؤں کا ایک پورا گروپ، روتے ہوئے بچوں کو چپ کرانے کی بجائے اپنی باتوں میں مگن تھا۔ اور اسی جگہ بیٹھ کر بی جان کو پان بنانا رہ گیا تھا۔ آتے جاتے اجالا بیگم نے کئی بار ٹوکا۔

"اری مردار تیرے کانوں کو آج کیا ہو گیا ہے۔ کتنی بار بولی کہ راستے میں نکو بیٹھ اب پیر سے چپل نکالوں کیا ـــ؟"

گر وہاں بیٹھنے والی سب آیائیں یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ بی جانی نے بیگم صاحب کی بات پر کوئی کان نہ دھرا اور اسی طرح بیٹھی پان کے بیڑوں پر چاندی کے ورق لپیٹتی رہی۔

مردانے حصے سے کئی بار احمد حسین کو زنانے کی طرف آنا پڑ رہا تھا۔ کئی بار وہ

کسی ارشد مرزی کام سے اندر آگئے اور بھولے سے کسی بنارسی ساری سے ٹکرا کر باہر بھاگے۔ اندر ایسی سوسنی صورتیں جمع ہوں تو ان کا بے قرار ہونا لازمی تھا

اس کے باوجود وہ نہایت صبر و اطمینان سے کسی نئے مہمان کا استقبال کرنے اٹھتے۔ خمیدہ ہو کر قدم بوسی عرض کرتے۔ اپنے ہاتھوں میں مہمان کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگاتے اور پھر ہاتھ جوڑ کر کہنا پڑتا ـــ "تشریف رکھیے خیر"۔

واحد حسین، احمد حسین کے اس خاکسارانہ انداز پر بہت ہنستے تھے۔ مگر تحصیلداری کی رشوت سے شہر میں ٹھاٹ کرنے اور گاؤں میں جاگیردار بن کر رہنے میں بڑا فرق تھا۔ واحد حسین تحصیلدار تھے۔ مگر تعلقدار بن کر بات کرتے۔ واحد حسین اپنے نانا خسر کی بے انتہا دولت کے مالک بنے بیٹھے تھے۔ مگر اپنے سے چھوٹوں کے آگے جھکنا پڑتا۔

آج واحد حسین اور بی بی کی کمی اندر باہر سب نے محسوس کی تھی۔ ایسی خوشی کے موقعوں پر اپنے عزیز بہت یاد آتے ہیں۔ اسی لئے تو اجالا بیگم نے بڑے چاؤ سے اپنے بیٹے کے چھلّے میں اپنے جیٹھ اور جٹھانی کو بلایا تھا۔ اب وہ لوگ نہ آنے کا کوئی بھی بہانہ کریں مگر اجالا بیگم جانتی تھیں کہ واحد حسین، احمد حسین کا وارث کس دل سے دیکھتے ـــ! وہ تو اجالا بیگم کی کل دولت کا وارث ارشد کو سمجھے ہوئے تھے۔

باہر احمد حسین کے اونچے قہقہے سن سن کر اجالا بیگم مسکرائے جائے جا رہی تھیں آج انھوں نے احمد حسین کی معصومیت پر ایک اور بھرپور وار کیا تھا اور اب گھبرائے جا رہی تھیں۔ ان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اور اس گھبراہٹ نے ان کی خوب صورتی کو اور نکھار دیا تھا۔ گہری اودی بنارسی ساری پر کار گے کا کی دار کرتا بڑی بہار دکھا رہا تھا۔

گلے میں جڑاؤ تھا، ست لڑا اور چندن ہار چمک رہا تھا اور ہاتھوں میں ہیرے کے کنگنوں کے آگے سچی چمکیوں کا جوڑا تھا۔ یوں تو نگوں کا جوڑا ہر گوری کلائی پر اچھا لگتا ہے۔ مگر اجالا بیگم کے ہاتھ تو بس اس قابل تھے کہ انھیں دیکھے ہی جاؤ۔

یہ بھی ان کی خوبصورتی اور ضد کا قصور تھا کہ وہ کسی شہزادے کے محل کی بجائے

احمد حسین کی معمولی سی ڈیوڑھی میں آ گئی تھیں۔ ان کے نانا مناسب جنگ صدر المہامی تک کہہ چکے ہیں۔ وہ اپنے خاندان میں جدت پسند مشہور تھے۔ ہمیشہ وہ کیا جو کسی نے نہ کیا ہو۔ یہاں تک کہ اپنے خاندان کی کسی نخروں پلی لڑکی کو چھوڑ کر انھوں نے ایک مشہور زمانہ کافر ادا ایرانی حسینہ سے بیاہ رچایا۔ یہ اجتہاد اپنے وقت پر اتنا بڑا تھا کہ ان کی جاگیر بھی دہل کر رہ گئی تھی۔ کیوں کہ ابھی شاہی خاندان میں غیر ملکی بہوئیں لانے والے شہزادے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اور خاندان کے ہر نوجوان پر فرض تھا کہ وہ شاہی فرمان پر عمل کرے اور اس لڑکی کو اپنے لئے قبول کرے جو امیروں کی پنک میں حضور والا سے ایمان جنگ منظور کروا لائے تھے۔ اس لئے ایمان جنگ نے تخمی اور قلمی آموں کے پیوند ہی نہیں لگائے بلکہ گلاب کی خوبصورت ٹہنی پر ببول کی شاخ تک سجا ڈالی۔ مگر وہ شاخیں ہمیشہ ہری رہیں۔ یہ اور بات تھی کہ اس پیڑ پر شگوفوں کے ساتھ ساتھ مقدمے بازیوں اور خاندانی رقابتوں کے کانٹے بھی اگتے رہے جنھوں نے پہلے تو اوپری اوپر دلوں کو جھنجھوڑنا شروع کیا اور اس کے بعد سلطنت آصفیہ کی بنیادیں سازشوں کے زلزلوں سے دہلنے لگیں۔

یوں دیکھیے تو اس وقت زندگی بڑی پرسکون تھی۔ موسیٰ ندی کے کنارے کنارے شہر میں پھیلی ہوئی بے چینی کی لہریں ڈیوڑھیوں سے بہت دور تھیں۔ حضور کی ہمشنی کے بیاہ میں سارا شہر خوشیاں مناتا تھا۔ کیوں کہ سرکار کی ناراضگی قہر الٰہی سے کم نہ تھی۔ طاعون اور چیچک کی وبائیں پھوٹتیں تو کالی ماتا کی ناراضگی کے ساتھ ساتھ بندگانِ عالی کی خفگی بھی شامل ہوتی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز سر پہ ڈنڈا لئے کھڑا تھا۔ اور اس ڈنڈے کا رخ سب سے پہلے والیانِ ریاست کی جانب موڑ دیا جاتا تھا کہ یہاں سے عموماً بغاوت کے چھوٹے چھوٹے فتنے سر اٹھایا کرتے ہیں۔ عوام بہت نیچے اور دبے ہوئے تھے اور اوپر سے بالکل نظر نہیں آتے تھے۔ ان دنوں ریاست کے عہدے ایسے مہنگے نہ تھے کہ ان کے لئے ولایت کی بادہ پیمائی کی جائے۔ اس لئے مناسب جنگ

ابھی مناسب علی بیگ کہلاتے تھے بس یوں ہی کسی بڑے عہدے کی تاک میں لگے بیٹھے تھے کہ ایران سے یہاں بود و باش اختیار کرنے ایک نیا قافلہ اورنگ آباد کر مقیم ہوا۔ اورنگ آباد عام طور سے سب سے زیادہ ٹھنڈا ضلع کہلاتا تھا۔ اس لئے خود حضور عالی گرمی کے چند مہینے یہیں گزارتے اور عموماً باہر سے آنے والے غیر ملکی بھی قیام کے لئے اورنگ آباد ہی کو ترجیح دیتے تھے۔ یوں تو عارف بیگ ایران سے اپنے ساتھ علم و ادب کا ایک بڑا پشتارا سمیٹ کر لایا تھا کہ یہاں اپنی ادبی دھاک جمائے۔ لیکن یہ افواہ عام تھی کہ وہ دراصل اپنی کافر ادا ماہ پارہ لڑکی خوش جمال کو حضور کی نذر کرنے لایا ہے، تاکہ اپنی دال روٹی کا بندوبست کر سکے۔ خوش شکل لڑکیوں کی بدولت اس وقت بہت سے والدین اپنی کئی کئی نسلوں کی قسمت منور کر چکے تھے۔ وہ لڑکی چند مہینے حضور پُر نور کی توجہ خاص کی مستحق رہتی اور پھر عنبری باغ کے ایک تاریک کمرے میں یوں گم ہو جاتی کہ اسے سب بھول جاتے۔ سوائے اسٹیٹ کے اس محکمے کے جس کے ذمہ ان عورتوں کو تینوں وقت کھانا اور مہینے میں ایک جوڑا کپڑے بھیجنا تھا۔

عارف بیگ نے بھی کامیابی کے مراحل بڑی جلدی جلدی طے کئے اور سنا ہے اس لڑکی کی پہلی جھلک دیکھنے کے بعد ہی حضور پر نور رات بھر استراحت نہیں فرما سکے۔ اب پیشی میں رہنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ہر قیمت اور ہر شرط پر عارف بیگ کی دختر کو محل میں پہنچانے کا انتظام کر دیں کہ مناسب علی بیگ جو عارف بیگ کے پڑوسی تھے بیچ میں آن کودے تھے۔ اور اپنے خاص باورچی سے بریانی پکوا کر اس میں جانے کیا چیز خوش جمال کو کھلا دی۔ دکن کا جادو تو مشہور تھا ورنہ کیا تک تھی کہ بادشاہ کے محلوں کے خواب دیکھنے والی حسینہ ایک جاگیردار پر مر مٹی۔ سنا ہے مناسب علی بیگ کے والد اس وقت اپنے ہونے والے سمدھی سے گھوڑے جوڑے

کی رقم پر تکرار کر رہے تھے جب ایمان جنگ نے ضروری کاغذوں پر دستخط لے کر حضور کے گوش مبارک تک یہ بات پہنچا دی۔ چنانچہ مناسب علی کے خاندان پر سخت عتاب ہوا۔ اچانک ان کی اسٹیٹ پر انکوائری کمیٹی بیٹھی۔ دوڑ دھوپ کر کے مناسب جنگ نے جاگیر تو بچالی مگر ان کے وہ بھائی بہن منہ دیکھتے رہ گئے جن کے مقدر الطاف خسروانہ سے چمکنے والے تھے۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے کہ خوش جمال نے اپنی چالاکی سے شرفِ باریابی حاصل کیا اور مناسب علی بیگ اچانک نہ صرف مناسب جنگ بن گئے بلکہ انھوں نے اپنی ڈیوڑھی میں نادر اشیاء کا بے مثال اسٹاک جمع کر کے پھر حضور پر نور کو زک پہنچائی۔

تو خیر ــــــ اجالا بیگم پیدا ہوئیں تو بالکل اپنی ایرانی دادی کی شکل صورت، وہی غصہ اور غرور ــــــ اکلوتے بیٹے کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ اس لئے مناسب جنگ نے اپنی ڈائری میں لکھوا لیا تھا کہ وہ ہر جمعہ کی نماز کے بعد ضرور اجالا بیگم کو شرفِ باریابی بخشا کریں گے۔ مگر عمر کے بوجھ کے ساتھ ساتھ کثرتِ حوادث نے قویٰ کو مضمحل کر ڈالا تھا۔ اس لئے اب یہ حال تھا کہ ادھر چوبدار اطلاع دیتا کہ اجالا بیگم شرفِ ملاقات چاہتی ہیں اور ادھر ان کا ذہن کسی جی سے اتری ہوئی طوائف کی طرف جا نکلتا۔ ایک ساتھ انھیں کئی باتیں یاد آتیں۔

اعصابی قوت والا خمیرہ گاؤزبان پھر سے استعمال کرنا چاہیے۔ کئی دنوں سے خضاب نہیں لگایا ہے۔ کبھی کبھار نماز بھی پڑھنا چاہیے۔

وہ ہڑبڑا کے اٹھتے۔ موچھوں پر تاؤ دیتے۔ سینہ تان کر کھڑے ہوتے کئی نوکروں کی مدد سے جلدی جلدی چوڑی دار پاجامہ اور سرخ ہمرو کی شیروانی پہنتے۔ تب آیا پانچ سال کی اجالا بیگم کو لے کر اندر آتی۔

"اوہو ــ آپ تشریف لائے ہیں ــــ؟" وہ فوراً طوائف کے تصور کو جھٹک کر دادا بننے کی تیاری شروع کر دیتے۔ اپنی سفید موچھوں سمیت انھیں پیار کرتے جو اجالا بیگم کے اچانک منہ ہٹا لینے سے آیا کے حصے میں آجاتا۔

وہ گھبرا کے اجالا بیگم کو نیچے اتار دیتی۔

"دادا حضرت میں اب سفید گھوڑے پر نہیں بیٹھوں گا۔ وہ سائیس کا چھوکرا اجاڑ صورت اس گھوڑے کو چھو لیا۔"

"نائیں نائیں بی بی پاشا۔ گالیاں نہیں بکتے۔" وہ پیار سے سمجھاتے۔

"آں، پھر وہ اجاڑ صورت میرے گھوڑے کو پیار کیوں کرتا۔؟"

دادا حضرت مجھے اپنی بندوق ذرا دیجئے تا میں اس مردار کو مار ڈالوں گا۔" اور وہ اجالا بیگم کی معصومیت پر بے ساختہ ہنسنے لگتے۔

"آدمیوں کو نئیں مارنا بٹیا، گناہ ہوتا ہے۔"

"گناہ بولے تو کیا بات دادا حضرت ــــ؟" وہ گردن اٹھا کر پوچھتیں ــ

"اللہ میاں اپنے سے خفا ہو جاتے ہے۔"

"آں ــ آپ سے تو سب لوگ بھوت ڈرتے گتے ہے۔"

چنانچہ یہی ہوا ــــ دادا حضرت کی دھاک جما کر اجالا بیگم من مانی کرتی رہیں ــــ وہ ہمیشہ کی طرح اس دن بھی دادا حضرت کی بندوق لے کر باغ میں نکل گئیں۔ ادِر ادھر ادھر تڑا تڑ نشانے لگانا شروع کر دئے۔ اب وہ سولہ برس کی تھیں۔

وہ تو اپنی دانست میں چڑیوں کا شکار کر رہی تھیں کہ پرتاب کرن کا مالی ان کے نشانے کی زد میں آگیا۔ پرتاب کرن ریڈی سے مناسب جنگ کی پڑوسیوں کے ناطے ایک زمانے سے بگڑی چلی آرہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو اڑنگا لگانے کی فکر میں رہتے تھے۔ چلو مان لیا کہ ضلع پر مناسب جنگ کی عملداری تھی مگر یہ وہ زمانہ تھا جب پر کا کوا بنا کر انگریز ریزیڈنٹ کے آگے جاگیرداروں کے کارنامے رکھے جا رہے تھے۔ اگرچہ انھوں نے جہانگیر کی طرح انصاف کے گھنٹوں کا ڈھنڈورا پیٹ رکھا تھا۔ مگر اجالا بیگم کسی کی نوجہان نہیں ہی تھیں۔ جو کوئی مالن کے آگے اپنی جان پیش کرتا۔ باغ کے سب

مالی اس واقعہ کی شہادت دینے کے لئے باہر کھڑے تھے۔ اور دیوان خانہ میں کسی مقدمہ کی سفارش کے لئے احمد حسین آئے بیٹھے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اچانک مناسب جنگ کو کونسا مرض اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ وہ ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے ہیں۔ بڑے اصرار کے بعد جب مناسب جنگ نے اپنی مشکل بیان کی تو احمد حسین نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔ اگر احمد حسین کی بند کار میں پردے لگا کر اجالا بیگم کو اورنگ آباد سے کہیں دور بھیج دیا جائے تو یہ مالی کتنا ہی سر پیٹیں کوئی شہادت نہیں مل سکتی۔ اور پھر وہ اجالا بیگم کو اپنی کار میں چھپا کر یوں بھاگے کہ دو گھنٹے بعد ساٹھ میل دور اجنتا کے غاروں میں راج کمار سدھارتھ ہوس اور بے بسی کے ایک کھیل کو دیکھ کر اپنی آنکھیں جھکائے بیٹھا تھا۔ ایک بار پھر اجالا بیگم کے ہاتھ بندوق کو ترستے رہے اور ان کی گھٹی گھٹی چیخیں اندھیری گھاٹیوں میں گونج کر رہ گئیں۔ مگر احمد حسین بچارے کا کیا قصور! آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ان دونوں بھائیوں کے سامنے کوئی لڑکی آئے اور وہ بیل کی طرح اس پر منہ نہ ماریں اور پھر اجالا بیگم کے بے پناہ حسن سے فرشتے بھی نہیں بچ سکتے تھے۔

کئی مہینے بعد جب پرتاب ریڈی ہر طرح کی دوڑ دھوپ کر کے ہار گئے تو اجالا بیگم پھر دادا حضرت سے بندوق کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک بار پھر اجالا بیگم زار و قطار روتی ہوئی احمد حسین کی دلہن بنی رخصت ہو رہی تھیں۔

ان کی کار اس بار پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور ان کے ساتھ ساتھ مناسب جنگ کا وقار، ان کی دولت اور اجالا بیگم کا غرور بھی احمد حسین کے آگے ہاتھ جوڑے چل رہے تھے۔

ہاتھی مر کے بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ مناسب جنگ کی پونجی تک آتے آتے بھی جاگیر کی آمدنی اتنی تھی کہ احمد حسین کی سات پشتیں ٹھاٹ کر سکتی تھیں۔

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ واحد حسین کی شاعرانہ ہٹ نے بی بی سے شادی کر کے جو خاندان کی لٹیا ڈبوئی تھی، احمد حسین اسے پھر سے نکال لائے۔ یوں چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوا کہ احمد حسین کی شادی کی خبر سن کر تھوڑی دیر کے لئے تو واحد حسین بھی چکرا گئے کہ ان کا کھلنڈرا بھائی مناسب جنگ تک آخر کیسے پہنچ گیا مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا واحد حسین نے دیکھا کہ مناسب جنگ کی دولت منہ اٹھائے ان کی طرف چلی آرہی ہے۔ کیونکہ اجالا بیگم ایسی بنجر زمین تھیں جس میں کوئی کونپل نہ پھوٹی۔

کئی بار گھبرا کر انھوں نے میاں کو شادی کے لئے ٹٹولا۔ مگر احمد حسین بھی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ جی بہلانے کے لئے عورتوں کی کوئی کمی تھوڑی تھی۔ اور وہ تو ایک ہی بیوی کے مارے اپنی جان مصیبت میں ڈالے ہوئے تھے۔ اچھا ہی ہوا جو بچوں کا بکھیڑا نہیں ہے ورنہ راجہ اندر کے سے عیش وہ کیسے کرتے۔ ادھر بیوی کے سامنے الگ چوبیس گھنٹے کی دھونس تھی۔ کیا مجال کہ وہ ان کے کسی بھی نئے عشق اور نئی محبوبہ کے بارے میں چوں کر سکیں۔ انھیں پہلے ہی ذرا ذرا سی بات ناگوار گزرتی۔ گھر میں تن کھن آتے تھے۔

اجالا بیگم کبھی پلٹ کر یہ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکیں کہ اتنا روپیہ کہاں خرچ ہوتا ہے۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ احمد حسین کی اکلوتی بیگم بنی بیٹھی تھیں اور اتنی بڑی ڈیوڑھی پر راج کر رہی تھیں۔ کہیں کسی نے سنا ہوگا کہ اتنی دولت کا مالک کوئی نواب محض بیوی کی خاطر اولاد سے محروم بیٹھا رہے! لوگ اجالا بیگم کی قسمت پر رشک کرتے کہ کیسا عاشق مزاج شوہر ملا تھا۔

اجالا بیگم کو صورت تو اپنی دادی کی ملی تھی اور دماغ وہ مناسب جنگ کا لائی تھیں۔ چنانچہ ایک دن اسی صوبہ داری دماغ سے انھوں نے ایک بہت بڑی اسکیم بنا ڈالی۔ اور اتنی کامیاب کہ آج ان کے یہاں خوشی کے نقارے بج رہے تھے۔ بعض وقت یہ لے پالک لونڈیاں چھوکریاں بھی کیسا اہم رول ادا

کرجاتی ہیں! اب اجالا بیگم کو قطعی یاد نہ رہا تھا کہ بی جانی کو ان کی ماں نے جہیز میں دیا تھا یا وہ پلیگ کے کیمپ سے آنے والی لڑکیوں میں سے تھی! ایک ہو تو کوئی ان کے بارے میں سوچے۔ ان کی ڈیوڑھی میں تو دس بارہ لڑکیاں پل رہی تھیں۔ بی جانی میں بھی اور چھوکریوں کی طرح ساری کمینی خصلتیں موجود تھیں۔ قیمتی برتن چھپنا چھین توڑنا، ایک بار کے پکارنے پر کبھی جواب نہ دینا اور ایک ہی جھڑکی کی مار پر ساری حویلی سر پر اٹھا لینا۔ لیکن اس کی سب سے زیادہ جوہر کا عادت تھی وہ عشق بازی تھی۔ اجالا بیگم یوں تو ان تمام چھوکریوں کی بے لگام جوانی کے آگے بند باندھتی پھرتی تھیں، مگر بی جانی نے تو ان کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اور عشق بھی کرتی تو کس سے! اس احمق بے وقوف غلام رسول سے، جو فاطمہ بیگم کا شوہر تھا۔ مگر احمد حسین کے قرض کی بدولت رہن پڑا تھا۔ احمد حسین چاہتے تھے کہ اسے جلد چھٹکارا دلا دیں کہ فاطمہ بیگم آخر ان کی منہ بولی بہن تھیں مگر وہ اپنی ایسی ہی حماقتوں کے چکر میں پڑ کر اپنی میعاد بڑھوائے چلا جاتا تھا ——

بی جانی کے ساتھ اس کے چونچلے دیکھ کر کئی بار اجالا بیگم نے بی جانی کو ڈانٹا۔

"اری اجاڑ صورت وہ کون سا ان بیاہا ہے! فاطمہ بیگم اور اس کی لڑکی تیری جان کو رو دیں گے!" مگر بی جانی بے حیائی لادے ہر وقت تقاضہ کرتی کہ اس کا نکاح غلام رسول سے کر دو۔ اجالا بیگم کو اب اس کمینی سے نفرت ہو گئی تھی۔ انھوں نے کئی لڑکیوں کا بیاہ گڈے گڑیوں کی طرح بڑے ارمانوں سے کیا تھا۔ سچ مچ کے رقعے تک چھپوائے تھے۔ ایک بار تو تحصیلدار کے چپراسی کے لئے وہ سونے کی انگوٹھی تک لے گئی تھیں۔ مگر وہ سب کمبخت کتیا کی طرح صرف بچوں کی پلٹن بڑھانے میں جٹ گئی تھیں۔ ان کی کاہلی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے دولھے الگ سودے سلف میں سے پیسے مارنے کی فکر میں رہتے تھے اور دن بھر اپنی بیویوں سے عشق بازی میں مشغول رہتے —— کام کے نام پر اب ان کی جان نکلتی تھی۔

چنانچہ ایک رات موقعہ پا کر غلام رسول بی جانی کے ساتھ کہیں غائب

ہو گیا اورنگ آباد کے پرندے بھی احمد حسین کے حکم کے بغیر کہیں نہیں جا سکتے تھے تو بی جانی کی کیا مجال تھی! مگر اصل بات یہ تھی کہ اجالا بیگم اس دن خود ہواؤں میں تھیں۔ ضلع کا نیا مہتمم پولیس عیسائی تھا۔ اور اپنے ساتھ ایک حرّافہ سالی کو بھی لگا لایا تھا۔ وہ بس تو بمبئی کے کسی کالج میں انگریزی پڑھاتی تھی۔ مگر یہاں آ کر اس نے احمد حسین کو جانے کیسی پٹی پڑھائی کہ وہ تو بس کلب ہی کے ہو رہے۔ آٹھ آٹھ دن گھر نہ آتے۔ آتے بھی تو جوجی ساتھ۔ اپنے ساتھ اسے اپنی جاگیر دکھانے لے جا رہے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے بنا بنا کر اسے کھانے کھلا رہے ہیں۔

اجالا بیگم نے زندگی بھر شوہر کی رنگ رلیاں برداشت کی تھیں۔ مگر اس بار کچھ اور ہی آثار تھے۔ باہر تو یہ خبریں اڑ رہی تھیں کہ احمد حسین جوجی سے نکاح کر رہے ہیں اولاد کی خاطر —— مگر اندر وہ کچھ کہتے کہتے رک جاتے۔

"ہونھ — ہم مر گئے تو جانے کون فاتحہ کرے گا ہماری۔!"

"یہ ساری جائیداد ابھی سے کسی یتیم خانے کے نام لکھنا چاہیئے۔"

ایسی باتیں اجالا بیگم نے اپنے میاں سے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ عین اسی موقعہ پر جب غلام رسول اور بی جانی پکڑے ہوئے آئے تو بی جانی کو مارتے مارتے انھوں نے اپنی لات کھینچ لی۔ کیونکہ اس کے چہرے پر ایک ایسا نکھار تھا جو اجالا بیگم کے اپنے چہرے پر کبھی نہیں آیا تھا، مگر جسے پہچانتے دیر نہیں لگتی۔

اس دن انھوں نے بہت کچھ سوچا اور اس رات بہت دنوں کے بعد جب احمد حسین نے اجالا بیگم کو سونے کے لئے بلوایا تو اجالا بیگم نے سر پر پلو سنبھال کر قبلہ رو ہو کر ایک خواب سنانا شروع کیا —— رات رحمت علی شاہ نے انھیں خواب میں ایک بہت بڑی بشارت دی ہے کہ احمد حسین کا وارث بی جانی کے پیٹ سے پیدا ہوگا۔ لہٰذا انھوں نے کہا کہ اس چھوکری سے اگر وہ عقد کر لیں تو اجالا بیگم کے نہ تو حقوق متاثر ہوں گے اور نہ کوئی اور مسئلہ پیدا ہوگا۔ صاحبزادے کو وہ اپنا بیٹا بنا کر پالیں گی۔ چلو سارے مسائل سلجھ

جائیں گے۔ اجالا بیگم نے یہ خواب سنانے سے پہلے ہی باہر والے کمرے میں قاضی صاحب کو بلوالیا تھا۔ جو اپنے سامنے رکھی چھوارے بادام اور مصری کی ٹرے سے پھیسے مکھیاں اڑا رہے تھے۔ احمد حسین کو اس مسئلے پر سوچنے کی مہلت نہ ملی۔ رحمت علی شاہ سے انھیں اتنی عقیدت رہی تھی کہ آج تک ان کی ہر مراد وہیں سے پوری ہوئی تھی۔ اس لئے اس وقت بھی وہ آگے کچھ نہ سوچ سکے۔ جب قاضی صاحب احمد حسین کا نکاح بی جانی سے پڑھا رہے تھے تو بی جانی پچھاڑیں کھا کھا کر رو رہی تھی۔ جیسے اجالا بیگم اسے کسی دیو جبار کو تھمائے دے رہی ہوں۔

اس رات جب احمد حسین نے اس چھوٹی سی لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ زخمی چڑیا کی طرح کانپ رہی تھی، لرز رہی تھی۔ ساری رات اس کی چیخیں اور سسکیاں اجالا بیگم سن سن کر اپنے آنسو پونچھتی رہیں۔

دو تین مہینے اور ستر بہتر درمیان سے گزر ہی گئے۔ اور عین اس زمانہ میں جب حویلی بستر احمد حسین بننے کا پورا ارادہ کر چکی تھی ایک دن مبارک سلامت کے نقاروں میں احمد حسین نے سنا کہ وہ "والدِ بزرگوار" بن گئے ہیں۔ اب وہ رحمت علی شاہ کی کرامات کے قائل نہ ہوتے تو کیا کرتے! مجبوراً وہ حویلی کو بھول بھال کر رحمت علی شاہ کی درگاہ پر چڑھاوے اور بکرے لے جانے کی تیاریوں میں کھو گئے۔

اجالا بیگم نے حویلی کے اندر سے دس کا نوٹ نکال کر تین بار بچے کے اوپر سے وارا اور پھر تھو تھو کر کے بی جانی کی طرف بڑھا دیا۔

کھانے کی ٹرپ لوٹ کم ہوئی تو سرخ مدرسے کے دستر خوان ہٹا کر دہیں چاول اور چکنائی کے دھبوں پر میراثنوں نے ڈھول سنبھال لیا اور حلق پھاڑ پھاڑ کر

گانے لگیں۔

دالان میں پہنائے ہار کیا خوشنما لگا کے
مالی نے لایا سہرا اماں نے لائی ہار
اماں نے پہنائے ہار کیا خوشنما لگا کے

بوڑھی حضرت بیگم نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اجالا بیگم کو سرخ بنارسی ساری پہنائی اور عطر لگا کے گھونگھٹ نکال کر مسند پر بٹھا دیا۔

سات ماؤں کو بلاؤ ـــــ حضرت بیگم نے عینک میں سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے ہجوم کو دیکھا ـــــ ان کے آس پاس تمام محفل کی خواتین کھڑی تھیں اور پھول پہنانے کی رسم دیکھنے کے لئے دھکم پیل کر رہی تھیں۔ حضرت بیگم پھول پہنانے اور رسمیں ادا کرنے میں استاد تھیں۔ کیوں کہ وہ خاندان کی سب سے بزرگ بوڑھی سہاگن اور نواسوں پوتوں والی خوش نصیب بی بی تھیں۔

وہ ہر رسم کی جزوئیات سے واقف تھیں۔ اس لئے بی بیاں ہمیشہ ان ہی کو آگے بڑھاتیں۔

"صندل کہاں ہے۔ کھوپرے اور میوے کا تھال کدھر گیا؟
"صدقے کے روپے کہاں رکھ دیے۔؟" حضرت بیگم نے عینک لگا رکھی تھی مگر بدحواسی میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ادھر عورتوں کا ہجوم الگ شور مچا رہا تھا۔ پچاسیوں مائیں تو ان کے سر پر سوار تھیں اور وہ تھیں کہ سات سہاگن ماؤں کو ڈھونڈ رہی تھیں صندل دے کر پان اور چھالی سے ان کی گود بھرنا چاہتی تھیں۔

"احمد میاں کو تو بلاؤ ـــــ"

یہ سن کر آدھا ہجوم باہر کی طرف ڈھل گیا۔ اور بڑی مشکل سے عورتوں کو ٹکراتے بچتے بچاتے احمد حسین اندر آئے۔ نظریں جھکائے منہ پر دولھاؤں والی حیا آمیز جھجک اور ایک نئے نویلے باپ کا غرور آمیز اطمینان۔ ان کے

بال کچھ کچھ سفید ہو رہے تھے۔ چہرے کی لکیریں گہری ہو چکی تھیں۔ اور وہ بڑی تیزی سے موٹے ہوتے جا رہے تھے۔

آتے ہی ان کا سر منڈوے کی بیلوں میں الجھا اور ٹوپی لڑکھڑا کے مسند پر آگری۔ وہ گھبرا کے سنبھلے اور خاص خاص بزرگ خواتین کو جھک جھک کر سلام کرنے لگے۔

اجالا بیگم نے جانے کن کن خالاؤں اور چچی اماؤں کے آگے انھیں جھکنے کا حکم دیا اور وہ بیٹے کے نصیب ور ہونے کی دعائیں لیتے لیتے ہانپ گئے۔

پھر خوشبوؤں میں بسی ہوئی، ٹھنڈی ٹھنڈی ریشمیں ساریوں والی خواتین نے ہنس ہنس کر انھیں اجالا بیگم کے پاس مسند پر بٹھا دیا۔ اس موقعہ پر سب ہی خواتین احمد حسین سے پردہ کرنا بھول چکی تھیں۔ بلکہ الٹا ان ہی کو حکم دے دیا گیا کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں۔

"اگر یہ بیٹا اجالا بیگم کے پیٹ سے ہو جاتا تو ——!" عورتیں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

اچانک اجالا بیگم کی نگاہ اپنی خالی گود پر گئی اور وہ چلانے لگیں۔

"ارے بی جانی، نصیر نواب کو ادھر لاؤ۔"

سب کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ ہائے لو۔ بچہ ہی نہیں ہے اور حضرت بیگم ہیں کہ بیٹھی پھولوں کے ہار سلجھائے جا رہی ہیں۔

اندھیری کوٹھری میں بی جانی روتے ہوئے بچے کو چھاتی سے لگائے تھپک رہی تھی اور غلام رسول اس کے پیچھے پیچھے جھنجھنا لئے ٹہل رہا تھا۔

"اوئی یہ تماشہ دیکھو —— سب کام دھندا چھوڑ کر بچے کے پیچھے گھوم رہا ہے۔"

"بچے کو وہاں بلا رہی ہیں ——" ایک عورت نے بی جانی سے بچہ چھینا اور لے کر اندر بھاگی۔

حضرت بیگم نے بچے کو اجالا بیگم کی گود میں ڈال کر ان کا پلو ترکاری میوہ مصری اور روپوں سے بھر دیا۔ بچے کا صدقہ اتارا۔ اجالا بیگم اور احمد حسین کو پھول پہنا کر منہ میٹھا کیا اور اس کے بعد وارن پھیرن کا سلسلہ شروع ہو گیا خاندان کی ہر بی بی نے چاندی کے روپے ان کے سر پر سے وار کر چٹ چٹ دونوں کی بلائیں لیں۔ پھر اجالا بیگم اور احمد حسین نے اٹھ کر ساری محفل کو سلام کرنا شروع کر دیے۔

بہت پیچھے کھڑی بی جانی چپ چاپ یہ تماشہ دیکھتی رہی۔

"اجالا دلہن، دیکھو ہمیشہ بی جانی کا خیال رکھنا۔ اب اللہ رسول کی طرف سے اس کو خوش رکھنا تمہارا کام ہے۔" حضرت بی بوا نے بی جانی کے چہرے پر جانے کیا دیکھا کہ لرز کر رہ گئیں۔

"بھوتی، بچاری نے پیٹ کی اولاد آپ کی گود میں ڈال دی ہے۔" کسی اور نے تائید کی۔

"اوئی تو کیا میں حق نہیں دوں گی؟" اجالا بیگم نے برا مان کر کہا —— "آج ہی اس مردار کو نئی ساری اور کرتا دیا ہے —— بی جانی ——؟ اری چڑیل، نئے کپڑے پہن کر سب کو سلام کیوں نہیں کرتی؟"

جھینپتی شرماتی، بی جانی آگے بڑھی۔ دبلی پتلی، پندرہ سولہ برس کی سانولی سی لڑکی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس کا بچہ اجالا بیگم اپنی گود میں لئے بیٹھی تھیں، ورنہ کوئی یقین نہ کرتا کہ یہ ٹانگ برابر کی چھوکری ایک بچہ کی ماں ہے۔ اس نے اپنی کاٹ لگی بینڈلوم ساری کا پلو سر پر ڈال کر پہلے حضرت بیگم کے پاؤں چھوئے، پھر سب معزز بیگمات کی قدم بوسی کر کے وہ اجالا بیگم کے مہندی لگے سونے کی پازیبوں والے گورے پاؤں پر گر کر رونے لگی۔

"چل چل ہٹ۔" انھوں نے گھبرا کے اسے پیچھے ڈھکیلا۔ ادھر پھولوں کی ٹھنڈک سے گھبرا کے بچے نے رونا شروع کر دیا تھا اور احمد حسین ابھی تک سر

جھکائے نئی دلہنوں کی طرح بیٹھے تھے۔

" ارے یہ رونے کی بدشگونی کیوں کر رہی ہے! تیری تو آج قسمت جگی ہے دعا مانگ کہ تیرا بچہ اپنے ماں باپ کے سائے میں پرورش پائے۔ تو اب عمر بھر کے لئے روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہوگئی " حضرت بیگم نے بی جانی کو ڈانٹ دیا۔

" یہ حرافہ کیا ٹکے گی! " اجالا بیگم نے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر کہا۔

" اس کا دل ڈیوڑھی میں کہاں لگتا ہے ۔ اسے تو طرح طرح کے سیر سپاٹے چاہئیں ہر وقت۔ "

" مگر جب تک بچہ دودھ پیتا ہے اس چڑیل کے پیروں میں زنجیر باندھ کے رکھنا — " کسی بی بی نے مشورہ دیا۔

" کچھ آپ بھی تو بولئے ابا جان — " احمد حسین کی کسی رشتے کی سالی نے انھیں چھیڑا۔

" مجھے بولنے کی اب کیا ضرورت ہے! میں جاتا ہوں باہر — آداب عرض ہے — "

" بچے کا نام کیا رکھا ہے احمد میاں " ؟ کسی نے پوچھا۔

" نصیر حسین خاں — "

" اللہ مبارک کرے بہت اچھا نام ہے۔

" اجی تایا حضرت اور تائی اماں نہیں آئے بھتیجے کو دیکھنے —؟ " کسی بیگم نے رجز پڑھنا شروع کیا اور اجالا بیگم نے بند کا پہلا بول اٹھالیا۔

" کیسے آتے ممانی بیگم۔ ہمارا گھر آباد ہوا تو ان کے کلیجے پھٹ گئے نا — میری سسرال میں تو سب انتظار کر رہے تھے کہ میں مر جاؤں تو سب میری جائیداد پر قبضہ کرلیں "۔

" بس بس اب چپ رہو نا — " احمد حسین نے انھیں ہلکے سے ڈانٹ دیا

ورنہ باہر جانے لگے۔ عورت خواہ کوئی ہو اپنی سسرال کی برائی کس تندہی سے کرتی ہے!

" یہ اتنا کیوں رو رہا ہے — ؟ " بچے کی چیخوں سے اجالا بیگم پریشان ہونے لگیں۔

" لائیے مجھے دے دیجئے "۔ اس سے قبل کہ کوئی اور بچے کو لیتا بی جانی نے بیچ میں سے بچے کو جھپٹ لیا اور بھاگی اپنی کوٹھری کی طرف۔ تھوڑی دیر بعد چند عورتوں نے کوٹھری میں جھانک کر دیکھا کہ بی جانی پلنگ میں بچے کو چھپائے بڑے اطمینان سے دودھ پلا رہی ہے۔ اور غلام رسول اس کے پاس بیٹھا جھن جھنا بجائے جا رہا ہے۔

" کیسی بد ذات ہوتی ہیں یہ چھوکریاں۔ اس کی عمر تو دیکھو — ہماری لڑکیاں اس عمر میں سر پر دوپٹہ سنبھالنا بھی نہیں جانتیں — توبہ توبہ — " استانی ماں نے سر پر پلو سنبھال کر اپنے گالوں پر تھپڑ مارے —

" اللہ احمد نواب کو دین دنیا میں سرخرو کرے۔ بچارے کیسے سیدھے ہیں۔ تیس برس تک اولاد کے لئے صبر کیے بیٹھے رہے۔ اجالا بی بی کے کہنے سے ایک چھوکری کے ساتھ نکاح کر لیا۔

" دیکھنا بیٹا بھی باپ کی طرح سعادت مند ہوگا۔ اجالا بیگم تو اسے بڑے ٹھاٹ باٹ کا نواب بنائیں گی "

" کیا ہو رہا ہے یہاں — ؟ " اجالا بیگم سب کو چیرتی پھاڑتی بی جانی کی کوٹھری میں آگئیں۔ آج سرگوشیوں پر جانے کیوں ان کا دل دھڑک رہا تھا اور وہ ہر شخص کو شبہ بھری نظروں سے تک رہی تھیں۔

" کتنی بار تجھے بولی کہ یہاں نوکروں کی کوٹھری میں چھوٹے نواب کو نکو لایا کر — ! " اور پھر وہ غلام رسول کی جانب مڑیں —

" کیوں رے ماٹی ملے، تو یہاں کیوں مر رہا ہے۔ آج سب سے

ضروری کام یہی ہے کہ تو چھوٹے نواب کے سامنے بیٹھ کر جھن جھنا کھیلے ۔ ۔ "

غلام رسول کھسیا کے اٹھ کھڑا ہوا ۔ وہ نرا احمق تھا ۔ ہونقوں کی طرح ہر وقت منہ کھولے رکھتا ۔ گھٹی ہوئی چندیا چاندی کی طرح چمکتی ۔ صاحب کی قمیض کا دامن اس نے ہاتھ پونچھ پونچھ کر سیاہ کر ڈالا تھا ۔ سب پاگل کہتے تھے اور وہ اپنے اس خطاب پر بھی ہنستے جاتا تھا ۔ کوئی اس کے سامنے فاطمہ بیگم اور قیصر کا نام لے دیتا تو وہ شرم سے سر جھکا لیتا تھا ۔ جیسے وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہ ہو ——

مگر یہی غلام رسول جانے کیسے بی جانی کے آگے پیچھے پھرنے لگا تھا ۔ استانی ماں کہتی تھیں اجاڑ صورت سے اپنی جوانی نہیں سنبھلتی ۔ اجالا بیگم نے اسے دھکا دے کر ہٹایا تو وہ بڑی دیر تک کھڑا آنکھیں جھپکاتا رہا ۔ پھر اس نے جھک کر جھن جھنا اٹھایا اور بڑی عقیدت سے بڑے احترام سے اجالا بیگم کے سامنے پیش کر دیا ۔

اجالا بیگم اپنی ایک سہیلی سے بچے کو چپ کرانے کے گر پوچھ رہی تھیں ۔ غلام رسول کو یوں جھن جھنا لیے دیکھا تو پہلے تو گھبرا گئیں اور پھر مسکرانے کی کوشش کی ۔

" دیکھا بہن کیسا پگلا ہے یہ غلام رسول ۔ جانے کہاں سے خرید کر یہ دو پیسے کا جھن جھنا لایا ہے چھوٹے نواب کے لئے —— اسے بڑی محبت ہے میرے بچے سے ۔ "

ہاں بہن اس وقت سے یوں بچے کے پاس بیٹھا تھا جیسے اس کا اپنا بچہ ہو ۔ "

" ہاں اس بے چارے کی بھی تو ایک لڑکی ہے حیدر آباد میں " اجالا بیگم نے کہا ۔ لڑکی کے نام پر غلام رسول دلی مسرت سے ہنسا اور شرماتا ہوا باہر چلا گیا ۔

" اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو "

وہ جانے کب گنگناتے گنگناتے اونگھ گئے ۔

رضیہ کا چھِلّہ ہونے والا تھا ۔ چاند کے ساتھ محلے کی جانے کون کون لڑکیاں دالان میں ڈھول لئے بیٹھی تھیں ۔

سہیلی میری بھولی مولا میرا واہی لیا ماں

ان کے گانے کی آوازیں باہر ایوان غزل کے پھاٹک تک سنائی دے رہی تھیں ۔ تخت کے اوپر بی بی عینک لگائے ننھے ننھے کپڑے سی رہی تھیں نیچے فرش پر بادام ، اخروٹ اور تاریں مسری کشتیوں میں رکھی ہوئی تھی ۔ اور سگھڑ بی بی کھوپو زچہ کے لئے اچھوانی تیار کر رہی تھیں ۔

باہر بیت الغزل " میں بیٹھا ہوا راشد بیٹی ہونے کی خوشی میں دوستوں کے ساتھ قہقہے لگا رہا تھا ۔ باورچی خانے سے ماہی قلیے کے بگھار کی خوشبو مہکی اور چاند نے دوسرے گیت کا بول اٹھایا ۔

گاؤ مبارک باد دی ماں جم جم بنت نت ۔

اس گھر میں کیسا سکون تھا —— کتنا اطمینان —— ہر طرف لوگ اپنی ذات میں مگن تھے —— اب سردیاں آ جائیں گی تب رات بری نہ لگے گی ۔ واحد حسین کو رات کبھی بھی بری نہ لگتی تھی ۔ رات جو اپنے ساتھ

سنہرے روپہلے خواب لاتی ہے ——— ساری دنیا کی نگریوں سے دور لے جاتی ہے۔

اندر رضیہ کی ننھی سی بچی رو رہی تھی ——— یہاں کیسا سکون تھا۔
——— اس گھر کے اندر کسی کو پتا نہیں چلتا تھا کہ دنیا میں کہیں ایک بہت بڑا شہر ہیروشیما ایٹم بم سے تباہ ہو چکا ہے۔

دنیا آگ اور خون کے ایک بھیانک کھیل میں گھری ہوئی ہے ———

ہندوستان میں آزادی کی جنگ تیز ہو رہی تھی۔ انسان بھیڑیے بنے دوسرے انسانوں کا تعاقب کر رہے تھے ——— موت ——— تباہی، ہر طرف ہاہاکار مچی ہوئی تھی ——— یہ باہر کی دنیا واحد حسین سے بہت دور تھی۔ مگر وہ اس دنیا سے اپنا ناتا نہیں توڑ سکتے تھے۔ ان دو دنیاؤں کے بیچ ——— وہ گھرے بیٹھے تھے ——— ایسے وقت انسان پائپ میں پناہ لیتا ہے یا غالب میں ———

اور واحد حسین سوچ رہے تھے کہ شاعری کی اہمیت زندگی میں کم ہو جاتی ہے۔ مگر اکیلا غالب کہاں کہاں ان کا ساتھ دیتا ہے ——— جب وہ بے سہارا ہو جاتے۔

بالکل تنہا رہ جاتے تھے تو غالب کو تھام لیتے ———

انسان کہاں کہاں اپنی محبت کھوجتا پھرتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ——— دنیا کے سارے فن کار، سائنس داں اور دانش ور صرف ایک ہی چیز کو پانے کی جستجو کرتے ہیں ———

محبت جو زندگی سے دور انسان کی آخری منزل ہے ——— آخری پناہ ——— جس کے لئے انسان موت کو قبول کرتا ہے۔

"چلو آج لڑائی کا خاتمہ ہو گیا" ——— انھوں نے اطمینان سے اخبار کو اپنے سامنے سے ہٹایا ——— ہیروشیما کے سارے بچے جو ابھی پیدا ہوئے تھے ———

اُن بچوں کی آمد پر خوشی منانے والی مائیں ——— نانیاں دادیاں ———
بن لوچے کیا کیا واروں ماں ——— یہ عورتیں کتنی رچائی ہوتی ہیں ——— ہر نئے بچے کی آمد پر جانے کتنے خواب سجا لیتی ہیں ——— کتنے محل کھڑے کر لیتی ہیں۔

اُڑ اُڑا دھم ——— ایک ایٹم بم نے سب کو خاموش کر دیا۔ نجات کہاں ہے ——— مذہب اور خدا کا تصور ——— خدا ہے مگر وہ اپنی خدائی میں دخل کیوں نہیں دیتا ———

کئی بار واحد حسین مسکین علی شاہ طوطا چشمی کے پاس گئے۔ انھوں نے کہا وہ بحث کرنے نہیں آئے ہیں۔ مذہبی مسائل پر۔ بلکہ صرف علم حاصل کرنا چاہتے ہیں ———

مگر علم کی انتہا کہیں نہیں تھی۔ علم فلسفے میں الجھا ہوا تھا۔ صدیوں کے تجربوں اور تحقیقوں کی اپنی مصلحتوں اور فائدوں میں ——— واحد حسین اور الجھتے گئے۔

آخر انسان کون سے نظریے کو قبول کرے۔ کس مکتبۂ فکر سے اپنے آپ کو وابستہ کرے۔؟

گھبرا کے وہ پھر اپنی غزل کی طرف لوٹ آئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی مشاعرے میں بیٹھے ہیں اور چاروں طرف سے لوگ داد پھینک پھینک کر انھیں ممنون و مشکور کر رہے ہیں ———

وہ چونک پڑے سچ مچ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ چاند سے لے کر پی تک ہُڑ ہُڑ بازی میں مصروف تھے۔ جب آدمی کے پاس کچھ سوچنے کے لئے نہ رہے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ ان کے آس پاس سب وہی لوگ ہنس رہے تھے جنھوں نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ وہ صرف آج کے لئے جی رہے تھے۔

زندگی کی اس دوڑتی اچھلتی رَو سے بہت دور بیٹھے ہوئے واحد حسین اپنے خیالی معشوق کے پیکر کو کوسے جا رہے تھے۔

اس سڑے بسے موضوع پر انھوں نے ہزاروں نہیں تو سیکڑوں غزلیں تو لکھ ڈالی ہوں گی۔ بس ذرا سی ردیف قافیے کی تبدیلی کرنا پڑتی۔ یہی کہ معشوق ان کا کلیجہ بھون کر کھا رہا ہے۔ ادھر رقیب روسیاہ ہیں کہ ٹڈی کی طرح ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ مگر پھر بھی سیکڑوں بار کی چچوڑی ہوئی ہڈی کو دوسرے کے منہ میں دیکھ کر پانی بھر آتا۔

لیجئے جناب غزل تیار ہے ۔ :

مگر آج جانے کیوں اس ستم پیشہ نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ یا پھر راشد کی کم آمدنی اور قرض کی بلاؤں کو دیکھ کر وہ دور ہی سے دفعتاً بتانے لگا ہے دالان کے شور سے گھبرا کے واحد حسین نے عینک نیچے سرکائی اور گھومنے والی کرسی کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا۔

یہ سب ان کے کون ہیں ـــــ ؟ انھوں نے اپنی ذات کو فراموش کر کے سوچا ـــــ یہ شریر بچے۔ بے رحم رشتہ دار۔ نافرمان اولاد۔ اور خودسر بیوی ـــــ ان ہی لٹیروں نے تو ان کے ذہن کی جولانی ان کا خوبصورت بدن اور معشوقوں کے ہجوم ـــــ

سب ہی کچھ چھین لیا تھا۔

عورت کے بغیر انھوں نے زندگی کی کسی خوبصورتی کو مکمل نہیں سمجھا تھا۔ "دیوانِ غزل" کے باسی ہمیشہ کسی نہ کسی زلف گرہ گیر کے اسیر رہے تاکہ ان کی شاعرانہ حس بیدار رہے۔ واحد حسین نے بھی اُٹھتی جوانی کے ساتھ ہی ادھر اُدھر دل پھینکنا شروع کر دیا تھا۔ ہر روز وہ ایک نئے محبوب کے عشق میں گرفتار ہوتے۔ ساری رات ان کے آنسوؤں سے تکیہ بھیگ جاتا اور صبح ہوتے ہوتے ایک غزل تیار رہتی۔

لیکن یہ بھی ایک عورت ہی تھی ـــــ انھوں نے دوبارہ کرسی گھما کر سامنے بیٹھی ہوئی بی بی کو دیکھا ـــــ وہ بڑے سکون کے ساتھ

بیٹھی ننھے ننھے کپڑے سی رہی تھیں۔ جیسے ان کی زندگی کا اصل مقصد یہی تھا ـــــ وہ دنیا کے سارے ہنگاموں سے اور واحد حسین کے منتشر دماغ سے، ان کے تشنہ بدن سے بالکل ہی ناواقف تھیں ـــــ یہی وہ لاپرواہ عورت تھی جس نے محبوبہ بن کر ان کی زندگی میں سارے رنگ بکھیر دیے تھے۔ اور بیوی بن کر زندگی کا ہر رنگ پونچھ ڈالا ـــــ آج یہ عالم تھا کہ عدالت میں کئی کئی مقدموں کے سلسلے میں ان کا نام پکارا جاتا تھا۔ دونوں لڑکیاں اپنی اپنی سسرالوں میں سسک رہی تھیں اور انھیں پنشن کیا ملی کہ نہ جانے کتنے مرض اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ صرف پچپن برس کی عمر میں کوئی ڈاکٹر بتاتا بلڈ پریشر بڑھ رہا ہے کوئی حکیم کہتا صرف اختلاجِ قلب ہے۔ اور گو ہر جمعرات کی شام پیلے چاولوں کے اوپر بیبو، کھلادیں اور دہی ڈال کر صدقہ اتارتیں کہ ہر شام باغ میں ٹہلنے سے کوئی سایہ ہو گیا ہے۔

برانڈے کے ایک کونے میں گھومنے والی کرسی پر بیٹھے یہ سب دیکھا کرتے ـــــ یہی کہ ہوا بند ہے۔ گرمیاں شروع نہیں ہوئیں مگر بلا کا امس ہے رات کو جانے مچھر کاٹتے ہیں یا بچوں کا شور سونے نہیں دیتا۔ باغ میں تمام درخت بھی اداسی کا لبادہ اوڑھے کھڑے ہیں اور ٹپ ٹپ ان کے آنسو زرد پتوں کی طرح گر رہے ہیں۔

اخبار بھی چکرا دینے والی خبروں کے بوجھ سے میز پر پڑے پڑے کانپ رہا ہے۔

اعلیٰ حضرت کا پھر عتاب نازل ہوا۔ شاہی مطبخ کے منتظم پر۔ خانہ زادوں کو دیے جانے والے ٹماٹر کے سالن میں گھی کم کیوں ڈالا جاتا ہے! انتظام پخت و پز اتنا خراب کیوں ہے؟

یہ بات کنگ کوٹھی کے مطبخ سے نکل کر چار مینار کے چائے خانوں تک پہنچ گئی ہوگی۔ پانچ پیسے کی چائے کی پیالی سامنے رکھے دمے کے مریض شہر کے

بڈھے شاعر، اپنی بچر سس اور سیندھی پینے والے، ڈیوڑھیوں سے نکالے ہوئے آوارہ گرد، وقت کے مارے ہوئے نواب، اور سازشوں میں ادھر سے اُدھر دوڑنے والے "ہندوستانی"، وہ سب آج چائے خانوں میں اسی مسئلوں پر بحث کر رہے ہوں گے کہ آج حضور کی تیوریوں پر بل ہے خدا خیر کرے ——

جنگ ختم ہوگئی —— گاندھی جی اب بدیشی چیزوں کا بائیکاٹ کریں گے۔ اپنے آشرم میں برت رکھیں گے —— اہنسا کے زور پر اب ہندوستان کو آزاد کیا جائے گا ——

یہ "ہندوستان" دکن سے بہت دور تھا —— ذہنی طور پر وہاں کا تصور کرتے ہوئے بھی واحد حسین تھک جاتے تھے۔

ہاں آزادی بھی کتنی بڑی نعمت ہے —— اپنا بادشاہ —— اپنی ریاست —— اپنا ملک —— واحد حسین کو اپنے شہر سے اپنے گھر سے بڑی محبت تھی —— اس لئے وہ باہر کی خبریں بہت کم پڑھتے تھے —— آج کی اہم خبر —— خانہ زادوں کے سالن میں —— اور چو محلے کے کسی دربار میں ایک شاعر اپنا کلام سنا رہا ہے ؎

صنم کے رُخِ منور پر جو ایک تل سا چمکتا ہے
گویا قدرت کے منشی نے قلم جھٹکا سو نقطہ ہے

"واہ وا" کے شور سے چھتیں اُڑ رہی ہیں۔

محبوب کی مہندی میں پھولوں کے گجرے بک رہے ہیں اور کوٹھے پر ایک گلاب کی کلی جیسی نازک اندام طوائف کیدارا میں داغ کی غزل گا رہی ہے۔

؎ سرِ آدا ستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

پتھر گٹی کے سامنے سالار جنگ کا عالی شان محل کھڑا ہے۔ بے شمار کمروں میں دنیا کے نادر الوجود عجائبات اکھٹے کرنے کے بعد وہ نہایت لاپرواہی سے بیٹھے ایک کرم خوردہ مخطوطے کو عدسے کی مدد سے پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیوں کہ ان کا سب سے اہم شوق قیمتی اور نایاب کتابیں جمع کرنا ہے۔

کنگ کوٹھی کے پھاٹک سے بھوتی خاصے کے خوان پوش لئے باہر نکلے ہیں —— آج جانے کس کی قسمت جگی —— ؟

کون خاصے سے سرفراز کیا گیا۔ یہ محض اتفاق ہوتا کہ حضور کی نگاہ کسی جانب اُٹھ گئی۔ کسی کے دروازے پر کنگ کوٹھی کی تین لمبی چوڑی کاریں رکیں۔ دس پہرے دار برآمد ہوئے —— چار بھوتیوں نے مل کر ایک خوان پوش اُتارا —— ادھا کلیجہ —— ایک آم۔ ایک طشتری میں بالائی —— مگر اس کے پیچھے نوازشوں کا ایک لمبا سلسلہ ہوتا —— بڑا عہدہ —— جاگیر —— خطاب —— آنے والی نسلوں کا مستقبل اس آدھے کلیجے میں چھپا ہوتا۔

اونچی حویلی کے دیوان خانے میں قالین پر چھنو نواب تان پورہ لئے بیٹھے ہیں اور ساری دنیا سے بے خبر آنکھیں بند کئے گا رہے ہیں۔

پھلوا میں گندمیکا بسنت
ہر داموں لے دے رے

اٹھو چھنو نواب اٹھو —— بہار کا موسم کب کا بیت گیا۔

پھولوں کی خوشبو جاتی رہی —— اب تو ہر سو خزاں کا سوگ چھایا ہوا ہے پھول ابھی اپنی ننھی ننھی کونپلوں میں چھپے آرام کر رہے ہیں۔ گلاب کی کیاریاں کٹنگ کے بعد کیسی بری لگتی ہیں۔ جیسے میت اٹھ جانے کے بعد گھر پر اداسی چھا جاتی ہے —— آج مالی سوکھے پتے اٹھانے کے لئے دھوبیوں کو بلا کر لایا

ہے ۔ اب تمنا کی آگ ہر چیز کو جلا پھینکے گی ـــــ پھر گلاب میں نئی کلیاں آئیں گی ـــ نئے شگوفے مسکرائیں گے ۔

مگر میرا ذہن کیسا اڑیل ٹٹو ہو گیا ہے اب ۔ سارا دن ڈھل گیا ۔ مگر ایک بھی پھڑکتا ہوا شعر پیدا نہیں ہوا ۔

کبھی یہی بی بی تھیں جن کے تصور پر غزلوں کا سیلاب سا آجاتا تھا ـــ مگر اب وہ انگور کی اس بیل کی طرح بے مصرف ہو چکی تھیں جس کے پھل اتار لئے گئے ہوں ۔

تیئیس برس ہو گئے انھیں بی بی کا انتظار کرتے ہوئے ۔ لیکن آج انھوں نے غور کیا کہ بیوی فولاد کی طرح اپنی جگہ جمی ہوئی تھیں ۔ البتہ خود ان میں جگہ جگہ نشیب فراز آگئے تھے ـــــ بی بی اب ان کی معشوقہ نہیں رہی تھیں بلکہ جگ کی بی بی بن چکی تھیں ۔

بڑی ڈیوڑھی ، خاندان کی اونچی ناک ، واحد حسین کا عاشقانہ مزاج ، راشد کے ترقی پسند خیالات اور چاروں طرف روتے جھگڑتے ان کے نواسے پوتے ۔

یہ سب کام بی بی نے ان کے جلانے کے لئے کئے تھے ۔ جیسے وہ دور کھڑی انھیں ٹھینگا دکھا رہی ہوں ۔

سامنے تمباکو سے بھرا پائپ رکھا ہے اور بار بار آسمان کی وسعتوں کو دیکھ کر گنگنا رہے ہیں

ع اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو

ہائے ہائے ـــــ یہ غالب بھی کیا کیا کہہ مرا ـــــ ماتم یک شہر آرزو انھوں نے اپنی کٹی پھٹی غزل کو اٹھا کر پٹک دیا ۔ اور پائپ اٹھا کر پھر قافیے کی تلاش میں کھو گئے ۔

گرتا پورا کر کے بی بی نے نظریں اٹھائیں اور گم سم بیٹھے ہوئے

واحد حسین کو دیکھا ۔

بی بی اس گھر میں یوں رہتی تھیں جیسے کسی نے صحرا میں گلاب کا قلم لگا دیا ہو ، اور اسے زبردستی پھلتا پھولتا بھی دیکھے ۔

تیئیس برس گزرنے کے باوجود ان کی جڑیں اس زمین میں پیوست نہیں ہوئی تھیں ـــــ وہ اس چڑیا کی طرح رہتیں جسے یقین ہو کہ ایک دن پنجرہ کا دروازہ کھلے گا اور وہ کسی پھولوں سے لدی شاخ پر جا بیٹھیں گی ۔

بی بی کے والد واحد حسین کی ڈیوڑھی میں منشی تھے ۔ منشی گیری کرنے کے بعد وہ بیگم صاحب کو خوش کرنے کے لئے بی بی کی اماں سے بنوا کر پاپڑ بڑیاں اور اچار لے جاتے تھے ۔ کیوں کہ اپنے مالکوں کی خوشنودی حاصل کرنا ان کے خون میں شامل تھا اس لئے "ایوان غزل" میں منشی صاحب کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ۔ کوئی تقریب ہوتی تو ساری ذمہ داری کے کام انھیں کو سونپ دیئے جاتے ۔ ڈیوڑھی کی بیگمات اپنی ساسوں اور سوکنوں سے چھپ کر جو زیور یا کپڑا خریدنا چاہتیں وہ منشی ہی لا کر دیتے تھے اس ہیرا پھیری میں دو چار آنے بے ایمانی سے بچا کر جب وہ گھر جاتے تو اپنی اکلوتی بیٹی کو ان ڈیوڑھیوں کے ٹھاٹ باٹ کے حیرت انگیز قصے سناتے تھے ۔ بی بی منشی صاحب کی جھونپڑی میں پیدا ہوئی تھیں ، مگر وہ حسن لائی تھیں ، قصے کہانیوں کی محل والیوں شہزادیوں جیسا ۔ جو ان کی صورت دیکھتا دیوانہ ہو جاتا تھا ۔ مگر جب منشی صاحب اپنی بیٹی کو دیکھتے تو گھبرا جاتے تھے ـــــ ایک تو عورت ذات اور پھر اتنی حسین ۔

اللہ ہی اس کا بیڑا پار لگائے گا ۔

منشی صاحب تو ڈیوڑھی کے ان دونوں بھائیوں سے اچھی طرح واقف تھے جنھیں عشق بازی کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا ۔ اس لئے وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو کبھی ڈیوڑھی میں نہ لے گئے تھے ۔

رات کو جب وہ بیوی کو سناتے کہ "ایوانِ غزل" میں روز پانچ سیر گوشت پکتا ہے تو بیوی حیرت کے مارے اچھل پڑتیں تھیں ۔ کیوں کہ خود ان کے ہاں مہینوں

ادھا پاؤ گوشت بھی نہ پکتا تھا۔ وہ پھر ڈیوڑھیوں میں ہونے والے ظلم و ستم کے قصے سن سن کر کانپ جاتی تھیں۔

اس لیے بی بی کے چھوٹے سے معصوم دل میں نوابوں اور جاگیرداروں سے خوف کے ساتھ ساتھ شدید نفرت بھی بڑھتی گئی جو بیک وقت چار چار بیویاں کرتے ہیں پھر لونڈیوں اور داشتاؤں کی تعداد کے علاوہ ہوتی ہے۔ ان کے ہاں اولاد کی محبت خون کے رشتے سے نہیں ہوتی بلکہ مصلحتاً کی جاتی ہے۔ بی بی کو ان لوگوں سے جتنی نفرت تھی اتنا ہی ان کا جی چاہتا کہ ایکبار ان قصے کہانیوں والے کسی محل کو دیکھ آئیں۔ مگر منشی صاحب نے ہمیشہ ان کی بات کو ٹال دیا۔ اور پھر جب وہ چودھویں برس میں آئیں اور ایک پولیس کانسٹبل کا پیغام ان کے لیے آیا تو بیوی کی صلاح سے منشی صاحب بی بی کو ڈیوڑھی لے گئے ایک دن، تاکہ بیگم صاحب کو سلام کروا کے بیٹی کی شادی کے لئے کسی بخشش کے طلب گار رہوں۔

اس طرح ڈرتی کانپتی حیران پریشان سی بی بی ایک دن "ایوان غزل" میں داخل ہوگئیں۔ سفید ہرک کا پاجامہ، گلابی ململ کا رنگا ہوا کھڑا دوپٹہ، کلی دار کرتا، اور لمبے بالوں میں اوپر سے نیچے تک ہرا اور سرخ "کوٹلا" پڑا ہوا۔

واحد حسین کی خالہ اماں نماز کی نیت باندھ چکی تھیں۔ مگر سامنے سورج کی طرح دمکتی ہوئی ایک لڑکی کو دیکھ کر انھیں نیت توڑنا پڑی ——— الٰہی خیر ——— اس چھوکری کو سلامتی سے گھر پہنچائیو۔

خالہ اماں کو منشی صاحب کی عقل پر رونا آ رہا تھا۔ اس گلاب کی کلی ایسی چھوکری کو یہاں کیوں لے آیا ——— ؟ کیا جانتا نہ تھا کہ احمد حسین اور واحد حسین بے نتھے بیلوں کی طرح چاروں طرف منھ مارتے پھرتے ہیں۔ آئے دن کی عشق بازی سے سارا گھر عاجز تھا۔ احمد حسین نے اپنے خاندان کی روایت کے مطابق شاعری نہیں کی تھی۔ اس لئے وہ تو کسی ہیر پھیر کے بغیر دھیمڑنی چمارنی تک کو پکڑ لاتے تھے۔ گھر کی لونڈیاں چھوکریاں تو بےچاری ہر وقت کی ہی چیز تھیں۔ مگر واحد حسین کیوں کہ شاعر

تھے اس لئے وہ کئی کئی دن کا روگ پالتے تھے۔ اس کی وجہ سے سب ہی کی جان مصیبت میں رہتی تھی۔ ان دونوں کی ناک میں نکیل ڈالنے کی بڑے حضرت کو بڑی فکر تھی۔ وہ گھنٹوں خاندان کے بزرگ خواتین و حضرات کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھتے، مگر کہیں خاندان نیچا ہوتا تو کہیں جہیز کم ملنے کی امیدیں۔

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو ـ کاش

دوسرے کمرے میں واحد حسین گنگناتے پھر رہے تھے۔ ادھر اپنی خالہ زاد بہن کے پیچھے پڑے تھے کہ وہ اپنی سہیلی زمانی بیگم کو بلا بھیجیں۔

"بس بس اب اور پیچھا نکو کرو بھائی جان زمانی کا۔ اس کی ماں کوئی اچھا پیغام ڈھونڈ رہی ہیں۔ بچاری بچی کی زندگی کاہے کو چوپٹ خراب کرتیں"۔

اور پھر چند منٹ بعد ان کی بہن پردے کے پاس آکر بولی

"بھائی پاشا ——— ادھر آئیے ذرا یہاں سے جھانک کر تو دیکھئے۔ آپ نے اتنی خوبصورت لڑکی بھی کبھی دیکھی ہے"

واحد حسین نے پردے کا کونا اٹھا کر دیکھا ——— سامنے فرش پر جوتوں کے پاس ایک ہیرے کی کنی جیسی لڑکی دمک رہی تھی۔ سر پر دوپٹہ سنبھالے چاروں طرف یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی جیسے کسی عجائب خانے میں چلی آئی ہو۔

واحد حسین نے اس قیامت کے فتنے کو دیکھا اور جیسے سینما کی متحرک تصویر چلتے چلتے اچانک رک جاتی ہے، یوں ہی ساکت ہو گئے۔

کئی منٹ گزر گئے تو ان کی بہن نے گھبرا کے کہا۔

"بھائی پاشا، ہٹ جائیے، ادھر گوشہ ہے"۔

اور پھر وہ آگے بڑھ کر بی بی کے سامنے کھڑی ہوگئیں کہ کہیں واحد حسین ان کی سحر انگیز آنکھوں کو بھی نہ دیکھ لیں۔

پھر دروازہ بند کر کے انھوں نے کہا۔

منشی صاحب کی بچی آئی ہے۔ بچارے غریب لوگ ہیں۔ صورت شکل کی کیا

اچھی بے بول سکے"۔ انھوں نے اپنی غلطی پر گھبرا کے بی بی کی اہمیت کم کرنا چاہی۔

مگر واحد حسین نے کچھ نہ سنا۔ انھیں تو یوں لگا جیسے وہ اندھے ہوگئے ہوں۔ ان کے سامنے ایسی چکاچوند ہوئی تھی کہ اب چار سو اندھیرا ہی اندھیرا سا نظر آ رہا تھا اس گھور اندھیارے میں کیسی زمانی بیگم اور کہاں کی طوائفیں ــــ واحد حسین ساری رات بے قراری سے ٹہلتے رہے۔ ان کی بہن ڈر رہی تھیں کہ اب وہ منشی صاحب کی بیٹی کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کی بھاگ دوڑ شروع کریں گے۔ مگر وہاں تو سخت خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کھانا پانی بند تھا۔ دوستوں کے ساتھ قہقہے اور ہر ہفتے کی رات کو مشاعرے کی چیخ و پکار۔ ہر طرف اوس پڑ گئی تھی واحد حسین کو یوں لگا جیسے یہی وہ معشوق تھا جس کے انتظار میں "ایوان غزل" کے ہر شاعر نے شاعری کی تھی جیسے یہی اسی کے تصور میں غزل تھے ــــــــــ اور پھر جب ان کی ایک بھانجی نے اسکول میں کلاس فیلو ہونے کے ناطے واحد حسین کی مدد کرنا چاہی تو عجیب و غریب اطلاعیں ملنے لگیں۔

اسے سوکنوں سے نفرت ہے۔ وہ نوابوں جاگیرداروں سے سخت نفرت کرتی ہے۔ اسے ڈیوڑھیوں میں رہنا بالکل پسند نہیں۔ نوابوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ چند دن میں بدل جاتے ہیں۔

شاعری اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔

واحد حسین ہر روز ایک نئی بات سنتے۔ اور ان کی آتش شوق اور زیادہ بھڑک اٹھتی۔ وہ تو اپنی دانست میں پورے فرہاد بن گئے تھے کہ جوئے شیر بہانے کو تیار کھڑے تھے۔ ادھر ان کے ابا حضرت داغ کی صحبتوں میں بیٹھے غزلیں سناتے رہے اور واحد حسین اور احمد حسین کے لئے رشتوں پر غور کرتے رہے۔ لیکن ہوا یہ کہ آخر کار پانچ ہزار نقد کے لالچ نے منشی صاحب کو پگھلا دیا۔ "ایوان غزل" کے سب سے بڑے ہال "بیت الغزل" میں بی بی دلہن بنی اپنا جلوہ دکھا رہی تھیں۔ جب چار مضبوط عورتوں نے مل کر نکاح کے اقرار کو ان کی گردن پکڑ کر ہلائی تو وہ

بے ہوش ہوگئیں۔ اور دولہا کے بدلے سب سے پہلے ان کی صورت حکیم نے دیکھی۔ ادھر واحد حسین کے ابا کا غم سے برا حال تھا۔ کیوں کہ اپنی پسندیدہ عورتوں سے بعد میں چاہے نواب لوگ کتنے ہی نکاح چھپ دب کر کرلیں۔ مگر پہلی بار سہرے جلوے کی دلہن کسی بڑے خاندان کی عزت والی لڑکی ہوتی تھی۔

بی بی کی ساس اس بیان کی راوی تھیں کہ بی بی دن رات اس خوف کے مارے رویا کرتی تھیں کہ ایک دن انھیں ڈیوڑھی کی کسی دیوار میں چنوا کر واحد حسین ایک اور عقد کر ڈالیں گے۔ انھوں نے کبھی واحد حسین کو دل سے اپنا شوہر نہیں مانا۔ بلکہ ایک بندی لٹیرا سمجھا جو زبردستی انھیں اپنے محل میں لے آیا تھا۔ بچ نکلنے کے راستے مسدود تھے اس لئے بی بی نیک چلن قیدیوں جیسی زندگی گزار رہی تھیں۔ وہ کئی مہینے تک آنکھیں بند کئے سر جھکائے بیٹھی رہیں۔ جدھر ان کی ساس کہتیں چلی جاتیں ــــ واحد حسین جو بات کہتے مان لیتیں۔ "ایوان غزل" میں بریانی کھانے سے انھیں متلی ہوتی تھی۔ زیور کانٹوں کی طرح چبھتے ــــــ بنارسی ساڑھیوں سے وحشت ہوتی تھی۔

فرماں برداری کسے پسند نہیں۔ مگر بی بی کی خاموشی سے واحد حسین کو ڈر لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بھکاریوں کی طرح در در کا مزہ چکھنے والے واحد حسین سب نگاہوں سے توبہ کر کے بیٹھ رہے تھے۔

اگر بی بی آتے ہی زریں ساریوں اور ہیرے موتیوں کے زیوروں میں کھو جاتیں تو وہ بھی ان سے سیر ہو کر کسی اور طرف کا رخ کرتے۔ مگر بی بی تو غزل کا وہ معشوق تھیں جو خوشبو کی طرح چار سو پھیلا ہوا تھا۔ واحد حسین محسوس کرتے تھے مگر انھیں چھو نہ سکتے۔ تین بچوں کے باپ بننے کے باوجود انھیں یوں لگتا جیسے بی بی آج بھی ان کے لئے اجنبی ہیں اور وہ ازلی پیاسے بنے ہاتھ نہ آنے والی سونے کی چڑیا کے لئے جال بچھائے بیٹھے تھے۔

پھر راشد کے بڑھتے ہوئے قد نے ان کی فکریں اور بڑھا دیں۔ بشیر اور

ہنول کی ننھی ننھی شرارتیں بڑھنے لگیں۔ بی بی کے چہرے پر دمکتا ہوا سورج ڈھلنے لگا۔ اور پھر ایک وہ دن آیا جب بی بی نے اپنے ہاتھ سے راشد کے سر پر سہرا باندھا بشیر بیگم کو دلہن بنایا اور ننھے شاہین کو سینے سے لگا کر اپنی ہر شکست بھول جانے کی کوشش کی۔

ان تیئس برسوں کے پھیلے ہوئے دنوں میں بی بی نے ان سے کبھی شکایت کی نہ جھگڑا کیا انھوں نے واحد حسین کی ہر بات مانی۔ خاندان کے سارے چھوٹوں اور بزرگوں کو خوش رکھا۔ کسی کی بات میں دخل نہ دیا۔ ان کی آواز "ایوان غزل" کے در و دیوار نے بہت کم سنی۔ وہ کپڑے کی گڑیا بنی واحد حسین کے ہاتھوں میں کھیلتی رہیں۔ مگر کسی کو آج تک یہ پتہ نہ چلا کہ انھیں گاجر پسند ہے یا مولی! وہ مٹھائی شوق سے کھاتی ہیں یا کھٹائی۔

کیسی کینہ پرور تھی یہ عورت! کسی نے سچ کہا ہے کہ وہ جاگیرداروں سے نفرت کرتی ہے۔ اسے ڈیوڑھی میں رہنا پسند نہیں ہے۔ جوں جوں بی بی پیچھے ہٹتی گئیں واحد حسین تشنہ کام عاشقوں کی طرح آگے بڑھتے گئے۔ انھیں پانے کی آرزو میں بچھا کئے گئے۔

اسی لئے تو اس ستم گر معشوق کے بیان میں انھوں نے سات بیاضیں بیاہ کر ڈالی تھیں۔

مگر بی بی آج بھی بڑے سکون کے ساتھ بیٹھی نواسوں پوتوں کے کپڑے سی رہی تھیں۔ وہ دنیا کے ہر مسئلے پر ہنستیں باتیں کرتیں، مگر گھر کے ہر اہم مسئلے پر چپ ہو جاتی تھیں۔ جیسے اس سے ان کو کوئی تعلق نہ ہو۔ انھوں نے واحد حسین کی تیز و تند خواہشوں کو بھی برداشت کیا اور ان کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے بڑھاپے کو بھی سہا۔ مگر انھوں نے واحد حسین کو کبھی اپنا کہہ کر مخاطب نہ کیا
تمہارے نانا ——— تمہارے ابا ——— تمہارے بھائی ———
تمہارے دادا ——— وہ واحد حسین کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے لوگوں کو سونپتی رہیں

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو

واحد حسین نے ٹھنڈی سانس لے کر پھر پاٹ سنگایا

آج حضرت باغ کے یہاں وہ ماہانہ طرحی مشاعرہ تھا جس میں حیدر آباد کے تمام اہم، قابل احترام شاعر شرکت کرتے تھے۔ فانی بدایونی اور جلیل مانک پوری سے لے کر ڈیوڑھیوں کے وہ تمام شاعر جن کی کمر سے تلوار بندھی ہوتی، سر پر دستار ہوتی اور پتلی پتلی مینا جیسی ٹانگوں پر پاجامہ چڑھا ہوتا۔

اور آج ہی واحد حسین کی غزل پوری نہیں ہو رہی تھی۔

واحد حسین یوں تو رنگ داغ کی پیروی کرتے تھے۔ لیکن اب وہ بھی کبھی کبھار سنجیدہ مسائل پر لکھنے لگے تھے۔ کیوں کہ جب اقبال کی بانگ درا چھپی تھی اور ٹیگور نے دھیمے دھیمے سروں میں انسان دوستی اور فلسفیانہ مسائل پر گیت گانا شروع کئے تھے، اکثر شاعر خود بخود امیر مینائی، وحشت، چکبست اور اقبال کی پیروی کرنے لگے تھے۔

شمالی ہند میں یہ وہ دور تھا جب حالی اپنا مسدس سنا چکے تھے اور اس مسدس سے متاثر ہو کر ہر مسلمان کی آنکھ نم تھی۔ جذبات بھڑک اٹھے تھے اب ہر طرف اقبال کا پیغام گونج رہا تھا۔

قوالوں نے "پیا تو مانت نا ہیں" ——— اور چھا رہی کالی گھٹا جیا مورا لہرائے ہے" گانے کی بجائے۔

"منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی" الاپنا شروع کر دیا تھا۔ پریم چند کی "سوز وطن" جل چکی تھی۔ اور اس سے بھڑکنے والے شعلوں کی آنچ ہر ہندوستانی کے دل میں سلگ رہی تھی۔

ان ہی دنوں کا قصہ ہے کہ ایک دن اخبار میں واحد حسین نے "جلیان والا باغ" میں قتل عام کی خبر پڑھی اور لرز کر رہ گئے۔ وطن کے لئے جان قربان کرنے کے قصے انھوں نے بہت سنے تھے۔ مگر کبھی اس جذبہ کا تجربہ نہیں کر سکے جو اٹھتی عمر کے

لڑکوں کو ہر بات بھلا دے۔ کیا ہو گیا ۔۔۔! وہ اس کے ساتھیوں کی کوئی محبوبہ نہیں تھی! اس نے کبھی بدلتے موسموں کے سحر کو محسوس نہیں کیا تھا! عورت کا حسن و نغمے کی کشش ـــــ شعر کی لذت ـــــ اپنے گھر میں رہنے کا سکون ـــــ زندگی میں کتنے رنگ تھے ـــــ کتنے بندھن تھے ۔۔۔ واحد حسین پچپن سال سے زیادہ کے ہو گئے تھے۔ مگر مرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ انھیں موت کے نام سے خوف آتا تھا ـــــ وطن کے لئے بھی کیا زندگی سے ہاتھ دھوئے جا سکتے ہیں!

وطن کو آزاد کرانے کے لئے سیکڑوں لوگ مر مٹے ـــــ یہ ہندوستان کب آزاد تھا ـــــ؟ پہلے کہیں سے آریہ دشت نوردی کرتے ہوئے گھس آئے ـــــ پھر مسلمانوں نے ہر چیز کو درہم برہم کر دیا۔ اب انگریز قبضہ جمائے بیٹھے ہیں ـــــ انگریز جائیں گے کانگریس کا راج ہو جائے گا۔ پھر کچھ مائی کے لال اٹھیں گے کمیونسٹ بن کر ـــــ عوام کے حقوق ـــــ مساوات، جمہوریت ـــــ اس گورکھ دھندے سے نجات کا راستہ کہاں ہے۔؟ جہاں انسان سچ مچ آزاد ہو:

واحد حسین کو یوں لگتا جیسے آزادی کا تصور کسی قوم سے وابستہ ہے نہ ملک سے بلکہ صرف ایک نسل سے دوسری نسل کا ذہنی فاصلہ ہے

دو عمروں کا ٹکراؤ، دو ذہنوں کا تضاد ـــــ جب ہی تو گاندھی جی کی بنائی ہوئی کانگریس کی پالیسی نہرو کے یہاں نیا رخ اختیار کرتی ہے اور بھگت سنگھ کی جوان موت کو للکارتی ہے۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اس لئے واحد حسین اخبار میں صرف مقامی سیاست کے مدوجزر دیکھتے تھے۔ یوں بھی حیدرآباد کے اردو اخبار حکومتِ برطانیہ کی صوبائی خود مختاری اور پارلیمانی جمہوریت کے اعلان جیسی خبروں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ البتہ پنڈت نہرو جو نئی نسل کے ہیرو تھے، جب فاشزم کے بڑھتے ہوئے

خطرے کے بارے میں کچھ کہتے تو اس خبر کو کسی کونے میں جگہ مل جاتی تھی۔

اخباروں پر سخت پابندی تھی کہ باہر کی سیاسی خبروں کو اہمیت نہ دی جائے۔ کیوں کہ حیدرآباد میں اس وقت بڑا سکون تھا۔ یہاں بھی کانگریس کی کوئی سیاسی اہمیت تھی نہ کسی دوسری سیاسی تنظیم نے سر اٹھایا تھا۔ عوام اعلیٰ حضرت کے وفادار تھے اور تا ابد اس ریاست کو قائم ہونے کی دعاؤں میں شریک رہتے تھے۔

حیدرآباد کی اس مشترکہ تہذیب کی بنیاد قلی قطب شاہ رکھ گیا تھا ـــ ـــ اس نے بھاگ متی کو ملکہ بنا کر، ہندوستانی لباس پہن کر، ہندوستانی تیوہار منا کر، اردو اور تلگو میں شاعری کر کے ہندوستانی تہذیب کو ملانے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی تھی، بلکہ وہ اس کلچر میں رنگ جانے پر مجبور تھا جو اس کے آس پاس تھا۔ یوں ہی جیسے اکبر غیر شعوری طور پر ہندوستانی تہذیب میں رنگتا چلا گیا۔ ـــــ واجد علی شاہ نے ہولی کھیلی اور کتھک ناچ پر اپنے پیر ہلائے۔

اور آج کنگ کوٹھی کی ایک کرم خوردہ کرسی پر میر عثمان علی خاں بیٹھے تھے میلا اٹنگا پاجامہ، پرانی بدرنگی شیروانی اور میلی خوری ٹوپی اوڑھے وہ ایک بہت بڑی یونیورسٹی کے لئے کئی لاکھ روپے خرچ کرنے کی اسکیم بنا رہے تھے۔ جہاں ان کی رعایا اپنی مادری زبان میں تمام علوم حاصل کر سکے گی۔ یہ وہی نظام تھے جنھوں نے اپنی تخت نشینی کے دن گر جانے والی چونی کو ڈھونڈھنے میں ایک گھنٹہ صرف کیا تھا۔ انھوں نے جاگیر منصب اور خطاب دیتے وقت کبھی ہندو اور مسلمان کی اصطلاح میں نہیں سوچا تھا۔ حیدرآباد کے برہمن شیروانی پر ترکی ٹوپی پہنتے تھے اور اردو اخبار پڑھنے سے کبھی ان کا دھرم خطرے میں نہیں جا پڑتا تھا۔

بہت سی ہندو عورتیں ڈیوڑھیوں میں بیگمیں بنی بیٹھی تھیں مگر

کسی ہندو کی عزت کو ٹھیس نہیں لگتی تھی۔

چیچک کی وبا پھیلتی تھی تو مسلمان عورتیں دیوی پر چڑھاوے چڑھاتی تھیں اور درگاہوں کے عرس میں ہندوؤں کی جانب سے نذروں کے خوان آتے۔ بی بی کے علم پر مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی جانب سے شربت کی سبیل لگتی چاندی کے چاند اور پنجے چڑھاتے تھے۔ رمضان میں ہندوؤں کے ہاں سے مسجدوں میں افطاری بھیجی جاتی تھی۔

ریاست کا ہر مسلمان تلگو جانتا تھا۔ تمام ہندو لڑکے اردو میڈیم سے پڑھتے تھے، مگر انھیں کبھی مادری زبان کی جانب سے کوئی خطرہ نظر نہیں آتا تھا۔ کیوں کہ ابھی ان کے دلوں میں شک و نفرت کی ایسی آگ نہیں بھڑکی تھی جو خلوص کے ہر پھول کو جلا ڈالتی ہے۔

اسی لئے حیدرآباد کے لوگوں کی کاہلی، لاپرواہی اور تن آسانی کئی صدیوں کے ذہنی اور جسمانی سکون کا نتیجہ تھی کہ عام طور پر حیدرآباد کے ہر گھر میں نو بجے صبح ہوتی، گیارہ بجے ناشتہ ہوتا اور رات بارہ بجے سے پہلے کسی گھر میں نہ آتی۔

ایک بار شمال سے آنے والے ایک شاعر نے کسی موقع پر واحد حسین سے مذاق کیا۔

یار تم جاگیرداروں نے حیدرآباد میں صرف تین کام کئے ہیں۔ بریانی کھائی ڈیوڑھیاں بنائیں، اور نسلِ آدم کو فروغ دیتے رہے۔"

یہ سن کر واحد حسین بھڑک اٹھے۔ کیوں کہ انھیں ایک خالص دکنی ہونے کی وجہ سے باہر سے آنے والے ان نک چڑھے شاعروں سے بڑی چڑھ تھی۔ جو بات بات پر دکنی تہذیب کا مذاق اُڑاتے تھے۔ شمالی ہند کی اردو کو معیاری سمجھے وہاں کے علم و ادب کو مستند مانتے۔ اسی لئے واحد حسین نے جل کر اس شاعر سے کہا۔

"نیئں۔ ہم لوگاں ایک کام اور کرتے ہیں۔ دروازے پر مانگنے والوں

کو خیرخیرات دینا۔

سنا ہے اس شاعر نے اس بات کو بُرے معنی پہنائے اور ڈھنڈورا لے گیا۔ یہ کشن پرشاد کے عروج کا زمانہ تھا جو اپنے محل کے مشاعرے میں غزل سناتے تھے۔

میں مسلماں ہندو میں ہوں مس۔۔ں
ہر مذہب ہے مـیـرا ایمـا ں

انھوں نے بڑی گنگا جمنی تہذیب اختیار کی تھی کہ وہ ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ شمالی ہند کے ادب اور شاعری کو بھی آنکھوں پر بٹھاتے تھے اور دکنی تہذیب پر بھی ناز کرتے۔ انھوں نے دکن کی تہذیب و تمدن کو عروج پر پہنچانے میں اہم حصہ لیا تھا۔ ان کی باریک سی آواز چھوٹے سے قد اور نرم لب و لہجے میں ایسا سحر تھا کہ بڑے بڑے حاضر جواب سازشی ذہن کانپ جاتے تھے۔ مگر واحد حسین کو یہ پالیسی کبھی پسند نہ آئی۔

چنانچہ انھوں نے حضور کی پیشی میں رہنے والے جانی صاحب کے ساتھ مل کر ایک ایسا گروپ بنا لیا تھا جو باہر سے آنے والے ہر عالم اور شاعر کو کشن پرشاد کی ہزار سفارشوں اور کوششوں کے باوجود حضور کے دل سے اتارنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ وہ کہیں پہنچ بھی جاتے تو ان کی کوئی سنوائی نہ ہوتی۔ دو چار برس تک ہاتھ پاؤں مارتے اور پھر ایک دن حضرت باغ کے مشاعرے میں رو رو کر غزل سناتے تھے۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

اس طرح کئی شاعروں پر سخت عتاب نازل ہوا۔ اور کچھ موقعہ کی نزاکت دیکھ کر یہ کہتے ہوئے بھاگ گئے کہ شاعروں کے لئے ہر جگہ زمین سخت اور آسمان دور ہوتا ہے۔

واحد حسین سپوٹے تلے کرسی پر بیٹھے جانے کیا کیا سوچ جا رہے تھے۔

بس غزل تیار ہونے کی دیر تھی۔ فوراً "بیت الغزل" کے وسیع ہال کو جھاڑنا پونچھنا شروع کر دیا جاتا۔ کرسیاں ہٹا کر سفید چاندنی کا فرش ہوتا بیچ میں جناب صدر کی کارچوبی مسند بچھتی۔ ایک بڑا سا شمعدان یا چھت پر لگے فانوس روشن ہو جاتے۔ اگر بتیاں سلگائی جاتیں، چاندی کی تھالیوں میں چاندی کی ورق لگی گلوریاں، چاندی کے اگالدان، بہترین قسم کی چائے، مٹھائی، بسکٹ اور نمکین بادام۔

"بیت الغزل" کی الماریوں میں رکھے ہوئے نایاب مخطوطوں، قلمی نسخوں اور کتابوں میں چھپی ہوئی چھپکلیوں اور جھینگروں کو اس رات بڑی بے آرامی سے ادھر اُدھر بھاگنا پڑتا۔ داد کی بے ہنگم آوازوں سے ان کی نیندیں حرام ہو جاتیں۔ بلکہ ایک چھپکلی کو تو ضد تھی کہ جب کبھی واحد حسین کے کسی پھڑکتے ہوئے شعر پر واہ واہ کا شور اٹھتا تو وہ چلا کر کہتی۔

چ —— چ —— چ

اور صبح اٹھ کر وہ ڈنڈا لئے چھپکلیوں کو مارنے پہنچ جاتے تھے۔

ادھ سلگا پائپ سامنے رکھا تھا اور وہ آسمان کی طرف دیکھ کر گنگنا رہے تھے۔

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو

ماتم یک شہر آرزو —— ہائے ہائے —— یہ غالب بھی کیا کیا کہہ مرا۔
انھوں نے اپنی اُدھ لکھی غزل اٹھا کر پھینک دی اور پائپ منہ سے نکال کر اپنے آس پاس کی دنیا کو پہچاننے لگے۔

دالان میں کھیلتے کھیلتے اچانک چاند کا جی اکتا گیا۔ اس لئے اس نے نارائنا اور سیم کو بھگانا چاہا۔ وہ ہمیشہ کھیل کو بیچ راستے میں چھوڑ دیتی تھی۔ لیکن نارائنا کھیل ختم کرنے پر راضی نہ ہوا۔ کیوں کہ اب چاند کے چور بننے کی باری تھی۔

"کہہ جو دیا اب ہم نہیں کھیلتے"۔ وہ اپنے کٹے ہوئے کھلے بالوں کو سمیٹ کر پھر سے ربن میں باندھنے لگی۔ اس کے بال بالکل سنہرے تھے۔ اور اس وقت اس کے گلابی تمتماتے ہوئے گالوں پر یوں دمک رہے تھے کہ تیرہ چودہ سال کا نارائنا جانے کون سے جذبے سے مسحور ہو کر اس کے پاس آیا اور اس کے گال پر کاٹ لیا۔

"اوئی اللہ —— بدمعاش بے شرم ——" وہ اتنے زور سے چلائی کہ ڈر کے مارے نارائنا کھڑکی کے پیچھے جا چھپا۔

کیا ہوا —— کیا ہوا —— سارا گھر دوڑ پڑا۔

"نارائنا بڑا بدمعاش ہو گیا ہے —— چھچھورا ——" وہ ہنس ہنس کے ٹھنکنے لگی۔

"ہاتھ توڑ کے پھینک دوں گی اس دھیمڑ کی اولاد کے"۔

"آپ اب بڑے ہو گئے چاند پاشا، سیانے لڑکوں میں نکو کھیلو"۔ لنگڑی پھوپو نے سمجھایا۔

یہ سن کر کھڑکی میں دُبکے ہوئے نارائنا نے سر اٹھایا اور چاند کا منہ چڑادیا چاند پھر ہنس پڑی اور پھر بھاگی اسے مارنے۔

"یہ بتاؤ نارائنا نے کیا کیا تھا؟" دُلہن مُمانی نے پوچھا تو وہ شرما گئی۔ دُلہن مُمانی سے اس کی خوب بنتی تھی۔ ان ہی کو رجھانے کے لئے وہ اتنی خوبصورت فراکیں پہن کر روز شام کو نانا حضرت کے ہاں آجاتی تھی ـــ راشد ماموں اور دُلہن مُمانی اسے ہر جگہ اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔

"چھی ـــــ" اُس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپالیا۔ یہ ادا اس نے لیلا چٹنس سے سیکھی تھی۔ فلمیں دیکھ دیکھ کر وہ بہت کچھ جان گئی تھی۔ دس بارہ سال کی عمر میں ہی اسے اپنے حسن کا پورا پورا احساس تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو غیر معمولی لڑکی سمجھتی تھی۔ وہ بہت بڑے دادا کی پوتی ہے۔ بہت قابل باپ کی بیٹی ہے اور غیر معمولی حسن وجمال کی مالک ہے۔ اس لئے اسے خاندان کی فرسودہ روایتوں سے ہٹ کر چلنا ہے۔ اُسے للچائی ہوئی نظروں کو ٹھینگے بتانا ہیں۔ کتاب پڑھتے پڑھتے وہ اچانک ہواؤں میں اڑنے لگتی۔ ایک اشوک کمار کی صورت شہزادہ اسے اپنے گھوڑے پر بٹھا کر لے جاتا۔

جب راشد ماموں گوری گوری دُلہن مُمانی بیاہ کر لائے اور وہ دونوں ساری دنیا سے بے خبر دن رات چوچلوں میں مصروف رہتے تھے تو چاند چھپ چھپ کر ان کی حرکتیں دیکھتی تھی۔ تب اچانک اُسے بھی بیاہ کا شوق ہوا تھا۔ لیکن ایک ناخوشگوار واقعہ نے اسے بیاہ سے نفرت دلادی۔ ہوا یہ کہ بتول خالا کا وہ رنگ رنگیلا چھیل چھبیلا، شہزادوں جیسا لباس پہننے والا دولہا اسے دل وجان سے پسند آگیا تھا۔ جب کبھی وہ بتول خالا کے ساتھ آتا تھا تو وہ کسی نہ کسی بہانے اس کے آس پاس گھومے جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ بتول خالا کے کمرے میں پہنچ جاتا تو لنگڑی پھوپو کسی نہ کسی بہانے اسے زبردستی وہاں سے بلالیتی تھیں۔

مگر ایک دن لنگڑی پھوپو کے وہ رشتے دار دنیا بھر کے آوارہ ہوٹ

شیخو میاں آنکلے۔ حسبِ عادت بتول خالا ان سے خوب ہنسی مذاق کرتی رہیں۔ شیخو میاں ہر وقت سیندھی کے نشے میں دُھت رہتے اور بڑی گپیں مارا کرتے تھے۔ اس لئے گھر کے بچے اور بڑے انھیں فوراً گھیر کر بیٹھ جاتے۔ کوئی ان کی شادی کرانے کا وعدہ کر کے پیسے اینٹھ لیتا۔ کوئی سیندھی کے دھوکے میں مٹی کا تیل پلا دیتا تھا۔ مگر اس دن شیخو میاں گئے تو بتول کے دولہا ہمایوں نے سارا گھر سر پر اٹھالیا کہ بتول شیخو میاں کے سامنے ہاتھ منہ کھولے ہنسی مذاق کیوں کررہی تھی۔ آئندہ وہ کبھی شیخو میاں کے سامنے نہیں آئے گی۔ اس دن سے چاند کو ہمایوں سے نفرت ہوگئی۔ بلکہ اس نے شادی کے اس گھناؤنے پہلو پر بھی لعنت بھیجی اور کبھی شادی نہ کرنے کا تہیہ کرلیا۔ اب وہ ہمایوں کو بتول کے سامنے بتول خالا کے مرد اور پیٹھ پیچھے "دلِندر" کہہ کر پکارا کرتی تھی۔

کیوں کہ کسی کی بات سننا اس کی فطرت میں شامل نہ تھا۔ بشیر بیگم کبھی اس کے لئے اپنی پسند سے کچھ دار کتابیں دیتی تھیں تو وہ کبھی نہ پڑھتی۔ اس کے باوجود وہ سب کی آنکھوں کا تارا تھی۔ دادا حضرت اپنے دوستوں کو اس سے انگریزی نظمیں اور فلمی گیت سنواتے تھے۔ پاپا کے ساتھ وہ سوئمنگ پول اور رائڈنگ کلب جاتی تھی۔ شام کو شاملا دیوی کے ہاں کلاسیکل میوزک سیکھنے جاتی۔ اور کانونٹ میں کوئی فنکشن ہوتا تو آسمانی رنگ کا ہوا دار جگمگاتا لہنگا چولی پہن کر ہاتھوں میں رنگین چوڑیاں پہنے وہ ننھی سی بنجارن کا سوانگ بھر کے اسٹیج پر ڈانس کرتی۔

گنگی گاؤں کو جاتی گنگی شام کو آتی
تحصیلدار کا ڈیرا اٹھے گاؤں کا پھیرا
گنگی صاحب کا ڈر گنگی چوروں کا ڈر

اس وقت بھی اکتا دینے والی بیکاری سے گھبرا کر وہ ورانڈے کی کرسیوں پر لوٹنے لگی۔

سیلو ٹے کے پیڑ تلے اکیلے بیٹھے ہوئے نانا حضرت کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ نانا حضرت کی شاعری چاند کو بہت پسند تھی جس وقت اپنی گرجدار آواز میں ہاتھ لہرا کر بھویں تان کر شعر سناتے تھے تو باغ میں بیٹھی ہوئی چڑیاں پھر سے اڑ جاتی تھیں۔ چاند کو اس وقت گم سم بیٹھے ہوئے نانا حضرت کا چہرہ دیکھ کر اسکول کا ایک ڈرامہ یاد آ رہا تھا۔ جس میں "کنگ لیئر" بالکل نانا کی صورت کا تھا۔ یوں ہی بھاری بھر کم، گورا چٹا، ذرا سی سفید اور کالی داڑھی اور پھر ایسا ہی اداس اداس، کھویا کھویا ـــــ معصومیت جستجو اور تشنگی میں ڈوبا ہوا چہرہ ـــــ شاید سب ہی انسان بڑھاپے تک پہنچ کر جانے کیا کیا کھو دیتے ہیں۔؟ جانے کس چیز کا انتظار کئے جاتے ہیں۔ جانے کس کس کو پکارتے ہیں۔؟

نانا حضرت چاند کو بہت چاہتے تھے۔ ناشتے پہ انڈا کھاتے وقت اس کی سفیدی چاند کو دے دیتے تھے۔ اپنی سب میٹھی معجونوں اور ٹانکوں میں اسے ضرور شریک کرتے۔ باغ میں ٹہل رہے ہوں اور چاند بہت ضد کرے تو کبھی کبھار ایک آدھ نارنگی توڑ کر وہ اسے دے دیتے۔ (حالانکہ یوں وقت بے وقت پھل توڑنے کے وہ بہت مخالف تھے۔)

لیکن رنگ برنگ پھولوں کو چھونے کی اجازت کسی بھاؤ نہ ملتی ـــ کیا غضب کے پھول کھلتے تھے "ایوان غزل" میں۔! یوں لگتا جیسے کسی نے ٹوکرے کے ٹوکرے رنگ برنگے پھول لا کر ڈھیر کر دیے ہوں ـــ نانا حضرت صبح شام ان پھولوں کے درمیان ٹہلتے۔ ایک ایک شاخ کی نوک پلک درست کرتے اور بڑے اطمینان سے ان کے مرجھانے کا تماشہ دیکھا کرتے تھے۔ اس کے برخلاف چاند کی ددھیال میں، درختوں کو چھوڑ کر کوئی آدمیوں کا بھی پرسان حال نہ تھا۔ سارے گھر میں افراتفری مچی رہتی تھی۔ سارا کام نوکروں کے سپرد تھا۔

اس لئے کوئی بات ڈھنگ سے نہ ہوتی۔ چاند کی پھوپیاں اور چچی وغیرہ دن رات ملک آپ میں غرق کلبوں اور پارٹیوں میں مصروف رہتیں۔ بچے آیاؤں کی گود میں پلا کرتے۔ چاند اپنے دادا کے سر پر چڑھ کر ناچتی تھی، وہاں شور مچانے، شرارتیں کرنے اور ناچنے گانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ کیوں کہ اس کے ڈیڈی خود بھی دن رات دوستوں میں گھرے، شراب پیتے اور زور زور سے چیختے چلاتے رہتے تھے۔ یہ لوگ جانے کیوں دنیا بھر کی باتوں پر غور کرتے اور جلاتے تھے۔ چاند کے باپ کے سارے ہی دوست ایسے تھے۔ جو دنیا کے ہر غم میں، ہر خوشی میں خود حصہ لینے بیٹھ جاتے تھے۔ چاند ذرا دیر کے لئے وہاں جاتی تو پالیٹکس، گاندھی جی، سوشلزم اور فاشزم کے نام سنتے سنتے بور ہو جاتی۔ اور جس دن سے نانا حضرت نے کہا تھا کہ حیدر علی خاں کو پولیس پکڑ کے جائے گی تو وہ کئی بار ڈیڈی کو سمجھا چکی تھی کہ دنیا میں کچھ ہو آپ کی بلا سے۔ آپ کیوں ان کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔

ڈیڈی کے برخلاف اس کی ماں تھی کہ دنیا کی ہر بات میں دلچسپی لیتی۔ بشیر بیگم کو زندگی سے بے حد پیار تھا۔ وہ ایک سے ایک قیمتی ساری پہنتیں۔ طرح طرح کے زیوروں کا کپڑوں سے میچ ملاتیں۔ مہندی بھی لگاتیں اور لپ اسٹک بھی ـــــ دن رات سہیلیوں میں گھری بیٹھی ہیں اور ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ حیدر علی خاں چاہے کیسے ہی سنجیدہ مسائل میں الجھے رہیں، ان کے پاس آتے تو وہ نئی دلہنوں کے سے نخرے دکھاتیں۔ عطر میں ڈوبی پھولوں میں چھپی۔ ہر رات وہ مسہری پر تازہ پھول بکھیرتیں ـــــ ہر رات پھولوں کا گہنا ان کے لئے ضرور آتا۔

"جب میرے بیٹا ہوگا اور اس کی بہو گھر آ جائے گی تو میں اپنا سنگار کرنا چھوڑ دوں گی۔" وہ کسی کے ٹوکنے پر کہتیں۔

چاند کے بعد ان کے اور کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے ان کا

زیادہ وقت اولاد کے لئے دوائیں کھانے اور تعویذ گنڈے کروانے میں گزرتا تھا۔ دوسرے تیسرے مہینے حیدر علی خاں کبھی ان کے تکیے کے نیچے سے کوئی تعویذ نکال کر پھینکتے اور کبھی وہ پانی اٹھا کر پھینک دیتے تھے جس میں عود اور لوبان کی خوشبو لگی ہوتی تھی۔

آج واحد حسین کے ایک پرانے دوست آگئے تھے، دولھا نواب۔ اور آتے ہی حسبِ عادت خرگوش کی طرح باغ کی روش سے ایک ٹوٹی ہوئی اینٹ اٹھا کر اکڑوں بیٹھ گئے تھے۔ حالانکہ واحد حسین خود حوض کے کنارے پر چڑھے بیٹھے تھے۔ وہ اکثر باغ میں آنے والے دوستوں کے ساتھ یوں ہی کہیں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ دولھا نواب کی پرانی ہمرو کی شیروانی میں یاقوت کے بٹن لگے تھے۔ زربفت کی سلی چیکٹ دستار تھی۔ مغلئی پاجامہ اور سفید گل مچھے۔ جو بات کرتے وقت تھر تھر کانپتے تھے۔ دولھا نواب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ سوتے وقت بھی دستار نہیں اتارتے تھے۔ لنگڑی پھوپو کہتی تھیں کہ دولھا نواب کا تعلق پائیگاہ والوں سے تھا اور ان کی پولیس تک علاحدہ تھی۔ مگر دولھا نواب کے والد نے ساری دولت رنڈی بازی اور کیمیا بنانے میں ختم کر ڈالی۔ اب دولھا نواب اپنے شرابی نکھٹو لڑکوں، بیوہ بیٹی اور ان کے بے شمار بچوں کے ساتھ ڈھنڈار حویلی میں پڑے رہتے تھے۔ جو کچھ منصب ملتا اس پر گزر بسر ہوتی۔ مگر اس کے باوجود ان کی وہی آن بان تھی: وہی جاہ و جلال۔ لوگ کہتے تھے دولھا نواب کی حویلی میں خدمت گار اور لونڈیاں باندیاں نہیں رہیں مگر وہ بات بات پر گلشن اور گل بدن کو پکارتے۔ اور پھر خود ہی اٹھ کر اپنا حکم بجا لاتے تھے۔

وہ ستر پچھتر کے ہو رہے تھے۔ مگر شاعری میں انھوں نے واحد حسین کو

اپنا استاد بنایا تھا۔ خاص دکنی زبان میں شعر کہتے تھے اور اپنے شعر پر سب سے زیادہ داد بھی خود ہی دیتے۔ واحد حسین کہتے کہ وہ جاہلِ مطلق ہیں۔ اور شعروں کا وزن چھوڑ قافیے تک صحیح نہیں ملا سکتے۔ مگر ان سے دو فائدے تھے۔ ایک تو یہ کہ ہر روز اپنی تازہ غزل سنانے کے لئے وہ سب سے موزوں آدمی تھے۔ دوسرے منصوبے بنانے اور نئی نئی چیزوں کی تجارت کے خواب دیکھنے میں وہ واحد حسین سے بہت آگے تھے۔

جب سے جاگیروں اور منصبوں میں گھن لگنا شروع ہوا تھا۔ دولھا نواب نے تجارت کی ٹھانی تھی۔ خاص طور سے ملکی مصنوعات سے دنیا کو روشناس کروانے کی کوشش میں وہ اب تک پچاس ہزار روپیہ گنوا چکے تھے۔ آج کل وہ واحد حسین کے ساتھ مل کر کچی بریانی اور بگھارے بیگن ولایت کو سپلائی کرنے کی اسکیم پر غور کر رہے تھے۔ ایسی اچھوتی اسکیموں پر ان کا بیٹا راشد کوئی دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ اس بات کا واحد حسین کو بڑا دکھ ہوتا۔

"اجی قبلہ، اپن تو اب بڈھے ہو گئے ہیں۔ لیکن ہمارے تجربے کا ذہن سے فائدہ اٹھا کر نوجوان کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے ہیں نا۔"

"کیا بتاتا حضرت، ہمارے صاحبزادے بھی ایسے ہی پاجی نکل گئے۔"

دولھا نواب تائید کرنے لگے۔ "میں بولتا ہوں کہ ہم سوب کر بیٹھے۔ آپ کے راشد نواب کا فقط اتا کام ہے کہ اپنے علم سے کوئی ایسی ترکیب نکالنا کہ بریانی ولایت کو جاتے تک گرم رہے۔"

"وہ کونسی مشکل بات ہے" واحد حسین نے قریب سے لیمبو کا ایک پتا توڑ کر اسے مسلا اور سونگھتے ہوئے بولے۔

"اجی فرعون کے زمانے کی لاشیں اب تک جاں کو واں رکھی ہوئی ہیں تو کیا پندرہ بیس دن بریانی گرم نہیں رہ سکتی!

مگر ہمارے صاحبزادے تو انجینیری پڑھ کر دین دنیا سے گئے۔

"حالاں کہ تجارت اللہ میاں نے مسلمانوں کے لئے حلال بتائی ہے گھر بیٹھے ہزاروں کی آمدنی ہونے لگے گی۔"

"بگھارے بیگن کی ایک ترکیب میرے پاس ایسی ہے کہ آپ کے ولایت والے ہوٹلاں چاٹنا۔" دولہا نواب وہ ترکیب جیب میں سے نکالنے لگے۔

"فرض کیجئے ایک میر بریانی پر ڈیڑھ روپیہ خرچ ہوتا ہے اور ہماری کمپنی اس پر ایک روپیہ منافع لیتی ہے۔ اب اگر روزانہ ایک ہزار ڈبے بکنے لگے۔ تو منافع کتنا ہوا ــــــ"

واحد حسین حوض کی منڈیر سے اتر کر اکڑوں بیٹھ گئے۔ اور سرخ موم پر انگلی سے حساب کتاب لکھنے لگے۔

آمدنی کے نام پر دولہا نواب نے ادھر ادھر کسی کو نہ پا کر اطمینان کر لیا۔

"دیکھنا واحد نواب ــــــ ہماری اس اسکیم کو کبھی کوئی نہ کوئی چالو آدمی لے اڑے گا۔"

اب جو چاند نے کمرے کی کھڑکی کی باغ کی طرف دیکھا ہے تو نانا حضرت نیمو کے حوض کی منڈیر پر بیٹھے نظر آئے۔ مگر جانے کیوں اس وقت چاند کو دونوں ہاتھوں میں سر تھامے اینٹ پر بیٹھے دولہا نواب بڑے مسخرے سے نظر آ رہے تھے۔ نانا حضرت غزل سنانے کی دھن میں یہ بھی بھول گئے تھے کہ دولہا نواب کے لئے ایک کرسی ہی منگوا لیں ــــــ مجبوراً چاند خود ہی ایک کرسی دولہا نواب کے لئے لے گئی۔

"شاباش۔ جیتے رہو بیٹا ــــــ یہ بشیر بیگم کی صاحبزادی ہیں۔"

دولہا نواب جلدی سے اچک کر کرسی پر بھی یوں ہی اکڑوں بیٹھ گئے جیسے اب بھی اینٹ پر ہی ٹکے ہوں۔

"ماشاءاللہ بالکل اپنی والدہ کی طرح خوبصورت ہیں۔"

"سلام کیا دادا حضرت کو۔؟" واحد حسین نے چاند کو گھورا۔

وہ کھسیا گئی۔ تو بھلا اب ان دولہا نواب جیسے خرگوشوں کو بھی سلام کرتی رہے گی۔

"ہاں ہاں کیا تھا ــــــ" بات ٹالنے کے لئے دولہا نواب صفا جھوٹ بول گئے۔

"نہیں کیا ــــــ" اس نے جھٹ صفائی پیش کی۔

"ہیں ہیں ہیں ــــــ" دولہا نواب کھسیا کر ہنسنے لگے۔

"خیر، تو میں کہہ رہا تھا ــــــ" واحد حسین نے پائپ منہ سے نکال کر دوبارہ بات کا سلسلہ جوڑا۔

"کہ خوبصورت عورتاں تو اللہ میاں ہمارے بہلانے کو بنائے ہیں۔ مگر حضرت اللہ میاں نے عورت کو زبان اور ذہن دے کر اس کا آدھا حسن کھو دیا ہے۔"

بات جانے کس طرح بریانی سے ہوتی ہوئی عورت کے حسن کی طرف آنکلی تھی۔

"جی ہاں۔ جی ہاں ــ عورت تو اللہ میاں نے آدم کا جی بہلانے کے لئے ہی پیدا کی تھی نا۔ اسی واسطے تو غزل کے معنی بھی عورتوں سے باتاں کرنا ہے۔" دولہا نواب اپنی بات پر خود ہی زانو پیٹ پیٹ کر ہنسنے لگے۔

"تو ــ تو نانا حضرت عورتیں گونگی ہوتیں ــــــ" چاند نے گھبرا کے نانا سے پوچھا۔

"ہاہاہا ــــــ ہوہو ــــــ" دولہا نواب پھر چاند کی بات پر ہنس پڑے۔

"دیکھا حضرت، آپ کی نواسی انگریزی پڑھ رہی ہے بول کے۔ کیا پوچھ رہی ہے ــــــ؟ اس واسطے بولتے کہ بہو بیٹیوں کے سامنے شاعری نئیں کرنا۔ آخر حویلیوں میں مردانے اور زنانخانے اسی لئے بنوائے گئے ہیں نا۔"

"ہو ہو ہو ــــــ" واحد حسین بھی اس کی بات پر نہایت مصنوعی پن سے ہنسے۔ انھیں دل کھول کر ہنسنا کبھی نہیں آیا تھا۔ کیوں کہ عمر بھر تحصیلداری کرتے رہے جس میں ہنسنے کی بالکل ضرورت نہیں پڑتی۔ یا سگار پی پی کر شاعری کرتے رہے۔ ایسے وقت

کسی بچے کی شرارت پر چونکنے تو ہنسنے کی بجائے وہ رقیب روسیاہ نظر آیا۔

اگرچہ شہر کے تمام ادبی ملقے جانتے تھے کہ نواب واحد حسین المتخلص بہ واحد ایک نامی گرامی یگانہ روزگار شاعر حیدرآباد میں موجود ہے مگر کسی نے انھیں کبھی مشاعرے کی صدارت تک نہ سونپی۔

البتہ ضلع میں جب کوئی نیم سرکاری تقریب ہوتی تو مشاعرہ بھی ضرور ہوتا اور اس مشاعرے کی صدارت واحد حسین خود سنبھال لیتے تھے۔ ایسے موقع پر وہ عموماً چار پانچ غزلیں سامعین کے کانوں میں انڈیل کر ہی دم لیتے تھے۔ کس میں دم ہوتا کہ سننے سے انکار کرے۔

"کیا سلارو دوا لے آیا ۔۔۔؟"

واحد حسین بار بار چونک کر پوچھتے۔

"اس وقت ناحق بھیجا اسے بازار ۔۔۔ اعلیٰ حضرت کی سواری مادرِ دکن کو سلام کرنے جاتی ہے۔ اس وقت سڑکیں سب بند ہو جاتی ہیں۔

رضیہ نے سلارو کی حمایت میں کہنا شروع کیا۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ آج اس کے خسر کا پارا بہت چڑھا ہوا تھا۔ اور کسی نہ کسی نوکر کی شامت پکار رہی تھی آج۔

"سب غلط۔ آج جمعہ ہے۔ آج اعلیٰ حضرت باغِ عام گئے ہوں گے۔ اس وقت نماز پڑھنے۔"

"تو پھر بیگم صاحب دواؤں کی دکان میں گھس گئی ہوں گی۔"

رضیہ نے سلارو کے لئے دوسرا اپجاد کیا۔

بیگم صاحب، دن بھر وہ بازاروں، سڑکوں پر، پردہ لگی کار میں گھومتی پھرتیں، جہاں چاہتیں کار کو روک لیتیں جس خوانچے والے کو چاہتیں لوٹ لیتیں، جس دوکان میں گھس جاتیں تو من مانی چیزیں لے جاتیں۔ یہ سب قانون شکنی وہ اعلیٰ حضرت کو جلانے کے لئے کرتی تھیں۔ کیونکہ کنگ کوٹھی میں ان کی بجائے کوئی اور حسینہ منظورِ نظر بنی ہوئی تھی۔

"آپ کالس چلے دلہن بیگم تو پورے شاہی خاندان کو سلار دکے سامنے لا کھڑا
کردیں" واحد حسین کی بات پر سب ہنس پڑے۔ اندر ثروت آرا اور راشد پان کھاتی
ہوئی بی بی جی کو مدد دے رہی تھیں۔ اور چھالیہ کاٹتی ہوئی سنتری جیجو پو
"چلو یہ اچھا ہوا کہ اجالا بیگم کو نواسہ مل گئی" ... بنانے کے لئے گڈی
چھوپو نے نواسے کا پہلا بول اچھالا۔
واحد حسین نے پاندان نیچے رکھ دیا اور بڑے صبر کے ساتھ
گوہر بیگم کو دیکھنے لگے۔
"اجالا بیگم کچھ کریں مگر قانون تو اسے احمد میاں کا بیٹا نہیں ملنے دے گا ---"
کیوں راشد میاں؟" انھوں نے بڑی امید بھری نظروں سے راشد کی طرف
دیکھا۔ کبھی کوئی ان سے پوچھتا کہ زندگی بھر کیا کیا ---؟ تو وہ راشد کو پیش کر دیتے
دوسرے جاگیرداروں کو دیکھئے کہ سات سات بیٹے ہیں اور سب کے سب جوتیاں
چٹخاتے پھرتے ہیں۔ عدالتوں میں گھسیٹے جاتے ہیں اسی دیمک اپنی جائیداد
کی آس میں جی رہے ہیں۔ اور ایک راشد تھا کہ اسکی قابلیت کو مان کر خود
حکومت نے انجینیرنگ پڑھنے ولایت بھیجا --- اور نچا پورا --- شان دار
سوٹ پہنے اپنی چھوٹی سی کار میں گھومتا ہے۔ دنیا اسکی قابلیت کو مانتی ہے ---
اس نے حیدرآباد میں ایسی ایسی خوبصورت عمارتیں بنوائیں کہ شہر جگمگا اٹھا۔
اور پھر مزاج ایسا سادہ کہ جاگیرداری کا غرور چھو کر نہیں گیا۔ مصلحت پسند ایسا
کہ ہمیشہ دور کی بات سوچتا تھا۔ باپ کا ہر وقت خیال، ماں کی دلداری اس
پر فرض۔ رشتہ داروں عزیزوں میں وہ مقبول۔ بیوی پر فدا ---
اس کی ان ہی خوبیوں کی بنا پر واحد حسین نے اس کے لئے جاگیرداروں
کے بجائے رضیہ ڈھونڈی۔ رضیہ کے دادا نے چھوٹے سے پیمانے پر
ایک سگریٹ فیکٹری قائم کی تھی۔ جو دیکھتے دیکھتے لاکھوں روپیہ کا
سامان پیدا کرنے لگی۔ اب اس کا باپ ایک دن میں اتنا کماتا تھا جتنا ایک پائگاہ

والا جاگیردار ایک مہینے میں بھی نہیں پا سکتا۔ رضیہ راشد کے گھر آئی تو ساتھ میں
ایک کار لائی، ایک بنگلہ، سو تولے سونا، اور ایک لاکھ نقد۔ اب واحد حسین ایسی بہو
کو سر آنکھوں پر نہ بٹھاتے تو کیا کرتے ---؟
احمد حسین کے وارث کی پیدائش پر بھی راشد بار بار یہی کہتا --- "اس بات پر شور
مت مچائیے اس وقت بابا۔ خدا چچا ابا کو سلامت رکھے۔ ان کے بعد نپٹ لیں
گے اجالا چچی سے۔"
"سنا ہے اجالا بھابی بچے کو مولوی بنائیں گی۔ انھوں نے رحمت علی شاہ
کے مزار پر یہی منت مانی تھی۔"
"تو پھر ابھی سے بچے کو ایک داڑھی لگا دیں"۔ رضیہ ہنسنے لگی۔ رضیہ لکھ پتی باپ
کی بیٹی تھی اس کے باوجود اجالا بیگم کی جائیداد ہاتھ سے نکل جانے کا غم آجکل
اسے پاگل بنائے ہوئے تھا۔
"پہلے تو شریف خاندانوں میں ہر مرد داڑھی رکھتا تھا۔ ہمارے خاندان
میں بھی سب نے داڑھی رکھی۔ بس ایک احمد میاں نے یہ روایت توڑی
کہ داڑھی رکھی نہ شاعری کی"۔ گوہر پھوپو نے کہا۔
"اور ہمارے خاندان میں تو ——— واحد حسین دوا کا
انتظار بھول کر اٹھ بیٹھے۔
"ہمارے خاندان میں ہر مرد نے شاعری کی اور داڑھی رکھی۔ ہمارے
دادا حضرت مرحوم، اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، بڑے وضع
دار انسان تھے --- کیا آن بان تھی --- مجھے کل کی سی بات یاد ہے۔"
انھوں نے خلا میں دور کہیں دیکھتے ہوئے کہا۔
دادا حضرت ہمیشہ مشجر کی شیروانی اور زریں دستار پہنتے تھے۔ صبح بیت الخلا
کو جاتے تو پہلے حقہ وہاں جاتا۔ ایک تپائی پر بیاض اور قلم دوات رکھا جاتا تھا۔
انھوں نے اپنی سب مشہور غزلیں اسی طرح لکھی تھیں۔ صرف ہمارے تایا حضرت

گوہر بیگم کے ابا کو شاعری سے بڑی چڑ تھی۔ کہتے تھے اس خاندان کو شاعری کی ابتلا نے کھا لیا۔ یہ نحوست کی پوٹ ہے۔ ادبار کی نشانی، ساری عمر، دولت، شراب، طوائف اور مشاعروں میں بہہ جاتی ہے۔"

"ٹھیک تو کہتے تھے۔" بی بی نے پھر پاندان کھول کر کہا۔

"سچی سب ہی کچھ اجڑ گیا اس خاندان کا۔" گوہر بیگم نے ٹھنڈی سانس بھری۔ راشد اور رضیہ بڑے غور سے ان باتوں کو سن رہے تھے۔

"بڑے سمجھ دار تھے تایا حضرت۔ دادا جان خاندان میں کسی پر اعتبار کرتے تو صرف انہیں پر۔" گوہر بیگم اپنے ابا کا ذکر سن کر آنسو پونچھنے لگیں۔

واحد حسین کے چہرے پر اس وقت یادوں کے بہت سے چراغ لو دے رہے تھے۔

"اور پھر جب زوال ہوا ہے تو اس رات دادا حضرت نے شراب کو بالکل ہاتھ نہیں لگایا تھا۔"

"زوال ——— کیسا زوال ہوا ———" راشد نے اخبار رکھ کر بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"دراصل انگریز ریذیڈنٹ سے کسی بات پر دادا حضرت کی چل گئی تھی اور پھر یہ بات بگڑتی ہی گئی۔ ریذیڈنٹ نے الزام لگایا کہ حضور کی حرم سرا میں عورتوں پر بڑا ظلم و ستم ہوتا ہے۔ تحقیقات کے لئے ایک کمیشن آیا۔

"تو کیا ظلم و ستم ہوتا تھا ———؟" راشد نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" واحد حسین نے اطمینان سے پائپ سلگا لیا۔

"اس وقت قاعدہ تھا کہ سب ہی نواب دل بہلانے کے لئے خوبصورت لڑکیاں کو محل میں شامل کر لیتے تھے۔

یہ لڑکیاں غریب ماں باپ کے یہاں فاقے کرتیں یا کسی نکمے جاہل آدمی سے بیاہی جاتیں تھیں۔ لیکن محلوں میں انہیں شاندار گھر ملتے۔ ان کے نام پر

جاگیریں اور منصب ہو جاتے۔ ان کی اولاد کا مستقبل درخشاں ہو جاتا تھا۔

ان لڑکیوں کے ماں باپ الگ بخشش سے اپنی قسمت سنوار لیتے تھے۔ مگر پھر بھی دنیا بھر میں روتے پھرتے کہ ان کی لڑکیوں کو زبردستی نواب لوگ اٹھا لیتے ہیں۔

"تو پھر دادا حضرت نے کیا کیا ———؟" راشد نے پوچھا۔

راشد کو آج ایک ضروری میٹنگ میں جانا تھا۔ رات کو کلب میں ڈانس تھا مگر اس وقت بابا سے پرانے قصے سننا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"ہاں تو اس رات دادا حضرت کے سامنے کاغذ پھیلے ہوئے تھے اور ایسے وقت کسی کو ان کے پاس جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ دادی اماں تو پہلے ہی اپنے بچوں سمیت حویلی کے دوسرے میں جا بیٹھتیں۔ کیوں کہ اس زمانے میں ایک طوائف پاروتی ان کی منظورِ نظر بنی ہوئی تھی۔

میں وہ منظر ابھی تک نہیں بھول سکا۔"

واحد حسین کہے جا رہے تھے۔ اور ان کے آس پاس بیٹھے ہوئے بی بی، گوہر بیگم، راشد اور رضیہ یوں ساکت بیٹھے تھے جیسے وہ واحد حسین کے ساتھ کسی عجائب خانے میں گھوم رہے ہوں۔

"پاروتی کے ساتھ ہم سب شکرموں میں لمبے ہاتھوں کو جا رہے ہیں ایک شکرم میں ہم، توشہ خانہ کسی میں نوکر کسی میں سامان — ساتھ میں چپراسی اردلی ———

کچی سڑکوں پر املی اور پیپل کے گھنے سائے ملتے ہیں۔ آس پاس چاول کے کھیتوں کا مخمل پھیلا پڑا ہے۔ اس کے پرے گھنا جنگل ———

سرخ سرخ پہاڑیوں کے اوپر نیلا آسمان اور آسمان پر تیرتے ہوئے بادل تک مجھے یاد ہیں۔ ——— فضا میں دھان کے پودوں کی مہک پھیلی ہوئی ہے کوئی ٹڈا کاٹے کھیتوں کو پاٹتا ہوا نکل جاتا ہے۔ کہیں کھیتوں

پر سے چڑیوں کا ایک غول اڑ کر آسمان پر بکھر جاتا ہے۔ کہیں ایک دھیمرتی سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے جا رہی ہے چھوٹے چھوٹے ننگے بچے املی کے جھاڑوں پر چڑھے پیلی پیلی کونپلیں توڑ رہے ہیں کہیں دور ایک کھیت کے کنارے نیچے بیٹھے بگـــ رہے ہیں۔

"توبہ یہ منظر نگاری ـــ شاعری ـــ" رضیہ اکتا گئی۔

"اور گاڑیوں میں سے جھانکتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر وہ ہمارا منہ چڑا دیتے ہیں۔ میں کھسیا کر اپنا منہ اندر کر لیتا ہوں۔ ـــ"

پھر اچانک شام آگئی۔ اور ہم سب ضد کر رہے ہیں کہ ڈاک بنگلے میں رہنے کی بجائے جنگل میں خیمے لگوائیں گے۔

رات کو خوب مزا آئے گا ـــ مگر کیسی تفریح ـــ

ہم بچے جانے کس چیخ و پکار سے جاگے تو آدھی رات کو عورتیں سجدوں میں پڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ چنانچہ ہم سب بچے اپنی اپنی ماؤں کی ساریوں میں چھپے سسکنے لگے۔ کیوں کہ چند کسانوں نے گزرتے وقت کہہ دیا تھا کہ عورتوں کے خیمے یہاں کیوں لگوائے ہیں۔ ندی کے کنارے بنجاروں کا پڑاؤ ہے جو ڈاکے ڈالتے ہیں۔ یہ سن کر عورتوں کی حفاظت کے لئے ساتھ چلنے والے سالارِ قافلہ غوثو میاں لمبے لمبے لیٹ گئے۔

"آپ خواتین کی ضد تھی۔ ڈاک بنگلہ چھوڑ کر جنگل میں کیوں ٹھہرے تھے"

"الٰہی میری کنواری بیاہیوں کی عزت تیرے ہاتھ ہے۔ یا اللہ رات خیریت سے گزار دے تو بی بی کے علم پر سونے کا چاند چڑھاؤں گی۔"

دادی سجدے میں گری منتیں مانگ رہی تھیں۔

پھر کچھ سوچ کر پاروتی اٹھی ـــ وہ دادا حضنت کی نکاحی بیوی نہ تھی۔ مگر سہرے جلوے کی بیاہی بیوی سے زیادہ چاہی جاتی تھی۔ اس کے باوجود رنڈی سے رشتہ لگانے کو خاندان کا کوئی فرد تیار نہ تھا۔

اس لئے آخر کار سب اسے "بائی ماں" کہتے تھے۔

واحد حسین پائپ سلگانے لگے تو پاروتی کے تصور میں کھو گئے

"کیا عورت تھی راشد میاں، آدھی رات کو جنگل کے اندھیرے میں اس کا چہرہ چراغ کی طرح دمکتا تھا۔ جس طرف دیکھتی سب اسی کے ہو جاتے۔ مجھے تو گھنٹوں گود میں لئے بیٹھی رہتی تھی۔ جب تک وہ سامنے نہ بیٹھتی دادا حضرت شعر نہیں کہہ سکتے تھے۔ یہی سمجھ لو کہ دادا حضنت جیسے آہنی انسان کو اس نے تگنی کا ناچ نچا ڈالا تھا۔ تو بھئی اس نے غوثو میاں کے کپڑے خود پہنے، شیروانی پر دستار لگا کاجل کی مونچھیں بنا چوب دار سے بندوق چھین کر خیمے کے باہر جا کھڑی ہوئی۔ جب وقت مشعل ہاتھ میں لے کر ٹہلنا شروع کیا ہے تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی مغل شہزادہ اپنے حرم کی حفاظت کے لئے ٹہل رہا ہو۔ سب کے دھڑکتے ہوئے دل پرسکون ہو گئے۔ بچے اطمینان سے سو گئے اور غوثو میاں آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھے۔

دادی ان رنڈیوں سے بات نہیں کرتی تھیں۔ اس کے باوجود انھوں نے کئی مرتبہ اوپری دل سے کہا۔

"اری پاروتی خاک ڈال مال و دولت پر ـــ کوئی تجھی کو لے جائے گا۔ اندر چلی آ۔"

"ہو بیگم صاحب، خاک ڈالتی ہوں مال و دولت پر۔" اس نے جھک کر دادی کو جواب دیا "میں تو یہاں کنواری بیاہی سیدانیوں کی حفاظت کے لئے کھڑی ہوں۔"

اور پھر ہنس کر بولی ـــ "کہیں کوئی رنڈیوں کو بھی لے کر بھاگتا ہے بیگم صاحب؟"

"ایسی ہوتی تھیں اگلے زمانے کی وضع دار رنڈیاں۔"

اور واحد حسین نے چاروں طرف تحسین بھری نظروں سے دیکھا۔
کیا مجال جوان کے سامنے کوئی لڑکی ننگے سر آجائے، کوئی زور سے ہنسنے لگے۔ دسہرے کے دن پاروتی کی ماں بہن اس سے ملنے آتی تھیں تو کبھی انھیں اندر نہ بلواتی۔ ہمیشہ ان کے لئے ڈیوڑھی کے پھاٹک پر کرسیاں ڈلوا دی جاتیں۔ وہیں دروازے میں کھڑے کھڑے پاروتی ان سے بات کرتی تھی۔

"کیوں ان کے لئے کرسی کیوں رکھی جاتی تھی ــــ؟" رضیہ نے بڑے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

"اس لئے کہ اس زمانے میں صرف مرد اور رنڈیاں کرسیوں پر بیٹھا کرتے تھے ــــ مجھے یاد ہے کہ ایک دن بڑی آپا کھیل کھیل میں کرسی پر جا بیٹھیں تو پاروتی نے خود گود میں اٹھا کر کہا تھا۔

"آپ کرسی پر نئیں بیٹھنا میرے پاشا جانی ـ کرسی پر مرد لوگ بیٹھتے ہیں یا ہم رنڈیاں بیٹھتی ہیں۔"

"یہ بھی کوئی سہاگ ستی کی پوتی نواسی ہوگی"۔ راشد نے سوچا۔

"تو جس دن آپ کے دادا کا انتقال ہوا اس دن کیا ہوا تھا ــــ؟" رضیہ نے پوچھا۔

"ایں کیا کہا ــــ؟" واحد حسین نے یوں چونک کر راشد کو دیکھا جیسے بالکل کسی اجنبی جگہ نکل آئے ہوں۔ پھر سنبھل کر ہو بیٹھے۔ عینک اتار کر آنکھیں ملیں۔ چھوٹی سی فرنچ کٹ داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ دوبارہ عینک لگائی اور نومبر کی خنک رات کی کپکپی ان کے بدن میں دوڑ گئی۔

"تو جس دن دادا حضت کا انتقال ہوا ہے۔ اس دن صبح پاروتی کیا دیکھتی ہے کہ ان کے چاروں طرف ڈھیروں کاغذ بکھرے پڑے ہیں۔ بادام کے حریرے میں سے بھاپ نکلنا بند ہوگئی ہے۔ بیت الخلا میں بیاض اور قلم تپائی پر رکھا جا چکا ہے۔ وضو کا پانی رکھے رکھے سرد ہو رہا ہے۔ وہ اسی

طرح سر جھکائے چوکی پے شمع دان کے سامنے بیٹھے ہیں۔
پاروتی نے آہستہ سے کہا۔

"فجر کی اذان ہوگئی سرکار اٹھیے گا نہیں ــ؟"

یہ سن کر انھوں نے آنکھیں اٹھا کر پاروتی کو دیکھا۔ پاروتی قسمیں کھا کر کہتی تھی کہ آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور پورے کمرے میں ایک عجیب سی لوبھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ــــ پھر وہ آہستہ سے بولے۔

"سحر اب نہیں ہوگی۔ دیکھ تو کیسی بھیانک رات ہے۔"

پاروتی کمبخت ہنس پڑی اور اسے دادا حضت کا کوئی عاشقانہ فقرہ سمجھ کر ان کے قریب چلی گئی۔

"تو کیا شمع اب بجھا دوں ــ؟"

یہ سن کر دادا حضت تڑپ اٹھے۔

"اب اس میں کیا دھرا ہے یہ تو راکھ ہے راکھ۔"

پارو کہتی تھی کہ اب جو میں نے دیکھا تو ــــ؟

ہونہہ ــــ؟ سب آنکھیں پھاڑے سانسیں روکے واحد حسین کو گھور رہے تھے۔

"تو کیا ہوا ــــ؟" راشد نے اسی محویت کے عالم میں پوچھا۔

"کچھ نہیں ــــ" واحد حسین نے آہ بھر کر چھت کی طرف دیکھا۔

"وہاں سچ مچ ہر چیز راکھ بن چکی تھی ــ بس تھوڑی دیر بعد ہی پولیس کی دوڑ آ گئی ــ "ایوان غزل" پچاس لاکھ کا مقروض تھا۔ اور ستر عورتیں یہاں چھپائی گئی تھیں۔

"کیسے نفیس در تھے ــــ" لنگڑی پھوپو نے عقیدت اور دکھ کے ملے جلے انداز میں کہا۔

"دادی اماں کہتی تھیں کہ میں سمجھی کہ وہ سب کاغذ وصیت نامے ہوں گے۔ مگر وہ سب غزلیں تھیں ——— یعنی ایک رات میں پندرہ غزلیں۔

——!" واحد حسین نے سب کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا اور خود ہی جھومنے لگے۔ ——" اور پھر ایک ایک شعر ایسا کہ ساری عمر کی ریاضت کے بعد بھی دوسرا شاعر نہ کہہ سکے۔

حکیم شفاعت علی نے تو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ ایسی غزلیں کہنے کے بعد ان میں کیا رہا تھا جو جیتے ———؟

"ہونہہ —— پھر کیا ہوا ——؟" چاند ابھی تک منہ کھولے بیٹھی تھی جیسے بس اب اس دلچسپ کہانی کا انجام سننا ہی باقی رہ گیا ہے۔

واحد حسین نے پاس بیٹھی ہوئی چاند کو غور سے دیکھا۔ پائپ اٹھا کر سلگایا اور پیر ہلا ہلا کر کش لینے لگے۔

"بس اسی دن سے اس گھر میں نیستی شروع ہو گئی۔ میت کے اٹھتے ہی پاروتی اس گھر کا تنکا تنکا اٹھوا کر لے گئی۔ ابا حضرت نے ڈیوڑھی سے جن عورتوں کو نکالا انھوں نے الگ ہائے واویلا مچا کر بہت کچھ ہتھیا لیا —— وہ تو کہو "دیوانِ غزل" وقف ہے اس لئے دادی اماں ہم سب کو اس میں لئے بیٹھی رہیں۔ لیکن ابا جان نے ہوش سنبھالتے ہی ساری جائیداد کا نئے سرے سے انتظام کیا۔

"جب ہی تو ہمارے ابا کو شاعری واعری سے اتنی نفرت تھی۔" گوہر پھوپو ہاتھ میں تھوڑی تھامے کسی گہری سوچ میں غرق تھیں۔

"ایسی ویسی نفرت ——؟" واحد حسین نے ٹھنڈے سگار کو جھنجھلا کے ٹک دیا —— کسی شاعر کا دیوان گھر میں دیکھ لیتے تو اٹھا کر پھینک دیتے۔ خدا بخشے چھنو نواب کو جوانی میں شاعری کا بڑا شوق تھا۔ گھر میں تو بیاض رکھنے کی ہمت نہیں تھی کہ کہیں چچا حضرت کے ہاتھ نہ پڑ جائے۔ اس لئے شعر لکھ کر

ادھر ادھر چھپا دیا کرتے تھے۔ ایک بار اتفاق سے چچا حضرت نے ان کا ایک شعر کہیں لکھا دیکھ لیا جس میں انھوں نے معشوق کی آنکھوں کو شراب کے کٹوروں سے تشبیہ دی تھی —— بس جناب چچا حضرت تسبیح پٹک کر کھڑے ہو گئے۔

"اول تو سرے سے یہ بات ہی غلط ہے کہ اس ٹانگ برابر چھوکرے کا کوئی معشوق بھی ہے۔ اور پھر حضرت کسی انسان کی آنکھیں کٹورے کے برابر ہو سکتی ہیں ——؟ یہ سب جھوٹ ہے، افترا ہے۔ خدا کا قہر نازل ہوگا اس گھر پر جہاں اتنا جھوٹ بولا جائے۔"

بس اس دن کے بعد سے چھنو نواب کے اشعار کی کوئی پڑیا کسی کو ملتی تو جلدی سے امام بی کے چھپر میں اڑس دی جاتی تھی۔ اور اس طرح کئی بار امام بی چولہا سلگانے کے لئے یا کوئی آیا بچے کا دودھ گرم کرنے کے لئے ان کے یہی اشعار کام میں لے آتی۔ یا پھر کوئی باذوق چھوا اپنی محبوبہ کو سنانے کے لئے ان کی غزلیں لے جاتا تھا۔"

واحد حسین کے آخری جملے پر سب ہنس پڑے۔

آئے ہے بے بسیِ عشق پہ رونا غالب ——
وائلن بجا بجا کر چاند گا رہی تھی۔

چاند اب سولہ برس کی ہو چکی تھی اور اس عرصے میں اس پر کئی ناگہانی حادثے گزر چکے تھے۔ زندگی سے بے حد پیار کرنے کرنے والی بشیر بیگم کو ایک دن ہنستے ہنستے ایسا پھندہ لگا کہ وہ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے مر چکی تھیں۔ چاند اپنے ڈیڈی کے سینے سے لگ کر روتی رہی — لیکن ایک دن معلوم ہوا کہ اس کے ڈیڈی بھی ایک تعلیم یافتہ کمیونسٹ ورکر خاتون کو بیوی بنا کر لا رہے ہیں۔ بس اس دن سے وہ "ایوانِ غزل" چلی آئی تو پھر اپنے گھر نہیں گئی۔ اس کے اخراجات کے لئے حیدر علی خاں سو روپے مہینہ ہر بار خود آ کر دے جاتے تھے۔

وائلن، [illegible] اور غالب کا غلط شعر۔ دونوں چاند کے کمرے سے نکل کر آنگن میں پھیل رہے تھے۔ یہ تو خیر صبح کا وقت تھا یعنی اسے ریاض کرنا ضروری تھا۔ مگر ویسے بھی آج اسے سچ مچ عشق کی بے بسی پر رونا آ رہا تھا۔ اور وہ ہندوستانی فلموں کی ہیروئن کے انداز میں ہمیشہ گا گا کر روتی تھی۔ موقعہ کے لحاظ سے اسی طرح کا میک اپ کرتی اور یوں ہی اپنے رومان کا سوگ منایا کرتی تھی۔

اس طرح چاند کے لئے ایک سوگوار صبح کا آنا، اکثر واحد حسین کے سکون کے جانے کی تمہید ہوا کرتا تھا۔ لیکن وہ چاند کو دکھتے ہوئے دانت کی طرح برداشت کرتے تھے۔ حالانکہ انھیں خودسر، فیشن پرست، اور آزاد خیال چاند کی روش بالکل پسند نہ تھی۔

اس وقت حیدرآباد کے اونچے طبقے میں دو طرح کی خواتین پائی جاتی تھیں۔ ایک واحد حسین کا گھرانہ، جہاں ابھی تک عورتیں کار کو پردا لگا کر بیٹھتی تھیں۔ اور بی بی کی طرح انھیں اپنے شوہر کے عہدے کا انگریزی تلفظ کبھی صحیح طور پر یاد نہیں ہوتا تھا۔ یہ عورتیں شرافت اور پاکیزگی کے ہر شاستری اصول پر پوری اترتی تھیں۔ وہ یشودھا کی طرح اپنے سدھارت کو نجات کے راستے پر گامزن کر سکتی تھیں۔ کسی نئی سوکن کے آنے پر اپنے گھر کا بن باس قبول کر لیتی تھیں اور سیتا کی طرح زمین انھیں چھپانے کے لئے ہمیشہ اپنی آغوش کھول دیتی تھی۔ دولت اور شان و شوکت کا مفہوم ان کے لئے یہ تھا کہ زیادہ نوکر۔ زیادہ چھوکریاں —— شان اور وقار قائم رکھنے کے لئے زیادہ قربانیاں میاں کی نازک مزاجیاں اور انھیں سنبھالنے کی ذمہ داری —— ان کے صلے میں وہ کالی پوت کا گچھا آتا جو سہاگ کی نشانی سمجھا جاتا ہے —— اور کنجیوں کا وہ گچھا جس میں ان کے سکھ کی چابی کوئی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ان چابیوں سے وہ خاندان، دولت، نسل اور وقار کے تمام بند دروازوں کو کھول دیتی تھیں۔

دوسری عورت وہ تھی جو حیدر علی خاں کے یہاں پیدا ہو رہی تھی — وہ پنچ گنی اور دہلی اور دہرہ دون جا کر پڑھتی تھیں۔ انگریز افسروں کے کلب میں ناچتی تھیں۔ بغیر آستینوں کا بلاؤز اور کٹے ہوئے بالوں کے ساتھ نئے نئے میک اپ کے انداز —— وہ پپا اور ممی تک کو ڈیر اور ڈارلنگ کہتی تھیں —— وہاں شادی اور بیاہ اپنی پسند سے ہوتے تھے اور طلاقیں دوسروں کی

زبردستی سے دی جاتی تھیں۔ ان گھروں کی ہیئت بدلنے پر کچھ تو ان نوجوانوں کا ہاتھ تھا جو یورپ سے فرنگنیں اور ایرانی دلہنیں بیاہ کر لاتے تھے۔ اور کچھ اس مغربی تعلیم کا اثر تھا جس نے شمالی ہند کے اونچے طبقے کو مغربی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ یہ لوگ انگریزوں کی طرح منہ بنا بنا کر بات کرنا انگریزی کپڑے پہننا اور انگریزی طور طریقوں پر جینا مہذب ہونے کی نشانی سمجھتے تھے۔ ان گھروں کا رہن سہن بھی بدل گیا تھا۔ سرخ مددے کے دسترخوانوں پر سے بریانی کی قابیں اور بگھارے بیگن کے ڈونگے اٹھا کر وہاں لوائے اور بلکہ نئے صاف شفاف میزوں کے اوپر اجلے اجلے گلاسوں میں نیپکن سجا دیے تھے اور نازک نازک قہقہوں کے شور میں لپ اسٹک لگے ہونٹ بڑی ادا کے ساتھ سوپ سپ کرنے لگے تھے۔

اسکرٹس اور سلیکس پہن کر رائڈنگ کی جاتی۔ کلب میں پارٹیاں ہوتیں اور پھر اسکینڈلز ـــــ کورٹ شپ اور ہنی مون کے لیے کبھی ویانا ـــــ کبھی کشمیر ـــــ کبھی پیرس ـــــ جہاں سے علاحدہ علاحدہ جہازوں میں دونوں طلاق کے کاغذ سنبھالے اترتے۔ پھر نئے سرے سے زندگی کا تعاقب شروع ہو جاتا۔

یہ سب وہی بولتے تھے جو سات سمندر پار بولا جاتا تھا۔ اسی طرح سانس لیتے ـــــ مگر ان کے آس پاس کا ماحول بڑا دقیانوسی تھا۔

"کیا بتانا حضرت، وہ نواب واحد حسین کی نواسی ایک ہندو چھوکرے سے عشق بازی کر رہی کہتے۔"

"جی ہو، میں بھی سنا ہوں۔ چھوکروں کے کالج کو ہونٹاں کو سرخی لگا کر جاتی کہتے۔"

"کیا بولنا تقصیر۔ اب شرافت تو ختم ہو گئی سمجھو"

واحد حسین کو ایسی باتیں سن کر سچ مچ موت سامنے نظر آتی تھی۔

لیکن چاند جوان ہوئی تو یہ دور گزر چکا تھا۔ شمالی ہند میں جو قوم پرستی کی شدید لہر اٹھی تھی اس کی زد میں آکر لوگوں نے کھادی پہن لی اور خطاب واپس کر دیے تھے اپنی اپنی دفن شدہ روایتوں کو کھود کھود کر نکالنے لگے ـــ یہ ہنگامہ چاند کے وطن سے دور تھا۔ پھر بھی دکن میں جو ہوائیں شمالی ہند سے آئیں وہ ملک کی وفاداری کا ایک نیا نعرہ بھی ساتھ لائیں۔ یہ نعرہ اپنے کلچر اور اپنے آرٹ کے تحفظ کا تھا۔ عام لوگوں کو اللہ اکبر اور رام نام کے نعروں میں سر پھٹول کے لیے چھوڑ کر اونچے طبقے نے اس نعرے کو بڑی خوبصورتی سے اپنایا تھا۔ یعنی انتہائی لبرلیت کے ساتھ بے حد ہندوستانی بننے کی کوشش۔ اب مذہب کے ثقافتی پہلوؤں پر زور دیا جانے لگا۔ اس لیے ہولی کے دن ایک دوسرے کے رومال پر بڑی نفاست کے ساتھ رنگ کے چھینٹے ڈالے جانے لگے۔ دیوالی کی رات بنگلوں پر روشنی ہونے لگی۔ عید کے دن بڑے اہتمام کے ساتھ ہندو دوستوں کو شیر خورمہ کھلایا جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر کلب میں ایک فنکشن ضرور ہوتا ـــ "عید ملاپ تقریب"۔ اس میں لڑکیاں بھارت ناٹیم اور کتھا کلی رقص کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ وہ چچا اور ماموں جو ڈیوڑھیوں کے اندھیرے کمروں میں ٹوٹے تنبوروں کے ساتھ اپنی سنگیت میں کھوئے ہوئے پڑے تھے۔ اب بڑے اہتمام سے جھاڑ پونچھ کر باہر نکالے گئے ـــ اجنتا اسٹائل کے جوڑے بنا سا فرک کے بلاؤز ـــ اور ہینڈلوم ساڑیاں ـــ یہ سب اپنے ملک سے محبت کے شدید مظاہرے تھے۔

شمالی ہند میں اگر غالب اور میر پر ریسرچ ہو رہی تھی تو دکن کے متمولوں نے بھی گولکنڈہ کے کھنڈر کھنگال ڈالے تھے۔ قلی قطب شاہ، غواصی، وجہی، ولی اور سراج کی کرم خوردہ شاعری کو دھو دھلا کر ادبی میوزیم سجا رہے تھے۔

اسی دوران جب ترقی پسندوں کی پہلی کانفرنس حیدرآباد میں ہوئی تو حیدر علیخاں چاند کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ صرف یہ دکھانے کہ ان کی بیٹی کیسی ترقی یافتہ لڑکی ہے۔ اس وقت تک حیدرآباد میں مسلمان عورتیں برسرِ عام جلسوں میں نہیں آتی تھیں۔ اور وہ بھی چاند جیسی لڑکی۔ بس سارے ترقی پسندوں کے نعرے تو ایک طرف رکھے تھے اور شاید ہی کوئی شاعر ایسا بچا تھا جس نے چاند پر نظم نہ لکھ ڈالی ہو۔ اس کانفرنس میں آنے والے ہر مہمان کو حیدرآباد دل و جان سے پسند آگیا تھا۔

واحد حسین کے ہاں چاند ان قدروں کی واحد نمائندہ تھی۔ کہتے ہیں کرشن کا بدن نیلا پڑ گیا تھا۔ مگر چاند نے اپنے ہاتھوں سے زہر کھایا تھا۔ اور اس زہر نے اس کے رنگ کو نہ جلایا، بلکہ اس کی رگ رگ میں بجلیاں بھر دی تھیں۔

وہ ابھی فراک پہنے کانوینٹ جا رہی تھی کہ نارائنا نے اس کے ساتھ پتنگوں کے ایسے پیچ بٹھائے کہ کسی طرح نہ سلجھے۔ نارائنا اور واحد حسین کے گھر والوں نے لمبے لمبے بانسوں میں کانٹے الجھا کر اس ڈور کو سلجھانا چاہا۔ مگر چاند کسی طرح یہ کھیل ختم کرنے پر راضی نہ ہوئی۔ ماں کے مرنے کے بعد اس کی نازک مزاجی اور ضد اور بڑھ گئی تھی۔ اب وہ راشد اور رضیہ کی آنکھوں کا تارا تھی اس لئے واحد حسین اس پر کسی قسم کی سختی نہیں کر سکتے تھے۔ حیدر علی خاں نے اگرچہ دوسری شادی کر لی تھی اور وہ اپنے آپ کو حق اور صداقت کے پہرے داروں میں شامل کرتے تھے مگر نارائنا اور چاند کے میل پر وہ بھی بپھر چکے تھے۔ تب چاند نے محسوس کیا کہ ہر وقت نرمی سے بات کرنے والے ڈیڈی بھی گرج سکتے ہیں۔ اور ہر بات پر پشت پناہی کرنے والے راشد ماموں بھی اس

سے روٹھ سکتے ہیں۔

پھر جس دن واحد حسین نے نارائنا کے باپ کو حکم دیا تھا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر اس کی شادی کر دے تو نارائنا نے چاند کے ساتھ مل کر طے کیا کہ آج رات وہ دونوں زہر کھا کر مر جائیں گے۔

چودہ برس کی ہائی اسکول میں پڑھنے والی چاند اس دن خوشی کے مارے ناچ رہی تھی۔ آج سے اس کا نام بھی محبت کرنے والے شہیدوں میں لکھا جائے گا۔

اس نے نارائنا کی محبت کا پہلا گھونٹ پیا تھا اور شیکسپیر، نیٹشے، میر اور میرا بائی ابھی اس تک نہیں پہنچے تھے۔ مگر زیب النساء، شیریں، لیلیٰ اور انارکلی کے قصے وہ کتابوں میں پڑھ چکی تھی۔ اور قلی قطب شاہ کا یہ شعر اس نے اکثر پارٹیوں میں گایا تھا

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج اِک پل جیا جائے نا

زہر کھاتے وقت "ایوانِ غزل" کے ان مکینوں نے اسے بہت روکا جن کے دھندلے دھندلے فوٹو بوسیدہ فریموں میں لگے ہوئے تھے۔

زہر گھولتے میں چاندی کے گلاس نے اسے سمجھایا کہ وہ مناسب جنگ کی نواسی ہے۔ صائب جنگ کی پوتی ہے۔ زہر اس کے لئے نہیں بنا۔ اس زہر کی تیزی تو ٹوٹے پھوٹے گھروں میں جاتی ہے کیوں کہ زہر پینا ان کا مقدر بن گیا ہے۔ لیکن چاند کے خون میں ایوانِ غزل کی سات پشت والی شاعری اتنی سرایت کر چکی تھی کہ فرہاد کو تیشے بغیر مارنے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے اس نے "ایوانِ غزل" کی روایت کو توڑ کر زہر پی لیا ——— ناسمجھ بچی ——— جو نہیں جانتی تھی عشق کیا ہوتا ہے اور اس کے اصول کیا ہیں ——— اور یہ کہ زہر تو زندگی بھر چکھنا پڑتا

ہے۔

لیکن "ایوانِ غزل" والے تو ایسے نادان نہ تھے۔ اگر وہ یوں چپکے سے مر جاتی تو اس کے ہمعصر نوجوان شاعر کیسے شاعری کرتے! اس لئے کئی ڈاکٹروں کی مدد نے اسے پھر زندگی کے ساحل پر لا کھڑا کیا۔ کئی دن بعد اسے جب ہوش آیا ہے تو نارائنا کے ہاں میراثنیں گا رہی تھیں۔

میرا ہریالا بنا آ بیٹھا مسند کے بیچ
بنے میں کیا تیری بلائیں لیوں کیا تیرے سہرے کی
سہرا تجھے ساج رہا اور ہم رہے ارماں کے بیچ

دو چار ہفتے بعد وہ بستر سے اٹھی تو نارائنا کی محبت کو زہر کی تیزی نے جلا پھینکا تھا۔ اور مردوں سے نفرت کا زہر اس کی رگ رگ میں پھیل چکا تھا۔ اب اس نے اپنے نانا حضرت کی تمام روایتوں کا کہا مانا اور دل لگا کر وائلن بجانے میں محو ہو گئی۔

میڈیکل کالج پہنچی تو اس کی آواز کی دھوم مچ گئی۔ وہ ہر طرف پکاری جانے لگی۔ ہر ڈرامے کی ہیروئن وہ ہوتی اور سارے کلچرل پروگرام اسی کو سونپ دیے جاتے تھے۔

لڑکوں کے غول اس کے پیچھے پیچھے گھومتے۔ اس کی ایک نگاہ، ہلکی سی مسکراہٹ کسی پروانے کا چین حرام کر سکتی تھی۔ وہ بڑی ادا کے ساتھ اپنے سنہرے پرم کئے ہوئے بالوں کو جھٹکتی، ساری کا لمبا پلو لہراتی، اٹھکھیلیاں کرتی پھرتی تھی۔ وہ ان سب مردوں سے نارائنا کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس لئے سب کو تڑپاتی، ہاتھ پکڑ کر دھکا دے دیتی۔ شاہد کو بھی لفٹ دیتی اداکار سوامی کو بھی۔ شاعر سحر کو اور وائلنسٹ جوزف کو۔ مگر ڈاکٹر رحمان کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ رحمان میڈیکل کالج کا لکچرر

تھا اور شہر کا مشہور "گیانا کالوجسٹ"۔ اس نے چاند کے مرض کو بھی جھٹ ٹٹول لیا اور علاج شروع کر دیا۔ رحمن کی بیوی بھی ڈاکٹر تھی اور کسی اور جگہ سروس کرتی تھی۔ مگر اس نے غالباً مردوں کی نفسیات پر بالکل ریسرچ نہیں کی تھی۔ اس لئے اپنے رنگین مزاج شوقین شوہر کو نرسوں اور اسٹوڈینٹس کے درمیان چھوڑ کر مزے میں رہتی تھی۔ چنانچہ بہت جلد کالج میں یہ خبر پھیل گئی کہ چاند ڈاکٹر رحمن سے شادی کر رہی ہے۔ وہ دونوں ہر جگہ دیکھے جاتے۔ ہاسپٹل کے پرائیویٹ روم میں پیچیدہ امراض پر لکچر دینے کے لئے گھنٹوں ڈاکٹر رحمان چاند کے ساتھ بیٹھا رہتا۔ چاند اس کی کار میں پکنک کو جاتی، پکچر دیکھتی اور نئے نئے تحفوں کے ساتھ گھر آتی تھی۔ حیدر علی خاں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ انھوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جس وقت ڈاکٹر رحمان کا پیغام آئے گا تو اسے مزہ چکھائیں گے اس رومان کا۔ لیکن ہوا یہ کہ حیدر علی خاں کے والد اچانک بیٹھے بیٹھے مر گئے۔ اور ان کے مرتے ہی یہ بھانڈا بھی پھوٹ گیا کہ چاند کے دادا کڑک مرغی کی طرح اپنے نیچے سونے کی اینٹیں نہیں بلکہ قرض کے پتھر دبائے بیٹھے تھے۔ چنانچہ ایک دن اچانک چاند کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر رحمان نے اپنا ٹرانسفر اپنی بیوی کے پاس کروا لیا ہے۔ اور وہ چاند سے ملے بغیر ہی چلا گیا۔ اس ساری لتڑ دھوں دھوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدر علی خاں اس سے سخت ناراض ہو گئے اور اب وہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو خود آکر بیٹی کو دلار نہیں کرتے تھے بلکہ منشی کے ہاتھ اس کے لئے سو روپے بھیج دیا کرتے۔

تو آج وہی اداس صبح تھی جب اٹھتے ہی چاند نے وائلن پر گنگنانا شروع کر دیا تھا۔

آئے ہے بے بسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

واحد حسین چاند کے اس غلط سلط شر کو برداشت کر لیتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ چاند اس کی مری لڑکی کی اکلوتی نشانی تھی۔ بلکہ محض اس لیے کہ وہ راشد اور رضیہ کی بڑی چہیتی بھانجی تھی۔

اور جیسے راشد پسند کرتا اس کے خلاف گوہر پھوپو اور واحد حسین کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن ہر وقت چاند کی نالائقیاں برداشت کرتے کرتے واحد حسین کا مزاج بحر سے خارج ہوتا جا رہا تھا۔ زمانے کی ساری ترقی اور تبدیلیاں ابھی تک اس گھر کے اوپر ہی سے گزر رہی تھیں۔ واحد حسین نے اپنی دونوں لڑکیوں کو صرف ہائی اسکول تک پڑھایا تھا۔ دس گیارہ سال تک وہ لڑکیاں اپنی مخصوص تہذیب کے مطابق کلی دار کرتا اور تنگ پاجامے پر سنہری کارچوبی واسکٹ اور کارچوبی کام والی ٹوپی اوڑھا کرتی تھیں۔ یہ حیدرآباد کے اونچے طبقے میں عام طور پر لڑکیوں کا لباس تھا۔ ذرا سی اور بڑی ہوئیں تو بی بی نے سخت پردے میں بٹھا دیا۔ اور اس کلی دار کرتے پر کھڑا دوپٹہ بھی اوڑھنے لگیں۔ اب ٹوپی اتار دی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی واحد حسین ان کے بڑھتے ہوئے قد دیکھ کر گھبرانے لگے تھے۔ اس لئے جو پیغام آیا تو آنکھیں بند کر کے چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا۔ اب یہ حقیقت واحد حسین کے لئے بڑی کڑوی تھی کہ ان کی نواسی لڑکوں کے ساتھ ڈاکٹری پڑھ رہی تھی۔ بے پردہ گھومتی، اسٹیج پر میک اپ کر کے ڈراموں میں کام کرتی تھی اور گانے گاتی تھی گھبرا کر انھوں نے اس معاملے میں بی بی اور گوہر بیگم سے سہارا لینا چاہا۔ مگر بی بی تو خاندان کے ہر اہم معاملے میں چپ رہنے پر کاربند تھیں اور گوہر بیگم بھی اپنی بارہ گز کی زبان کو منہ کی ڈبیہ میں بند رکھنے پر مجبور تھیں۔ انھوں نے چاند کے میک اپ پارٹیوں نت نئے پہناوے

ہر چیز پر ٹوکنا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ چاند کے سب سے بڑے حمایتی راشد اور رضیہ گھر میں موجود تھے۔ بعض وقت گوہر پھوپو سوچتیں۔ وہ بھی اس گھر کی کنواری تھیں جنھوں نے اپنی جوانی کو زندہ دفن کر دیا۔ مگر گھر میں کسی کو خبر نہ ہوئی۔ کسی نے نہ سوچا کہ اس گھر میں ایک کنواری بیٹھے بیٹھے خاک ہوئی جا رہی ہے۔ جب بھی کوئی پیغام آتا دونوں بھائی سر جوڑے کھسر پھسر کرنے لگتے تھے۔ اور پھر گوہر بیگم کے سامنے آہستہ آہستہ سناتے

"ایسے نکمے کو دینے سے اچھا ہے کہ گوہر بیگم کنواری بیٹھی رہیں ——"

"کسی ایسے ویسے خاندان میں بیاہ دیں گے تو خدا بخشے چچا حضرت کو قبر میں سکون نہیں ملے گا۔"

کبھی کبھی واحد حسین بڑے موڈ میں ہوتے تو کہتے۔

"بس اب اور انتظار نہ کروں گا —— اس سال گوہر بیگم کا فرض ادا کرنا ہے۔"

تیئیس برس کی گوہر بیگم یہ سنتیں تو چپکے چپکے دعائیں مانگتیں —— یا اللہ میرے نصیب کھول دے۔ میری قسمت کا جوڑ بھیج دے۔

مگر شاید اللہ میاں کے ہاں ان کی قسمت کا جوڑ نہیں بنا تھا۔

اس لئے سال پر سال نکلتے گئے۔ اب وہ چالیس سال کی ہو چکی تھیں۔ چالیس سال کی لنگڑی عورت سے بیاہ کون کرتا!۔

گوہر پھوپو کی محبت اور خدمت گزاری سے شرمندہ ہو کر کبھی کبھی واحد حسین کہتے۔

"گوہر بیگم تم اپنے روپے پیسے کا ہم سے حساب لے لیا کرو بھئی"۔

"میں کیا کروں گی بھائی پاشا؟ آپ رکھیے اپنے پاس"۔

وہ لاپرواہی سے کہتیں۔

"لیکن کبھی کبھار اپنے زیور کپڑے تو پہنا کرو بھئی۔ رضیہ کے پاس کب

تک دھرے رہیں گے۔"

کیوں پہنوں زیور کپڑا ــــــ وہ جھنجھلا کر پوچھتیں تو واحد حسین لاجواب ہو جاتے تھے۔ جب تک سولہ سترہ برس کی رہیں تو گوہر پھوپو کو کسی نے اچھے کپڑے اور زیور نہیں پہننے دیا۔ کیوں کہ اس زمانے میں لڑکیوں کو سادگی ہی سے رکھا جاتا تھا۔ ماں باپ مر گئے تو انھوں نے خود لتا کپڑا سنبھال کر رکھ دیا کہ شادی کے بعد نکالیں گی۔ اور مانگ لوٹ جانے کے بعد وہ اس شرم سے نہیں پہنتی تھیں کہ اب لوگ مذاق اڑائیں گے۔ بس وہ سفید چکن کا کھڑا دوپٹہ، سفید کارگے کا کرتہ اور سفید ہی برک کا پاجامہ پہنتی تھیں۔ ان کے ہاتھ ہمیشہ ننگے رہتے۔ گلا ہمیشہ خالی رہا۔ یہ سونا پن اس کے خوبصورت چہرے پر بھی پھیلتا ہی گیا ــــ وہ جانے کب بچپن سے جوانی میں داخل ہوئیں اور کب بڑھاپے کی سرحد پار کر گئیں۔ گھر میں بہت کم لوگوں نے محسوس کیا کہ گوہر بیگم کے بال سفید ہونا شروع ہو چکے ہیں۔ ان کے چہرے پر جھریاں پڑ رہی تھیں۔ وہ کام کرتے کرتے ہانپ جاتی تھیں۔ اس کے باوجود انھوں نے کبھی کسی مرد کی طرف ہنس کے نہیں دیکھا تھا ــــ کبھی سیر سپاٹوں کو گئیں نہ اور کوئی شوق جان کو لگایا ــــ جیسے وہ صرف اسی مرد کے انتظار میں تھیں جو زبردستی انھیں اٹھا کر میانے میں بٹھائے گا۔

گھر کے اس رعایتی ماحول میں چاند کی بے راہروی بڑی چونکا دینے والی تھی۔ لیکن واحد حسین کی چیخ و پکار پر راشد سمجھا دیتا تھا۔

جب چاند ڈاکٹر بن جائے گی تو معلوم ہو گا کہ خاندان کا نام کتنا روشن ہوا ہے۔ کوئی ہے کسی جاگیردار خاندان میں لیڈی ڈاکٹر ــــ؟"

"اور یہ ناچ گانا! ذرا خاندان میں نکلو تو پتہ چلے کہ کیسی تھو تھو ہے۔" گوہر پھوپو نے تنک کر کہا۔

"ایک بات ہو تو کی جائے۔" واحد حسین فوراً گوہر بیگم کی طرف داری کرنے لگے۔

"ہر ایک یہی کہتا ہے کہ صاحب آپ نے اپنی نواسی کو اتنی آزادی کیوں دے دی ہے؟"

"کون کہتا ہے ــــ؟" راشد بھڑک اٹھا۔

"میرے سامنے کہے میں سب کا حال جانتا ہوں۔ دیکھ تو لیا بشیر آپا اور بتول کا حال۔ اگر پڑھی لکھی ہوتیں تو یوں جل جل کر نہ رہتیں۔"

راشد ترقی پسند نہ تھا مگر مصلحت پسند ضرور تھا۔ اس نے انجینیری کے علاوہ بزنس بھی شروع کر رکھا تھا۔ مٹی چونے اور پتھر کا بیوپار۔ وہ بزنس کے اصول پڑھ رہا تھا۔ اور جانتا تھا کہ چاند جیسی تہذیب یافتہ، خوبصورت اور فیشن ایبل لڑکیوں کا بھاؤ کتنا بڑھا ہوا ہے۔ اتنا کہ لوگ چاہیں تو ان کے سہارے لاکھوں کا کنٹریکٹ لے لیں۔

"یہ سب ہماری قسمت کا پھیر ہے۔ تم نے اپنی بیٹیوں کو سب کچھ دیکھ کر دیا مگر ان کی قسمت سے بھرے گھر اجڑ گئے۔"

واحد حسین کی آواز دکھ سے روندھ جاتی تھی۔

چولھے کے پاس جہاں بسم اللہ نے دہی کی ہانڈی ٹانگنے کے لیے چھینکا لٹکا دیا تھا وہاں دو کوّے بیٹھے ایک سُر اور ایک تال میں کائیں کائیں کر رہے تھے۔ سڑک پر لال مٹی اور اچار بیچنے والوں کی آواز آ رہی تھی۔ اور رضیہ کی ساری کا پلو پکڑے شاہین اس کے پیچھے پیچھے ضد کرتا پھر رہا تھا کہ وہ بغیر استری والا یونیفارم پہن کر اسکول نہیں جائے گا۔ شاہین کے پیچھے پیچھے اس کی موٹی کالی آیا مسز انتھونی اس کا یونیفارم ہاتھ میں لئے گھوم رہی تھی۔

چولھے کے پاس بسم اللہ بی دھاڑ رہی تھی۔

"کیا آج سلارو قیمہ نہیں لائے گا ــــ؟ اب کس کا قیمہ کوٹ کر میں پکا دوں؟" رضائی کے اندر منہ لپیٹنے کے باوجود غزل نے اندازہ لگا لیا کہ دن نکل آیا ہے۔ "ایوانِ غزل" میں صبح اسی دھوم دھام سے ہوا کرتی ہے۔ پھر رضائی ہٹا کر آنکھ کی ذرا سی دراڑ کھول کر اس نے دیکھا کہ نانا حضرت آنگن میں سیلوٹے کے جھاڑ تلے اسٹو رکھے گاجر کا مربہ بنا رہے تھے۔ بلکہ بنوا رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں چمچہ۔ اور رت پر سب ہی نامعقول چیزوں کو گالیاں۔ ظاہر ہے کہ جس دن واحد حسین کو اچار مربے بنانے کا موڈ سوار ہوتا تھا تو سارا گھر تہ و بالا ہو جاتا۔ حد یہ تھی کہ ہر وقت مسہری پر لیٹی رہنے والی بی بی بھی انتظامات میں لگی ہوئی تھیں۔ رضیہ بچوں کو اسکول کے لئے تیار کروانے کی بجائے آنگن میں دوڑی دوڑی پھر رہی تھی۔ گوہر پھولو اسٹور کی چابی ہاتھ میں تھامے کھڑی تھیں کہ جس چیز کی ضرورت ہو فوراً بھیج دی جائے۔ اور واحد حسین کی چیخ و پکار میں چاند کی باریک مرکیوں بھری آواز دبی جا رہی تھی بسم اللہ بی کے آئے جو اس خطا ہوئے جا رہے تھے کیونکہ واحد حسین کو اس کا کفگیر ہلانے کا انداز قطعی پسند نہیں تھا۔ ایسے میں تن تناہٹ کے مارے انھوں نے گرم کفگیر پکڑنا چاہا تو ہاتھ جل گیا۔ بلکہ یوں کہئے کہ ہاتھ کیا جلا، انگلیوں سے لے کر تلوے تک کسی نے گرم سلاخ چھوا دی۔ وہ ابھی طے نہیں کر پائے تھے کہ الزام بسم اللہ بی کے سر تھوپیں یا فضول قسم کے بھگونے کو کوسیں، کہ چاند کی آواز تیر کی طرح کانوں سے ٹکرائی

"یہ ـــــ یہ کون غالب کی اصلاح کر رہا ہے۔ جہالت کی حد ہے یعنی غالب کا شعر تک غلط پڑھا جا رہا ہے۔"

"واہ وا غلط کیوں ہوتا ــــ" چاند نے اچانک گانا روک کر جواب دیا اور دوبارہ شعر ڈھونڈنے لگی

"اچھا اور پھر ضد بھی کرتی ہے۔ اری جاہل وہ بے کسی عشق ہے بے لبسی عشق نہیں ہے۔"

"اونہہ ہوا کرے" چاند نے سوچا بے لبسی اور بے کسی میں ایسا کون سا بڑا فرق ہے۔ جب کہ رونا بہر حال ہے۔"

"اسی پر تو میری جان جلتی ہے۔" واحد حسین نے جلدی جلدی تسبیح کے دانے گھماتے ہیں کہا۔

یہ کمبخت عورتوں کی قوم ہی جاہل ہوتی ہے۔ یعنی ڈاکٹری پڑھ رہی ہیں محترمہ، اور قابلیت کا یہ عالم ہے کہ غالب کا ایک مصرعہ صحیح نہیں پڑھ سکتیں۔ انگلیوں میں لگی ہوئی آگ اب سارے بدن میں پھیل گئی تھی۔ وہ غصہ اتارنے کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہے تھے کہ دالان میں" دبکی ہوئی غزل پر نظر پڑ گئی۔

"اچھا اور یہ شہزادی ابھی تک سو رہی ہیں۔"

غزل نے سنا تو رضائی کے اندر پریشانی کے مارے برا حال ہو گیا۔

"اونہہ غزل کو برا مت کہنا ــــ" بی بی نے دھیرے سے کہا اور پھر سامنے بیٹھی ہوئی بیوی کی اداس صورت دیکھ کر وہ بی بی کی بات مان گئے۔ مجبوراً پھر مربے میں جٹ جانا پڑا۔

چلو جان بچی ــــ غزل رضائی پھینک کر اٹھی اور جلدی سے باتھ روم میں گھس گئی۔ باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھونے میں کئی منٹ لگائے تھے۔ کسی کو پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ دانت مانجھے یا نہیں! اور نہ صابن کی مرچیں آنکھوں میں لگا نا پڑتی تھیں۔ وہ بڑی دیر تک نل کی دھار کو ہاتھوں میں لے کر چھپک چھپا کرتی رہی۔ رضائی میں سے نکلے ہوئے گرم بدن پر پانی کے چھینٹے برف کے ریزے بن کر لگ رہے تھے۔ جب باریک باریک

پھوار نے اس کے بال بال میں موتی پرو دیئے تو بھیگی چوہیا ہی باہر نکلی کپڑوں سے پانی ٹپکاتی، ناک سڑسڑاتی، باہر آنے کے بعد مفرور مجرموں کی طرح کوئی محفوظ ٹھکانا ڈھونڈنے لگی۔ اتنی دیر میں چغل خور فوزیہ نے اسے پکڑ لیا۔

"ممی ممی، غزل کو دیکھیے ——" وہ خوب خوب بن کر ہنسنے لگی محض اس لئے کہ اس وقت وہ خود سفید بھک فراک پہنے تھی۔ اس کے بال ہری ربن سے بندھے ہوئے تھے۔ اور سفید جوتوں کے سرخ پھندوں کو زور زور سے جھٹکتی وہ اترائی اترائی پھر رہی تھی۔ غزل کی ہیبت کذائی کی خبر سن کر شاہین نے بھی ضد کرنا چھوڑ دی اور ادھر متوجہ ہوا۔ وہ آیا کے ہاتھوں سے چھوٹ کر ادھر ادھر بھاگتا پھر رہا تھا۔ نیکر کے گیلس چابک کی طرح ہوا میں گھماتے گھماتے اس نے غزل کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور ہنسنے لگا۔ مگر صرف اپنی چھوٹی بہن فوزیہ کو خوش کرنے کے لئے۔ کیوں کہ ایک تو اس کے اپنے کپڑے بھی میلے تھے اور پھر بھیگے ہوئے کپڑوں میں کانپتی ہوئی غزل کو دیکھ کر اس کا بھی جی چاہ رہا تھا کہ نل کے نیچے بیٹھ کر خوب اودھم مچائے۔

"اجی بتول بیگم۔ ذرا دیکھو تو تمہاری صاحبزادی نے کیا گت بنائی ہے ——؟" رضیہ نے غزل کو کیچڑ بھرے پاؤں سے فرش گندا کرنے پر منہ بنایا۔

"میرے کمرے میں مت جانا۔ قالین گندا ہو جائے گا۔"

دلہن ممانی کی آواز سنتے ہی غزل نے ماں کے متوقع گھونسے کی امید میں آنکھیں بند کر کے سر پر دونوں ہاتھوں سے چھپر ڈال لیا۔ چنانچہ جس وقت وہ ماں کے تھپڑ کھا کر چلا رہی تھی اور زمین پر مچل رہی تھی تو بچاری چاند کو آنسو پونچھ کر دائیلن رکھ دینا پڑا۔ شاہین اور فوزیہ پاس

کھڑے اس کے پٹنے کا تماشا دیکھتے رہے۔ راشد نے بھی اخبار سے نظریں ہٹا کر ادھر دیکھا اور پھر اخبار میں کھو گیا۔

پھر واحد حسین دھاڑے۔

"ذرا میری چھڑی تو لانا ——"

اچانک سناٹا چھا گیا۔ غزل دفعتاً درت سے پنچم پر آئی۔ اور پھر چپ ہو گئی بالکل ڈرل کرنے کے انداز میں کھڑا ہونا پڑا۔ اور پھر اماں نے وہ موٹو کرتا بھی پہنوا لیا جو ابا کی قمیض کاٹ کر بنوایا گیا تھا۔

رضیہ ناک سکوڑے، تیوری پر بل ڈالے دالان میں آئی اور شاہین اور فوزیہ کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔ یہ ضدی چھوکری اس کے سلیقہ مند بچوں کو بھی بگاڑ دے گی۔

ناشتے کی میز پر حسب عادت فوزیہ خوب ٹھنکی۔

" انڈا نہیں کھاؤں گی۔ ایک پیالی سے زیادہ دودھ نہیں پیوں گی —— یہ پلیٹ گندی ہے۔ آیا نے بغیر صابن لگائے ہاتھ دھلا دیئے۔"

اور رضیہ چمکار چمکار کر اسے بہلاتی رہی۔ کبھی ہلکے سے راشد ڈانٹ دیتا تو واحد حسین فوراً ٹوک دیتے۔

"آپ ہماری گڑیا کو نہیں

فوزیہ چار سال کی تھی ۔ن دادا کی بے حد لاڈلی تھی۔

شاہین اب سات برس کا ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو کافی بڑا اور عقلمند سمجھ کر ضد نہیں کرتا تھا۔ شاہین ناشتے کے وقت حسب عادت دادا کے پاس بیٹھا تھا۔ سات برس کا بانکا سجیلا اہم شخصیت کا مرد۔ اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ فوزیہ اور غزل سے تین برس بڑا ہے۔ اسے انگریزی کی بہت سی نظمیں یاد ہیں۔ اپنی کلاس میں ہمیشہ فرسٹ آتا ہے۔ اور بے چاری فوزیہ کو ابھی تک اے۔ بی۔ سی۔ ڈی پوری طرح

یاد نہیں ہوتی تھی۔ جب وہ اپنی چھوٹی سی موٹر میں بیٹھ کر اسے ڈرائیو کرتا تھا تو غزل کی سمجھ میں خاک نہیں آتا تھا کہ موٹر چلنے کا راز کیا ہے۔ جو آج کل وہ فوزیہ کو بڑی تن دہی سے اپنی رنگین تصویروں والی کتاب کی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ ایسے وقت، اگر غزل آ جاتی تھی تو وہ دونوں بہن بھائی فوراً کتاب چھپا لیتے تھے۔ غزل کو رنگین تصویریں کھانے کا بڑا شوق تھا۔ وہ کہتی تھی بڑی میٹھی ہوتی ہیں۔

ایک دن تجربے کی خاطر ان تینوں نے شاہین کی پوری کتاب کھا ڈالی۔ اس وقت تو زیادہ لطف نہ آیا۔ مگر جب رضیہ نے سنا تو سب کا کیا دھرا اکیلے شاہین کو بھگتنا پڑا۔

شاہین کو قصے کہانیاں سنانے والے اپنے دادا حضرت بے حد پسند تھے۔ وہ ابھی سے طے کر چکا تھا کہ بڑا ہو کر داڑھی رکھے گا۔ تحصیلداری کرے گا اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر شاعری کرے گا۔ کھانا کھاتے وقت وہ ہو بہو دادا کی نقل کرتا تھا۔ ویسے ہی چار انگلیوں سے نوالہ بناتا۔ اچار، املی والے کھٹے سالنوں سے سخت پرہیز کرتا۔

سالن میں نمک بالکل کم ڈالا جاتا۔ ناشتے سے پہلے خمیرہ مروارید کھا کر اوولٹین پی جاتی۔ کتنے اہتمام اور نفاست کے ساتھ کہ سارا گھرانہ دیر میں ناشتہ ختم کر دیتا تھا۔ "گلاس بائیں ہاتھ سے اٹھانا چاہیے۔ جب تک ایک سالن ختم نہ ہو اور سالن نہیں لینا چاہیے۔" بیچ بیچ میں دادا حضرت کی دوا کے دور چلتے۔ کوئی دوا کھانے سے پہلے کی ہوتی اور کوئی کھانے کے درمیان اور کوئی آخر میں کھانا پڑتی۔ ان دواؤں کے اوقات یاد دلانا بھی شاہین کا کام تھا۔

میز پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو غزل نے صرف اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ کیوں کہ وہ کھانے میں مصروف تھی۔ پہلے تو اس نے انڈوں کی

پلیٹ گھسیٹی اور بڑی مشقت کے بعد دو انڈے نگل لئے۔ پھر کھچڑی کی ڈش میں سے کتنے چاول انڈیلے کہ پلیٹ کے ساتھ ساتھ پاس رکھی ہوئی اچار کی کٹوری اور آملیٹ کی پلیٹ بھی چاولوں سے بھر گئی۔
چاند اپنے سامنے آملیٹ کا ایک ٹکڑا ڈالے کانٹے سے کھیل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ بے حد اداس تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ غزل جس طرف نگاہ ڈالے وہ چیز جھٹ غزل تک پہنچا دے۔ مگر وہ ہر بار بڑی پھرتی سے چاند آپا کو اس زحمت سے بچا لیتی تھی۔

خوب بہت سا مسکہ، اچار اور انڈے کھچڑی میں گوندھنے کے بعد اس کا کھاتے کھاتے جی اوب گیا تھا۔ تو بہتی ہوئی ناک کو کلائی سے پونچھ کر وہ پراٹھوں کی طرف لپکی۔ مگر اچانک اماں کا سرد ہاتھ ہتھکڑی کی طرح اس کی کلائی سے لپٹ گیا۔ اور زناٹے کے ایسے تھپڑ منہ پر پڑے کہ منہ میں ٹھنسے ہوئے چاول دھکا کھا کر باہر نکل پڑے ـــــ وہ تیورا کر کرسی کے نیچے گر گئی۔ سب بتول کو برا کہنے لگے۔

"اوئی ماں، تم کیسے بے درد ہیں بتول بیگم۔ مجھ سے تو کبھی اپنے بچوں کو نہیں مارا جاتا۔" رضیہ نے ترس کھا کر کہا۔

"دونوں ماں بیٹیاں اول نمبر کی جاہل ہیں۔" واحد حسین نے اطمینان سے اوولٹین کی چسکی لی۔ فوزیہ اور شاہین غزل کو پٹتے دیکھ کر بن کر ہنسنے لگے۔

"دیکھا تم نے ـــــ ایسے ہوتے ہیں گندے بچے۔" راشد فوزیہ اور شاہین کو عبرت دلانے لگا۔

چاند اپنی سفید جارجٹ کی ساری پر سے چاول اور سالن کے دھبے بڑی نفاست سے صاف کرنے لگی۔ بی بی اس تماشے کی

خاموش تماشائی تھیں۔ اور بڑی خاموشی سے روٹی کے چھوٹے چھوٹے نوالے نگلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آج کل گھر کی فضا چاند کی وجہ سے گم سم تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ ڈاکٹر رحمان پھر بمبئی چلا گیا ہے۔ اور آج کل چاند چھپ چھپ کر روتی ہے۔ مگر اس جانب سے سب انجان بنے ہوئے تھے۔

بتول کسی کو جواب دینے کے بجائے غزل کو مارنے کے بعد اپنے آنسو پونچھتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

"اپنا گھر ہے یہاں تو کوئی بات نہیں۔ مگر بتول نے غزل کو بہت بدتمیز بنایا ہے۔" راشد نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

راشد جانتا تھا کہ رضیہ، بتول اور غزل سے اتنی ہی نفرت کرتی ہے جتنا وہ چاند کو چاہتی ہے۔ مگر بی بی اور ابا جان کی وجہ سے سہنا پڑتا ہے۔ خصوصاً راشد کو اپنی ماں کے چہرے پر برستی ہوئی مظلومی سے دلی ہمدردی تھی۔ تمام بیٹوں سے زیادہ وہ اپنی ماں کو چاہتا تھا۔ ہر وقت ان کی دلجوئی میں لگا رہتا جو وہ چاہتی تھیں۔ پھر بھی یوں لگتا جیسے ان سب نے مل کر بی بی کو قید میں ڈال دیا ہے۔ اور وہ دروازے پر پہرہ دیتے رہتے ہیں ــــــ بی بی کو دیکھ کر بعض وقت راشد سوچتا کہ عورت کس عمر تک زندہ رہتی ہے ــــــ؟ بی بی کے اندر بیٹھی ہوئی ضدی لڑکی کیا کبھی ہار نہیں مانے گی۔ وہ ابھی تک ماں اور دادی کے سچے روپ میں نظر نہ آتی تھیں۔ حالانکہ انھوں نے یہ سب فرائض بڑی تندہی سے ادا کئے تھے۔

"اگر بتول کو کچھ دینا ہو تو دیجئے نا۔ پاپ کٹے۔" بی بی نے آہستہ سے واحد حسین سے کہا۔

"میرے پاس کوئی قارون کا خزانہ ہے۔" وہ جھنجھلا گئے۔

ہر مہینے دو سو روپے کہاں سے لاؤں میں! آپ کے داماد کو تو اب چاٹ لگ گئی ہے۔ جس وقت دیکھو ہاتھ پھیلا ہے۔"

"تو بتول کیا کرے؟" بی بی کی آواز بھرا گئی۔

"وہ اسے مار پیٹ کر بھیجتا ہے۔ اگر روپیہ لے کر نہ جائے گی تو اور ظلم توڑے گا۔"

"تو میری بوٹیاں نوچ کر دیدو۔" واحد حسین چلانے لگے

رضیہ اور راشد اس بات پر بالکل انجان بنے رہے۔

ناشتے کی میز سے اٹھ کر واحد حسین سوچنے لگے کہ اس تکلیف دہ ماحول سے چھٹکارا پانے کے لئے بیاض کھولنا چاہیے اور وہ سگار سلگا کر الماری ٹٹولنے لگے۔

فوزیہ اور شاہین اسکول جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ رضیہ اور گوہر پھوپو دالان میں بچھے تخت پر بیٹھی پان کھا رہی تھیں اور زوردار بحث میں مصروف تھیں۔

"یہ سب چاند کی نقل ہو رہی ہے۔ اللہ کی شان ہے۔ سنا ہے فاطمہ بیگم کی لڑکی قیصر کالج میں پڑھ رہی ہے۔ یہ قیامت کے آثار ہیں۔ کمینوں کا اتنا زور ہو گیا ہے۔" پھوپو نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔

"اور یہ نہیں سنا بیگم صاحب پیدل جاتی ہیں کالج۔" رضیہ بڑے طنز کے ساتھ ہنسی۔ "جب پیسے نہیں ہیں تو بڑے آدمیوں کی نقل کرنا کیا ضروری ہے۔ بشیرا آپا مرحومہ زندہ ہوتیں تو جانے کیا کرتیں؟"

"کیا کرے بچاری ــــ صورت شکل تو ایسی ہے نہیں کہ کسی ڈیوڑھی کی بیگم یا خواص بن سکے۔" بی بی کی اس بات پر پھوپو نے بڑے غور سے انھیں دیکھا اور اندر کمرے میں سسکیاں لیتی ہوئی بتول سے بولیں۔

"جی اب بس کرو ماں بتول پاشا۔ ایک جانہار تو یوں ہی گھل گھل

کر مچکی ہے۔

بی بی کے پاس بیٹھ کر چھالیہ کے گرتے ہوئے ٹکڑے اور پانوں کے ڈنٹھل منہ میں ڈالنے کے بعد غزل نے چاند کے کمرے کا رُخ کیا۔

چاند سفید ساری پہنے، اپنے ذرا ذرا سے سنہری بال منہ پر بکھرائے بغیر آستین والی ننگی باہیں کرسی پر ڈالے نڈھال پڑی تھی۔ اس وقت وہ اپنی ہی بنائی ہوئی کوئی پینٹنگ لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو چھپائے — لپ اسٹک نہ کاجل۔

انھیں خاموش دیکھ کر غزل کی ہمت نہ پڑی کہ ان کی میز پر رکھی ہوئی رنگ برنگی شیشیوں اور ڈبیوں کو چھوئے۔ چاند کا کمرہ ایسا خوبصورت تھا کہ لگتا وہاں پریاں رہتی ہوں گی۔ درانڈے میں سے گزرو تو اس کمرے سے بھکا بھک خوشبوئیں آیا کرتیں تھیں۔ اس لئے وہ بڑے امید بھرے انداز میں دروازے سے لگ کر کھڑی ہوگئی کہ چاند خود ہی اندر بلالے۔

چاند ایوان غزل" کی واحد فرد تھی جو آج تک غزل کی کسی حرکت پر نہیں ہنستی تھی۔ نہ اسے کبھی ڈانٹا اور نہ اپنے کمرے سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ ایک بار انھوں نے اپنا پرانا شیفون کا اسکارف غزل کو دے دیا تھا۔ جو اس نے جانماز کی طرح سینت سینت کر رکھا تھا۔ چاند غزل کی آئیڈیل تھیں۔ حالانکہ وہ غزل کو بہت کم دیکھنے کو ملتیں۔ کیوں کہ غزل کبھی مہینوں میں نانا حضرت کے ہاں آتی تھی۔ لیکن چاند کے ساتھ وہ جتنی دیر رہتی، اسے چھو چھو کر دیکھتی اور اس بات پر چاند کو بڑی ہنسی آتی تھی۔ چاند کو یوں بھی بہت ہنسی آتی تھی۔ ان کا نام چاند رکھ کر جانے کس نے ان کی توہین کی تھی۔ ان کے سامنے تو ہزار سورج نکلتے تو ماند پڑ جاتے۔ بالکل سینما کی ناچتی گاتی تصویروں جیسی تھیں وہ۔ پھر ان کے خوشبو میں بسے کپڑے، سنہری کٹے ہوئے بالوں کی اڑتی ہوئی پھواریں، اور کنجالی آنکھوں

میں چمکتی ہوئی سنہری تتلیاں، جیسے پانی میں سنہری مچھلیاں تیر رہی ہوں

غزل دل ہی دل میں پکا ارادہ کئے بیٹھی تھی کہ وہ چاند آپا سے بیاہ کرے گی۔ اس بات کی اطلاع اس نے فوزیہ کو بھی نہ دی تھی کہ کہیں وہ بھی چاند آپا پر پھیل گئی تو وہ بچاری دو دو سے کیسے نبٹے گی۔ چاند کی اس خوبصورتی کی بدولت راشد کے بہت سے بگڑے کام سنور گئے تھے۔ کیوں کہ وہ چاند جیسی خوبصورت بھانجی کا ماموں تھا۔ بڑے بڑے سرکاری فنکشن میں اس کا پروگرام ہوتا۔ کالج کے ہر ڈرامے کی ہیروئن وہی ہوتی۔ اخبار اس کے آرٹ پر مضامین لکھتے تھے۔ اس طرح اونچے طبقے میں وہ نہ صرف خود پہنچ گئی تھی بلکہ اس نے راشد کو بھی پہنچا دیا تھا۔

ان حسین وجمیل چاند آپا پر غزل بھی مرتی تھی۔ انھیں ناشتے میں پاپڑ کھانے سے چڑ تھی۔ اس لئے صرف پاپڑوں کی تھالی غزل کی دست برد سے محفوظ رہتی تھی۔ چاند آپا دن بھر گنگناتی رہتی تھیں اور غزل بھی ان کی آواز میں آواز ملاتی۔

ارے غزل۔ تیری آواز تو بہت اچھی ہے — تو بھی گانا ضرور سیکھ لے نا۔"

"اچھا — آپ سکھا دیجئے"۔ وہ اپنی تعریف سن کر فوراً چاند آپا کی صاف ساری پر اپنے میلے ہاتھوں سے دھبے ڈالنے لگی۔

"تجھے کہاں فرصت ہے ڈیر —" انھوں نے غزل کے موٹے موٹے گالوں پر چٹکی بھری — "اللہ یہ لڑکی بڑی ہو کر کیسی قیامت ڈھائے گی۔" خوبصورت چیزوں پر مر مٹنا چاند کی عادت تھی۔

غزل نے اداسی سے سوچا — سچ مچ چاند آپا کو کہاں فرصت ہے۔ جس وقت دیکھو ڈرننگ روم میں گورے گورے کالے کالے لوگ بھرے رہتے تھے۔ کبھی ڈراموں کی ریہرسل ہو رہی ہے۔ چاند آپا وائلن پر گیت

گا رہی ہیں ۔ اپنی تصویریں دکھا رہی ہیں اور ڈرائنگ روم میں سگریٹ کا دھواں قہقہوں میں گھل رہا ہے۔

چاند آپا اپنی ہر بات میں نفاست اور تعلیم یافتہ ہونے کا ثبوت دیتی تھیں ۔ دنیا کا کوئی فیشن ایسا نہ تھا جو ان پر نہ جچا ہو ۔ یوں تو راشد ولایت پلٹ تھا اور رضیہ جونیئر کیمبرج تک پڑھی ہوئی تھی ۔ مگر چاند کی بدولت پہلی بار وہ سوشل بننے کی طرف متوجہ ہوئے تھے ۔ چاند نے اب دلہن ممانی کو بے پردہ کھلی کاروں میں لے جانا سکھایا تھا ۔ ہنس ہنس کر مردوں سے باتیں کرنا اور میک اپ کر کے پارٹیوں میں لے جانا ۔ یہ سب انھوں نے چاند کی صحبت میں سیکھ لیا تھا ۔ جس وقت وہ نئی وضع کا جوڑا باندھ کر بڑی کاریگری سے میک اپ کرتی تھیں تو اوروں کی بات چھوڑیئے ، خود راشد ان پر نئے سرے سے مرمٹتا ۔

چاند صرف نام کی آرٹسٹ نہیں تھی ، بلکہ اس کے آرٹ کا دائرہ واقعی بہت وسیع تھا ۔ میڈیکل کالج سے آ کر وہ شام کو حیدرآباد کے مشہور مصور راشد کے پاس پینٹنگ سیکھنے جاتی تھی ۔ اس طرح اس کا آرٹ اداکاری موسیقی پینٹنگ اور ڈاکٹری کا سنگم بن گیا تھا ۔ لوگ بے چینی سے منتظر تھے کہ کب وہ ڈاکٹر بن کر لوگوں کے دکھتے ہوئے بدن پر مرہم رکھا کرے گی ۔ جانے کتنے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے فن کاروں کی اس نے اپنی سفارش سے قسمت جگا دی تھی ۔ کالج کے تمام ہونہار طالبعلموں کی ذات کا محور چاند کی ذات تھی ۔ جسے سب پیار سے ڈاکٹر چاندنی کہتے تھے ۔ یہ سب اس وقت کی باتیں ہیں جب واحد حسین قرض کی آندھی میں گھر کے چکرا رہے تھے ۔ راشد روپیہ کمانے کے نئے نئے ذریعے ڈھونڈ رہا تھا ۔ کیوں کہ احمد حسین نے ایک حرامی لڑکے کو اپنا متبنٰی بنا کر انھیں انگوٹھا دکھا دیا تھا ۔ ادھر جائیداد قرض میں ڈوبتی جا رہی تھی اور صرف راشد کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار کی

آمدنی پر "ایوان غزل" کا وقار ڈگمگانے لگا تھا ۔ اس مصیبت سے چھٹکارہ پانے کے لئے انھوں نے راشد کو ایک چیک کی طرح کیش کرایا تھا اور رضیہ اپنے ساتھ بے شمار دولت لے کر آئی تھی ۔ واحد حسین کا بس چلتا تو وہ اس روپیہ کو بریانی اور بگھارے بیگن کی تجارت پر لگا دیتے ۔ مگر راشد نے اپنے ابا کی طرح تحصیلداری میں عقل نہیں گنوائی تھی ۔ اس لئے اس نے ملازمت کے ساتھ ساتھ کانی دواؤں اور بیڑی کی تجارت بھی شروع کر دی تھی ۔ کیوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ملکی مصنوعات کو فروغ دیا جا رہا تھا ۔ تاجروں کو حکومت بڑی بڑی مالی مدد دیتی تھی ۔ دیکھتے ہی دیکھتے چاندی کے سامان سگریٹ اور بیڑی نے پورے ہندوستان میں عالمگیر شہرت حاصل کر لی تھی ۔ حیدرآباد بہت چھوٹا سا علاقہ تھا ۔ مگر یہاں کی مصنوعات کی قدر ہندوستان سے باہر بھی تھی ۔ اس بہتی گنگا میں راشد بھی ہاتھ دھونا چاہتا تھا ۔

اس نے چاند کے توسط سے بڑے تاجروں سے یارانہ گانٹھا اور شولاپور کے راستے اپنا مال بمبئی اسمگل کرنے لگا ۔ چند مہینے بعد ہی اس نے پرانی پھٹیچر بیوک بیچ کر نئی رولس رائیس کار خرید لی ۔ "ایوان غزل" کے ہلتے ہوئے بام و در کی ریپیرنگ کروائی ۔ سود اور قرض کی کئی قسطیں ادا ہو گئیں ۔ اب جو لوگوں نے چاند اور رضیہ کی صورتوں پر انگلیاں اٹھانا شروع کیں تو واحد حسین کے خاندانی وقار کو کوئی ٹھیس نہیں لگی ۔ وہ اعتراض کرنے والوں کو کہتے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی روایتوں کو خود ہی دیمک بن کر چاٹ رہے ہیں ۔ قرض اور جہالت کی دلدل میں پھنس کر اپنی عقل بھی کھو بیٹھے ہیں ۔ ان کی لڑکیاں قرآن شریف پڑھنے کے بعد تعلیم مکمل کر دیتی ہیں لڑکوں نے آوارگی کی سب ڈگریاں لے لی ہیں اور اطمینان سے اپنی ڈیوڑھیوں میں بیٹھے شطرنج کھیلتے رہتے ہیں ۔ اور پھر ایک دن اچانک معلوم ہوتا ہے کہ رشتہ پڑ رہی ہے اور بچاؤ کے سارے راستے مسدود۔

جس وقت ہمایوں اپنے باپ کے انتقال کی خبر سن کر اندر بھاگا تھا تو اسے پکا یقین تھا کہ اب اس کے سوئے ہوئے بھاگ جاگ اٹھے ہیں مگر ہوا یہ کہ "الف لیلہ" سے ستکارے جلنے والے اس کے تمام سوتیلے بھائی آ گئے، باپ کی میت کو کاندھا دینے بھوک اور مصیبتوں نے انھیں جلنا سکھا دیا تھا۔ اس لیے ان میں کوئی جج تھا، کوئی بیرسٹر۔ کوئی تحصیلدار اور کوئی کلرک۔ لہٰذا سب نے مل کر عدالت میں ثابت کر دیا کہ ہمایوں ان کے باپ کا بیٹا ہی نہیں تھا۔ اس کی ماں جو پندرہ برس سے ساٹھ برس تک مسکین علی شاہ کی جوتیاں کھاتی رہی، ان کی کوئی نہ تھی۔ مگر ہمایوں نے ہمت نہیں ہاری اب وہ جوئے اور شراب میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت ڈھونڈنے گیا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا کہ کبھی تو رحمت علی شاہ اپنی کرامات سے اس کے دن پھیریں گے۔

"ہمایوں" کے اس عبرت ناک انجام کو دیکھنے کے بعد واحد حسین تعلیم کی برکتوں کے قائل ہوتے جا رہے تھے۔ اور چاند کا حکم ماننا اس کی باتوں پر عمل کرنا، گھر میں سب پر فرض تھا۔

یوں تو گو پھپھو کی ذات بابرکات بھی تھی جو شہر بھر کی لڑکیوں کی ناک میں نکیل ڈال چکی تھیں۔ مگر چاند تک ان کا بھی ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے چاند ہر طرف کمندیں ڈالتی رہتی۔ ہزار بار اس کا دل ٹوٹتا اور پھر جڑ جاتا تھا۔ ایک سے ایک قیمتی ساریاں پہنے وہ فرصت کے وقت کینوس پر جھکی گنگنائے جاتی۔

پیا باج کیسے صبوری کروں
کہا جائے اماں کہیا جائے نا

کام کرتے وقت اس کے کٹے ہوئے بالوں کی لٹیں ماتھے پر آ جاتی تھیں تو پاس بیٹھی ہوئی غزل جلدی سے انھیں پن میں اٹکا دیتی تھی۔

غزل کی ان حرکتوں پر چاند کو بڑی ہنسی آتی تھی۔ کیوں کہ وہ خود غزل کی نشیلی آنکھوں پر مرمٹی تھی۔ جانے بڑے ہو کر یہ لڑکی کیا غضب ڈھائے گی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی سے ایک دعوت ایک موہنی کشش تھی

ایک بار اس نے کسی کام کے لئے غزل کو پکارا۔

"اے ہرنی کی آنکھوں والی لڑکی ——— ؟"

یہ سن کر غزل اترائی اترائی پھرنے لگی۔

لوگوں کی حقارت بھری نظریں، ابا کا ملال اور اماں کا غصہ اس نے سب دل سے بھلا دیا۔ اس کا جی چاہا اپنے آپ کو سات بار وار کے چاند آپا کے اوپر سے پھینک دے۔

"چاند آپا تو ہماری ہیں —" ایک دن اس نے اترا کے فوزیہ سے کہا۔

"تمہاری کیوں ہوتیں؟" فوزیہ گھبرا گئی۔

"وہ تو ڈیڈی کی ہیں اور ممی کی —"

"آج تک کسی نے بھی گاجر کے مربّے میں کشمش ڈالی ہے؟" بی بی نے پان بناتے میں دھیرج سے کہا۔

"نہ ڈالی ہو — حدیث شریف میں تو نہیں لکھا ہے کہ گاجر کے مربے میں کشمش نہ ڈالی جائے۔"

حسبِ عادت آج واحد حسین گاجر کا مُربّہ بنانے میں جُٹے ہوئے تھے۔ جس دن کوئی نئی پریشانی انھیں آگھیرتی اور شعر ساتھ چھوڑ دیتے تھے تو وہ اچار چٹنیوں میں پناہ لیتے تھے۔

بی بی واحد حسین سے بہت کم بحث کرتی تھیں۔ کیونکہ رضیہ کی شادی کے بعد انھوں نے گھر کے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔ اس لئے اب وہ واحد حسین کے عشق پر گھبرانے یا گوبر پھولو کی باتوں پر کڑھنے کی بجائے، اپنی بہو کے سگھڑاپے پر خوش ہوتی تھیں۔ گھر اور اس کے بکھیڑوں سے ان کا تعلق اب اور بھی کم ہوگیا تھا۔ دن بھر وہ یا تو خود پردہ لگی کار میں کہیں رشتے داروں میں گھومنے چلی جاتی تھیں، یا آنے والیوں مہمان بی بیوں سے بیٹھی گپیں ہانکتیں۔ چاندی کے پاندان کو کھول کر پان پر پان کھائے جاتیں، کبھی موڈ آتا تو شاہین اور راشد کے لئے ململ کے کرتے سینے بیٹھ جاتیں۔ اپنے اس فن پر انھیں بڑا ناز تھا۔

رضیہ اور چاند کو کشیدہ کاری کے نئے نئے ڈیزائن بنانا آتے تھے۔ چاند تو اپنے بلاؤزوں کے ڈیزائن خود ہی کاغذ پر بناکر درزی کو دیتی تھی۔ رضیہ کو بچوں کے نئے نئے وضع کے جھالر دار جھبلے سینے کا بڑا شوق تھا۔ لیکن مشین کے بغیر ان لوگوں سے ایک ٹانکا نہ لگتا تھا۔ لیکن بی بی نے سلائی کا سارا کام مشین کے بغیر ہی کیا جب شادی بیاہ میں گوٹے کناری کا کام نکلتا تو لوگ چل چل کر بی بی کے پاس آتے تھے وہ سارے جوڑے اتنی نفاست سے تیار کرتیں کہ بس بیٹھے دیکھا کرو۔ البتہ جلوے کے جوڑے کو کبھی ہاتھ نہ لگاتی تھیں۔ ایک بار ان کی ایک خالہ ساس نے کہا بھی — "اے واحد دلہن تم جیسی خوش قسمت سہاگن کون ہوگی! اتنا چاہنے والا شوہر — بال بچے۔ آباد گھر — تم جلوے کے جوڑے کو ہاتھ کیوں نہیں لگاتیں۔"

"پھوپو اماں لوگ کہتے ہیں کہ سہاگ کا جوڑا سینے والی کی قسمت بھی اس گوٹے کناری کے ساتھ ٹک جاتی ہے تو پھر چپ کاہے کو — نئی دلہن کی قسمت میں اتنے جھگڑے ٹنٹے — ؟"

کبھی کبھی واحد حسین کو ذرا رومانی موڈ آتا تھا تو وہ بی بی کے ساتھ دو ایک شطرنج کی بازیاں بھی کھیلتے تھے۔ نوشقی کے باوجود ہمیشہ بی بی انھیں شکست دے دیتی تھیں۔ اس پر ایک شاندار معرکہ ہوتا اور آخر میں واحد حسین بساط اٹھا کر پھینک دیتے۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر بی بی کو اپنی بانہوں میں بھر لیتے تھے۔ انھوں نے پنشن لی تھی مگر انھیں کبھی بی بی کے بغیر اکیلے بستر پر نیند نہ آتی۔

وہ آج بھی بی بی کو نئی دلہنوں کی طرح تاکا کرتے تھے۔ حالانکہ بی بی آج بھی یوں ہی سرد مہری سے بڑے ٹھنڈے دل سے انھیں برداشت کرتی تھیں۔ جیسے بے جان گڑیا ہوں۔

اب پنشن لے کر تو واحد حسین اور بھی پچھتائے۔ پنشن سے پہلے

انھوں نے وقت گزاری کے بڑے سنہرے خواب دیکھے تھے۔ پھر جب اطمینان سے گھر میں آکر بیٹھے تو پہلے تو انھوں نے شیروانی اور تنگ موری کا پاجامہ اتار کر لنگی باندھی اور پھاوڑا لے کر تمام "ایوانِ غزل" کو گلزار بنا ڈالا — پھر گھر سدھارنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ مگر ہائی بلڈ پریشر اور ذیابیطس انھیں کچھ نہ کرنے دیتے تھے۔ اب تو ان کی آواز کی وہ مشہور کڑک اور غصہ تک ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اب انھیں دنیا کی ہر بات میں ٹانگ اڑانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ "فلاں نوکر کیوں، اور کہاں گیا؟" — "چاند کے پاس کون آیا؟" "آج کیا پکے گا؟" — بڑھاپے نے کیسے فولادی انسان کو پگھلا دیا تھا!

تحصیلداری کے تیس برسوں میں انھیں اپنی اہمیت منوانے کی ضرورت کبھی نہ پڑی۔ ضلع کے تمام عوام ان کے اشاروں کو سمجھتے تھے۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ گاؤں کی عورتیں واحد حسین کا نام لے کر اپنے بچوں کو ڈرایا کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنے باپ دادا کی روایت کے مطابق۔ تحصیلداری بھی کی تو اس شان سے کہ صدر المہام تک جھینپ جائیں۔

ہائے کیا زمانہ تھا ——؟ انھوں نے آسمان پر اڑتی ہوئی چڑیوں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس دن گھر سے راشد کے پیدا ہونے کا تار آیا تھا اور وہ خوشی کے مارے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ اس لئے نہیں کہ وہ پہلی بار باپ بن رہے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ انھوں نے اب بی بی کے پیر میں ایک اور زنجیر ڈال دی تھی۔ اب ان کے دل سے یہ وہم نکل گیا تھا کہ ایک دن گوہر پھوپو کی آنکھ بچا کر وہ اپنے باپ کی جھونپڑی میں بھاگ جائیں گی۔

وہ گھر جانے کو تیار ہو گئے۔ جوں جوں ضلع میں یہ خبر پھیلی لوگ تحصیلدار صاحب کو مبارکباد دینے جوق در جوق آنے لگے۔ اتنے نذرانے

اور تحفے اکٹھے ہو گئے کہ انھیں گھر لے جانا مشکل ہو گیا۔

ان دنوں یہ خبر گرم تھی کہ ریاست کا صدر المہام ایک "ہندوستانی" بننے والا ہے۔ یہ ہندوستانی سرکار کے بلاوے پر کئی چکر کاٹ چکا تھا اور سنا تھا کہ صدر المہامی کی مچھلی اس کے جال میں پھنس چکی تھی۔

"یہ ہندوستانی لوگاں بڑے چالو ہوتے ہیں"۔ واحد حسین لوگوں کو جتایا کرتے تھے۔

اس دن بلدہ جانے کے لئے مفروض احمد ٹرین میں بیٹھے تو آج جیسے ٹرین ان کی بے صبری پر ستانے تلی ہوئی تھی۔ چلنے کا نام ہی نہ لیتی۔ مسافر بے چینی سے کھڑکیوں میں سے جھانک رہے تھے۔ کوئی کہتا اگلے اسٹیشن پر ٹرین الٹ گئی ہے۔ کوئی سناتا کہ کمیونسٹوں نے پٹریاں اکھاڑ پھینکی ہیں۔ سارا ریلوے اسٹاف گھبرایا گھبرایا پھر رہا تھا۔

وہ لوگ مسافروں کے ہزاروں سوالوں کا جواب دینا حماقت سمجھ رہے تھے۔

پندرہ منٹ —— ایک گھنٹہ —— ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔

پنکھا کھول کر مفروض احمد نے سوچا کہ بھلا وہ ایسی ریاست میں کہاں تک اصلاح کریں گے جہاں ایک ٹرین بلا کسی وجہ کے ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہو جائے ——؟

شور کی آواز سن کر وہ پھر کھڑکی کی طرف آئے۔ ان کے سامنے انسانوں کا ایک سیلاب بہہ رہا تھا۔ لوگ جانے کیوں نعرے لگا رہے تھے پھولوں کے ہار مٹھائی کی ٹوکریاں اور کالے انسانی سروں کے علاوہ کچھ اور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ انھوں نے حیدرآباد کے بارے میں اتنا سنا تھا، اتنا پڑھا تھا کہ اب وہ ایک بھکارن کی صورت دیکھ کر اس کے چہرے پر کھوئی ہوئی ڈیوڑھی کی کہانی پڑھ لیتے تھے۔

وہ اپنی آنکھیں پوری طرح کھلی رکھتے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے بار بار پوچھتے جاتے تھے۔

"میٹھی دال میں کیا شکر ڈالی جاتی ہے ——؟" "ترم خاں کیا حیدر آباد کا کوئی بادشاہ تھا ——؟" "گنڈی پیٹ کا پانی کیسا ہوتا ہے ——؟ کیا یہاں سوکھی مچھلی اور جھینگے کھانا ضروری ہے ——؟"

کیا آپ لوگ پانی میں بھی املی کی کھٹائی ملا کر پیتے ہیں ——؟"

پھر اچانک اس انسانی سیلاب نے ان کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کا رُخ کرلیا۔ —— وہ پہلے تو اچھل پڑے۔ پھر گھبرا گئے —— شاید لوگوں کو پتہ چل گیا ہے کہ اس کمپارٹمنٹ میں حیدر آباد کا ہونے والا صدر الہام سفر کر رہا ہے —— لیکن ان کے لئے اتنا شاندار استقبال؟ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ صابر نواب نے اس بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں ہے!

اور جب وہ پھولوں کے لئے اپنی گردن جھکا چکے تھے تو ایک لحیم شحیم خوش شکل نوجوان کو لوگوں نے اندر ڈھکیل دیا۔ وہ پھولوں میں چھپا ہوا تھا۔ لوگ اس کے تحفوں کو رکھنے کے لئے اندر آ گئے اور مفروض احمد کو سامان سمیت اُن لوگوں نے روند ڈالا۔ ان کے ساتھ والے سرونٹ کیبن میں جب نوکروں کی فوج 'مرغیوں کے جھانپے اور پھلوں کے ٹوکرے رکھے جا چکے تو ٹرین چلنے لگی۔ اب انھوں نے بھی حواس میں آ کر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اس خوش شکل اور خوش قسمت نوجوان کو دیکھا جس کے چہرے پر ایسا رعب تھا کہ مغل شاہزادوں کی صورت نظروں میں پھر گئی۔ اس لئے مفروض احمد نے حفظِ ماتقدم کے طور پر صابر نواب کے سکھائے ہوئے درباری آداب برتنا شروع کر دیے۔

"سرکار کہاں جائیے گا ——؟"

"میں —— ؟ بلدہ جارؤں ——" واحد حسین نے ایک شان بے

نیازی سے کہا اور پھولوں کے ہار اتار اتار کر کھڑکی سے باہر پھینکنے لگے۔

"بلدہ —— ؟" مفروض احمد چکرا گئے۔ حیدر آباد کا نقشہ انھوں نے حفظ کر لیا تھا۔ مگر بلدہ کہیں دکھائی نہ دیا۔

"یہ بلدہ حیدر آباد سے کتنے فاصلے پر ہے ——؟"

"جی —— ؟" واحد حسین نے پلٹ کر انھیں دیکھا۔ بڑی دیر تک دیکھا کئے۔ پھر گردن ہلا کر بولے۔

"کون سے گاؤں سے آرئیں آپ —— ؟ پہلی بار حیدرآباد دیکھیں گے شاید ——؟"

"جی ہاں ——" مفروض احمد ارادے کے بغیر جھوٹ بول گئے۔ انھیں یقین ہوگیا تھا کہ اس شہزادے کی شان میں گستاخی ہوگئی ہے۔

"ہم لوگاں حیدر آباد کو بھی بلدہ بولتیں ——" اور پھر وہ اتنی زور سے ہنسے کہ مفروض احمد کو بھی ساتھ دینا پڑا۔

اس کے بعد واحد حسین نے اپنی امارت اور شان و شوکت کے خاندانی حالات سنانا شروع کئے تو کئی اسٹیشن نکل گئے۔

(یہ صابر نواب جانے کن چھچھورے نوابوں کا حال سنا کر انھیں مرعوب کرتے تھے۔ اصل جاگیرداروں سے تو اب تعارف ہوا ہے۔)

پھر واحد حسین نے زبردستی انھیں اپنے ناشتے میں شریک کیا۔ حالانکہ مفروض احمد نہیں نہیں کرتے رہے۔ اور اپنے ٹفن میں سے شامی کباب، پوریاں اور سوجی کا حلوہ کھانے کی کوشش کرتے رہے۔

"ہمارے بھوئی نے آج جگر کا سالن پکانے میں اتنی دیر کر دی کہ ٹرین کو ایک گھنٹہ لیٹ کرنا پڑا۔" واحد حسین نے لاپرواہی سے کہا۔

جب انھوں نے مفروض احمد کو بریانی کی ترکیب بتائی تو وہ بہت تعریف کرنے لگے۔ جو لوگ چاول جیسے معمولی سے اناج کو اتنی عزت

دیتے ہیں وہ آدمی کو بھی اونچی جگہ بٹھا سکتے ہیں۔

اس کے باوجود جب واحد حسین نے بریانی والا ٹفن کا ڈبہ ان کی طرف بڑھایا تو مفروض احمد نے ہاتھ سے سرکا دیا۔

"کیوں آپ کھانا نہیں کھاتے ——؟"

"کھانا تو کھاتا ہوں چاول نہیں کھاتا"

"چانول —! اچھا تو آپ لوگ کھانے کو چانول کہتے ہیں۔؟"

"اور آپ لوگ بڑے کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔؟"

"آپ نہیں کھاتے ——؟" مفروض احمد نے تعجب سے پوچھا تو واحد حسین نے ان کے گلاس کی طرف بڑھنے والا اپنا ہاتھ کھینچ لیا عین اسی وقت ایک کنکر نے ان کے منہ میں آکر طوفان برپا کر دیا۔ سارا کمپارٹمنٹ ان کی چیخوں سے دہل رہا تھا۔ اور سارے برتن ایک ایک کر کے باہر جنگل میں پھینکے جا چکے تھے۔

اگلے اسٹیشن پر باورچی کی طلبی ہوئی۔ چپراسی سے اسے تڑاتڑ جوتے لگوانے کے بعد واحد حسین نے حکم دیا کہ اسے یہیں اتار دو اور اس سے کہو کہ اب بلدہ تک پیدل چل کر آئے۔

مفروض احمد بڑی دیر تک سر باہر نکالے اس بوڑھے باورچی کو دیکھتے رہے جو اپنی زندگی کی ساری مسافت چاولوں کو عزت دینے میں طے کر چکا تھا۔ مگر سفر ابھی ختم نہیں ہوا —— ابھی اسے بلدہ پہنچنا ہے ——۔ بلدہ جو ہر غریب کی منزل ہے —— ہر امیر کی قبلہ گاہ ہے۔

"خاکسار کو جناب کے اسم گرامی کا علم حاصل نہ ہو سکا۔؟"

"جی بندے کو نواب واحد حسین خاں کہتے ہیں۔ میں پر بھنی کا تحصیلدار ہوں۔"

تحصیلدار ——؟ مفروض احمد پر غشی طاری ہونے والی تھی۔

"اللہ کی مہربانی ہے۔" واحد حسین نے ہاتھ جوڑ کر ریل کی چھت دیکھی۔

"حالانکہ میری سو پشتوں میں کسی نے ملازمت نہیں کی تھی۔ مگر اب حالات بدل گئے ہیں۔ ہم جاگیرداروں کو بھی یہ وقت دیکھنا تھا کہ ایسی معمولی سی نوکریاں کرتے پھریں۔"

مفروض احمد کو گم سم دیکھ کر واحد حسین نے کہا۔

"حیدر آباد میں آپ کو کوئی کام ہے تو بندہ حاضر ہے۔ ایک پیسہ خرچ کئے بغیر ہو جائے گا۔ غریب خانے پر آپ کو زحمت دوں گا اور اگر شعر و شاعری کا شوق ہے تو ——"

پھر وہ سگار سلگا کر نیم دراز ہو گئے اور چمکدار بوٹ عین مفروض احمد کے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولے۔

"اپنا نام بھی بولئے نا حضرت۔"

"جی خاکسار کو مفروض احمد کہتے ہیں —— مجھے سرکار نے صدرالمہامی کے لئے یاد فرمایا ہے۔"

جی —— ؟ جی —— ؟ جی —— ؟ جانے دنیا الٹ گئی یا واحد حسین پاگل ہو گئے۔ بدحواسی میں انھوں نے کئی قلابازیاں کھائیں —— کھسیاہٹ کے مارے اپنے ہاتھ توڑ ڈالے۔ فوراً جوتے اتارے اور دستار پہنی۔ جھک جھک کر آداب بجا لائے۔

لیکن مفروض احمد بڑی انکساری سے مسکراتے رہے۔ اور بالآخر آہستہ سے بولے۔

"مجھے صرف ایک بات کا افسوس ہے کہ خواہ مخواہ صدرالمہامی کے چکر میں پڑا۔ حالانکہ یہاں تو تحصیلدار بننا چاہیئے۔"

واحد حسین نے ایک آہ بھری اور پچھلے زمانہ کو یاد کیا ۔

کیا کیا لطف اٹھائے زندگی کے ۔ مگر اب ذیابیطس نے جینے کی امید چھین لی تھی ۔ ادھر بی بی نے ڈاکٹروں کے کہنے میں آکر اُن پر نمک، مرچ، گھی، گوشت، ہر چیز حرام کر دی تھی ۔

زمانہ دیکھتے ہی دیکھتے کتنا بدل گیا ہے ۔ جیسے تیز ہوا نے کسی ناول کے اکھٹے کئی ورق اُلٹ دیئے ہوں ۔

وہ لنگی باندھے، سپوٹے کے پیڑ تلے، آنگن میں کرسی ڈالے بیٹھے ہیں اور نگاہیں ہر آنے جانے والے پر لگی ہوئی ہیں ۔

بسم اللہ بی کو حکم دیدیا گیا تھا کہ بارہ بجتے ہی دوپہر کا کھانا تیار کر دے ۔ ادھر چولھے پر سے ہانڈی اتری اور گوہر بیگم نے اُبلی ہوئی ترکاریاں، بغیر نمک مرچ کا سالن اور سادا چپاتیاں ان کے لئے دسترخوان پر رکھ دیں ۔ اس کے علاوہ ان کا ہر چیز کا پرہیز تھا ۔ یہاں تک کہ اپنے بنائے ہوئے مرّبے اور اچار بھی وہ دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے ۔

" اور کیا پکایا ہے ؟ " وہ بسم اللہ بی سے پوچھتے ۔

" جھینگوں کی کڑھی ۔ امباڑے کی بھاجی ۔ بگھارے بیگن ۔

" تو جھینگوں کی کڑھی میں اتنا نمک کیوں ڈالتی ہے ۔ دیکھوں آج کتنا نمک ہے ۔ ؟

پھر وہ دو چار بیگن چکھتے ۔ ذرا سی کڑھی کھاتے ۔ دو ایک بوٹیوں کو چبا کر دیکھتے کہ گوشت گلا ہے یا نہیں ۔ اس طرح کہ بی بی اور راشد کے کانوں کان خبر نہ ہو جائے ۔ کیوں کہ جب کبھی ان کی طبیعت

خراب ہوتی تھی تو سب کو وہ بگھارے بیگن یاد آجاتے تھے ۔ کھانا کھا کر اٹھے تو پھر آبیٹھے سگار دھونکنے ۔ ان کے پاس ہی فرش پر لڑکی پھوپھو آبیٹھیں ۔ بیچ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ شروع ہو گیا ۔ واحد حسین خاصے تعلیم یافتہ تھے ۔ مگر گوہر بیگم سے بات کرتے وقت بالکل سلار وبن جاتے تھے ۔ اپنے خاندان کی ضد اور کمزوریوں کی حکایتیں فخریہ بیان کی جاتیں ۔ ذات اور ہڈی کے جوڑ کے بکھان ہوتے ۔ اپنے خود سر اور روایت شکن رشتے داروں کی ہنسی اڑائی جاتی ۔ واحد حسین خاندان میں لگائی بجھائی کرنے میں مشہور تھے ۔ دنیا بھر کے چھوٹے موٹے مقدموں کا فیصلہ اب ان کی عدالت میں ہوتا تھا ۔

کبھی ان کی بھاوج اجالا بیگم چلی آرہی ہیں میاں کی شکایتوں کا پلندہ لیے ۔ کبھی منجھلی ممانی کی بہو اپنی ساس کی زیادتیاں سنا رہی ہیں ۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے رشتے ملائے جا رہے ہیں ۔ کوئی قیصر کی خود سری کے قصے سنا رہا ہے ۔ اور وہ اس میں مزید کلیاں پھندنے ٹانک رہے ہیں ہر شخص کی زبان پر واحد حسین کی تعریف تھی اور ان کے دشمنوں کی برابر ۔ یہی وجہ تھی کہ گوہر بیگم سے ان کی خوب گھٹتی ۔ اور گوہر بیگم کو بھی جب گھر کے کام دھندے سے جی اوب جاتا تو وہ اپنے بھائی کے ساتھ بیٹھی گپیں ہانکا کرتی تھیں ۔ ایسے وقت بھی ان کی نظر گھر کے چاروں کونوں تک جاتی تھی کہ کون بچہ کیا شرارت کر رہا ہے ۔ کون سی چیز بے جگہ پڑی ہے اور کون سا نوکر کام کرنے کی بجائے خالی ہاتھ بیٹھا ہے بچوں کا ان کی صورت دیکھ کر دم نکل جاتا تھا ۔ سوائے غزل کے ۔ کیوں کہ سب کو طاق میں بٹھانے والی پھوپو کو غزل نے طاقِ نسیاں کر دیا تھا ۔

پھر بھی بچوں کو لنگڑی پھوپو بڑی نہیں لگتی تھیں ۔ خصوصاً جمعرات کے دن تو ان کی ہر بات بڑی میٹھی میٹھی لگتی تھی ۔ اور اس دن سب بچے

ان کے اردگرد منڈلانے لگتے تھے۔ کیوں کہ جمعرات کے دن لنگڑی پھوپو پانچ روپے کی مٹھائی منگوا کر کوئی عمل پڑھا کرتی تھیں۔ رضیہ کہتی تھی کہ گوہر پھوپو کو ابھی اپنی شادی کی آس ہے یہ عمل انھیں یوسف صاحب شریف صاحب کی درگاہ میں کسی طوائف نے بتایا تھا اور اس بات کو وہ خاص طور سے سارے گھر سے چھپاتی تھیں۔ کوئی پوچھتا تو کہہ دیتیں کہ اپنے ماں باپ کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے فاتحہ کرتی ہیں۔

چوری چھپے مٹھائی لانے کی ذمہ داری شیخو میاں نے لے رکھی تھی۔ شاہین اگر بتیاں سلگاتا۔ فوزیہ اور غزل مل کر مٹھائی کے الگ الگ حصّے تقسیم کرتے تھے۔ شیخو میاں سب سے پہلے مٹھائی کے حصّہ دار بنتے۔ یوں بھی لنگڑی پھوپو کو ساری دنیا کے مارے لتاڑے شیخو میاں کا بہت خیال رہتا تھا۔ شیخو میاں لنگڑی پھوپو کے دور کے کوئی بھائی لگتے تھے۔ مگر انتہائی آوارہ، بدچلن، شرابی اور جاہل لٹھ تھے۔ اس کے باوجود لنگڑی پھوپو نے ان کا گھر بسانے کی بے شمار کوششیں کیں۔ اچھے گھرانوں کی لڑکیاں نہ ملیں تو غریب غربا میں تلاش جاری رکھی۔ مگر لوگوں کو جانے کیا ہوا تھا کہ کوئی اپنی بیٹی شیخو میاں کو دینے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ گوہر پھوپو کا خیال تھا کہ ایسے بدچلن مرد شادی کے بعد ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ بے چارے کی زندگی سدھر جاتی۔

چوتھے پانچویں دن کہیں سے چھپاتے چھپتے شیخو میاں آجاتے تھے اور کئی کئی دن باہر نوکروں والی کوٹھری میں پڑے رہتے۔ بچوں کے ہاتھ کہلا بھیجتے تھے۔

گوہر آپا سے کہو تین دن سے بھوکا ہوں۔

اور گوہر آپا بھائی کی فاقہ کشی پر ترس کھا کر فوراً ٹرے میں کھانا...

سجانے لگتی تھیں۔

واحد حسین اور راشد کو شیخو میاں کی آمد قطعی نہ بھاتی تھی۔ کیا معلوم رات کو پھاٹک کھول کر غنڈوں کو اندر گھسالیں۔ کوئی چیز کے کرچمپت نہ ہو جائیں۔

یہ بات نہ تھی کہ شیخو میاں کوئی بھیک منگے چور اچکوں کے خاندان سے تھے۔ ان کے باپ دادا کی کافی جائداد تھی جو شیخو میاں کے والد نے اور ان کے بعد خود انھوں نے تباہ کر دی تھی۔ جب تک گوہر آپا کے ماں باپ زندہ تھے۔ شیخو میاں کے روٹی کپڑے کا کچھ نہ کچھ انتظام کر دیتے تھے۔ اسی وجہ سے گوہر بیگم اب بھی اس چھوٹے بے سہارا بھائی کا پیٹ بھرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔

ایک بار تو وہ بڑی دھوم دھام سے شیخو میاں کے لیے ایک گڑیا سی دلہن بیاہ لائی تھیں۔ جسے ایک ہی برس میں انھوں نے کھا پی کر ختم کر ڈالا۔ پھر شیخو میاں اپنی پسند سے خود ایک دلہن کہیں سے ڈھونڈ لائے۔ وہ ابھی دلہن کو چکھنے بھی نہ پائے تھے کہ اس نے خود شیخو میاں کو نگلنا شروع کر دیا۔ گوہر بیگم سب کو رو رو کر سناتی تھیں۔ کہ ذرا سی بات نہ ماننے پر وہ جوتا اٹھا کر شیخو میاں پر پل پڑتی تھی۔ دو چار برس کی کوششوں کے بعد کہیں جا کر شیخو میاں اس سے نجات حاصل کر پائے۔ اب انھیں پھر بیاہ رچانے کا ارمان تھا اور اس آنے والی دلہن کے فراق میں وہ دیوداس بن چکے تھے۔ رات دن نشے میں دھت ادھر ادھر لڑھکتے پھرتے۔ صبح بستر سے اٹھنے کے بعد سر اور ابرو سے لے کر سارے بدن کے رونگٹے استرے سے صاف کر ڈالتے۔ پھر کسی کونے میں لنگی باندھے اپنی گنجی چندیا پر ہاتھ پھیرا کرتے۔ سیاہ بجھے ہوئے چہرے پر سرخ آنکھیں دیوں کی طرح ٹمٹماتیں اور پھپوندی لگے سیاہ دانت

ہمیشہ میاں کے جھاگ میں ڈوبے رہتے تھے۔ ان کی شخصیت بچوں کے لئے بڑی دلچسپ تھی۔ کیوں کہ وہ جس وقت نشے میں نہ ہوتے تو بچوں کو جنوں اور بھوتوں کی عجیب و غریب کہانیاں سناتے تھے۔ اور نشے میں ہوتے تو ان کی گالیوں کی بھرمار ہواؤں سے لڑنے کا انداز اور رونے اور گانے کا موڈ بچوں کے لئے ایک کھیل بن جاتا تھا۔ اسی لئے شاہین، فوزیہ، چاند اور قیصر سب ہی بچے انھیں گھیرے رہتے تھے۔ مگر غزل کو انھیں دیکھ کر ابکائیاں آنے لگتی تھیں۔

شیخو میاں کی تعلیم اتنی تھی کہ اپنا نام لکھ لیتے تھے۔ ایک بار ملازمت کے لئے انٹرویو دینے گئے تو انھوں نے اپنے نام کی ہجے یوں کی ——
"ش و پیش شُو غ —— دال واو پیش دُ غ —— شیخ داؤد"

کبھی کبھی وہ اپنی قابلیت کا ثبوت دینے کے لئے بچوں کو پڑھانے آ بیٹھتے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ بی۔ اے تک پڑھے ہوئے ہیں لیکن امتحان دینے کی فرصت نہیں ملتی۔ شاہین کی "کنگ پرائمر" کھول کر وہ بڑے انہماک سے فوٹو دیکھتے اور پھر بچوں کو منتظر پا کر پوچھتے۔

"اچھا بتاؤ انگریزی میں مرغی کو کیا بولتیں ——؟"
"مرغی" غزل کہتی۔
"ہیں ہیں —" شاہین چلاتا۔
"ہشت۔ تم سب کے سب جاہلاں میں"۔
"اگ —" فوزیہ کہتی۔
"ہیں، ہیں —— یہ دیکھیے —" شاہین فوٹو دکھاتا۔
"دیکھو بیٹا تم ایمان سے بول رئیں نا؟" وہ مشتبہ نظروں سے گھورتے۔
"جی ہاں —" شاہین گردن ہلاتا۔
"اچھا تو اب آگے پڑھو —" وہ اطمینان سے ورق الٹتے۔

انہیں شاعری کا بھی خبط تھا۔ خوب جھوم جھوم کر اپنی غزلیں پڑھتے تھے اور بڑے فخر کے ساتھ لوگوں کو سناتے تھے کہ وہ واحد حسین کے شاگرد ہیں۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے غزلوں کا ایک پلندہ واحد حسین کی میز پر رکھ جاتے تھے مگر واحد حسین غصے میں آ جاتے۔

"ایک مصرعہ وزن میں نہیں لکھتا جاہل — جانے کیا اول فول بکتا ہے۔"

رات کو جب وہ لڑکھڑاتے ہوئے آتے تھے تو کسی دیوار کو تھام کر بچوں کے ہجوم سے پوچھتے۔

"بچو —— تم نے کبھی سیندھی پی ہے —! کبھی مت پینا۔ اللہ میاں خفا ہو جاتے ہیں اور ساری دنیا منہ موڑ لیتی ہے —"

پھر وہ نوکروں والی کسی کوٹھری میں ننگے فرش پر ڈھیر ہو جاتے تھے —

"ارے کوئی پانی پلا دے"۔ اکثر شیخو میاں چلائے جاتے مگر کوئی نہ سنتا۔ بچوں کو ان کے پاس جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔

ایک بار ان کی کراہیں سن کر غزل کو ترس آ گیا تھا۔ وہ پانی کا گلاس لے کر ان کے سرہانے پہنچی تو انھوں نے گلاس تھام کر کہا۔

"یہ کون بیٹی تھی ——؟ اللہ اسے بڑا خوبصورت دولہا دیگا۔ محلوں کی بیگم بنے گی۔"

سیندھی کا رنگ سفید ہے
عاشقوں کے لئے مُفید ہے

وہ اپنی غزل گانے لگتے۔

اس بات پر فوزیہ نے غزل کو خوب بنایا۔

غزل کو خوبصورت دولہا چاہیئے اس لئے شیخو میاں کو پانی پلاتی ہے۔

اس لئے غزل بی بی کے ہاں آتی تھی تب بھی شیخو میاں کی طرف بالکل نہ جاتی۔ بلکہ اسے تو بی بی کے گھر سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

"دیوان غزل" تو انگاروں بھری تھالی تھا۔ جس چیز کو ہاتھ لگاؤ سارا گھر ہیہ ہیں کرکے دوڑ پڑتا۔ اسی لئے تو ایاز اور شہزاد کبھی نہ آتے تھے۔

غزل کو دیکھتے ہی رضیہ اپنی اسپرنگ والی مسہری سے اٹھ بیٹھتی تھی۔ واحد حسین فوراً اپنے درختوں کی حفاظت کے لئے آنگن میں کھڑے ہو جاتے۔ گوہر پھوپو ساری بکھری ہوئی چیزوں کی اٹھا دھری شروع کر دیتیں۔ فوزیہ اور شاہین اپنے کھیل کھلونے چھپاتے پھرتے۔

پھر نانا حضرت سب سے پہلے اس کا منہ دھلواتے۔ دانت مانجھنے کا حکم دیتے۔ پھر سو تک گنتی گننے کا حکم ملتا۔ غزل کو سخت تعجب ہوتا کہ نانا حضرت اتنی جلدی گنتی بھول کیسے جاتے ہیں۔ ان کے پہاڑ سے بدن، سرخ آنکھوں اور جھاڑو کی طرح ہلتی ہوئی داڑھی سے غزل کو بڑا ڈر لگتا تھا۔

"اماں اماں نانا حضرت کی داڑھی ہلتی کیوں ہے۔" ایک دن اس نے پوچھا۔

"چپ چپ — نانا سن لیں گے۔" اس کی ماں نے ڈانٹ دیا۔

"تو کیا نانا نے اپنی داڑھی کبھی نہیں دیکھی؟" اس نے تعجب سے سوچا۔

لیکن گھر میں بھی کیا سکون تھا۔

جب کبھی ہمایوں اور بتول میں لڑائی ہوتی تھی تو ساتھ میں غزل کو بھی پسنا پڑتا۔ اماں کو بچانے کی کوشش میں دو چار لاتیں اس کے اوپر بھی پڑ جاتی تھیں۔ پھر سارا ابچا کھچا غصہ بھی ابا اسی پہ اتارتے تھے۔ ایسے وقت ایاز اور شہزاد دور کھڑے تماشہ دیکھتے تھے اور چپکے سے کہیں کھسک جاتے۔ یوں بھی وہ پٹنے پر کبھی نہ روتے۔ ادھر ابا ان پر لاتوں گھونسوں کی بارش کرکے ہٹتے۔ ادھر وہ کھی کھی ہنسنا شروع کر دیتے تھے۔ حالانکہ بھائیوں کے پٹنے کا یہ منظر غزل کو گھنٹوں رلائے جاتا تھا۔ ہمایوں کی دلچسپی اب بیوی بچوں سے زیادہ گھر کی کرسٹن سا آیا سے ہو چکی تھی۔ آفس سے آتے

ہی سا آیا، ہمایوں کے لئے چائے لے کر کمرے میں جاتی تھی تو پھر رات کو ہی دروازہ کھلتا۔

"توبہ ابا کتنی دیر میں چائے پیتے ہیں"۔ غزل دروازہ کھلنے کے انتظار میں بیزار ہو جاتی تو اماں اسے مارنے دوڑتیں۔

"خبردار جو پھر ایسی بات کہی — تجھے ان باتوں سے کیا واسطہ —؟"

یوں لگتا جیسے اماں کو خود بھی ان باتوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر سلگے جاتی تھیں۔

ہر بار جب ہمایوں مار پیٹ کر بتول کو پیسے لانے میکے بھیج دیتا تھا تو اس بات کی خبر واحد حسین کو بالکل نہیں دی جاتی تھی۔ لیکن ایک دن فوزیہ کے مقابلے میں اپنی مظلومی کا احساس دلانے کے لئے اس نے اپنی پیٹھ پر زخم کا نشان دکھا کر نانا حضرت سے کہہ دیا کہ اماں کو بچاتے وقت ابا کی لات اس کی پیٹھ پر لگ گئی تھی۔

اس دن سارا گھر تہہ و بالا ہو گیا۔

غزل نے بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھا کہ نانا حضرت تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے زنگیائی ہوئی بندوق کو صاف کر رہے ہیں اور اماں کا سسکیوں سے کانپتا ہوا بدن رضیہ ممانی پکڑے بیٹھی تھیں۔ اس دن سب ہی نے باری باری حسب استطاعت غزل پر لعنت بھیجی کہ اس نے نانا حضرت کو اپنی پیٹھ کا زخم کیوں دکھایا تھا۔ سوائے چاند کے جو ساری دنیا سے بے تعلق بنی جانے کیوں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی روئے جا رہی تھی۔

غزل منہ تھتھائے، ممانی بیگم کے اجلے بستر پر میلی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ناک کو انگلی سے گھنگھوتی رہی۔ ایسے وقت رونا مصلحت کے خلاف تھا۔ کیونکہ عین ممکن تھا کہ اماں کو پھر جلال چڑھتا۔ وہ تو اپنی تمام محرومیوں کا بدلہ بچوں کو مار کے لیتی تھیں۔ ادھر رضیہ کو غزل ایک آنکھ نہ بھاتی۔ وہ غزل کو یوں

دیکھتی تھیں جیسے غلاظت بھری موری دیکھ رہی ہوں۔ حالانکہ خود ان کے بچے بھی کوئی ایسے صفائی پسند نہ تھے۔ فوزیہ دن بہ دن نک چڑھی بنتی جارہی تھی۔ غزل کو دیکھ کر اپنی فراک یوں بچاتی جیسے کونٹوں سے بھری گاڑی گزر رہی ہو۔ شاہین تو نرا بے وقوف تھا۔ تیزی اور پھرتی تو اسے چھو کر نہ گئی تھی —— ہر بات اماں سے پوچھ کر کرتا۔ اماں کی اجازت کے بغیر پیچھے گری مچھلی کیری تک نہیں اٹھاتا تھا۔

ادھر ممانی بیگم کا اصرار تھا کہ اس احمق لونڈے کو غزل شاہین بھائی کہہ کر پکارے۔

پھر بھی محض اللہ واسطے میں غزل نے فوزیہ اور شاہین کو چند بے مصرف چیزوں کا استعمال سکھا دیا تھا۔ مثلاً کچی نارنگیاں اور گلاب کے پھول اگر توڑ کر طیا کے بچے کو دیئے جائیں تو بدلے میں وہ ڈبا بھر بھر کے بیر بہوٹیاں دیتا ہے۔ راشد کی ٹائیاں "چور پولیس" کھیلنے میں بطور ہتھکڑی استعمال ہو سکتی ہیں۔ نانی جان کی لپ اسٹک سے ہاتھوں اور ناخنوں پر مہندی لگانے کے علاوہ دیوار پر پینٹنگ بھی کی جا سکتی ہے۔ چاند آپا کی ٹوتھ کریم دانتوں پر لگا کر تھوکنے کی بجائے کھانے کی چیز ہے۔ غزل نے کئی بار باتھ روم بند کرکے ٹوتھ کریم کو کھایا تھا۔ خوب میٹھی میٹھی آئس کریم کے مزے کی تھی۔
لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ عقل کے کورے احمق شاہین کو جو نئی ترکیب بتاتی وہ فوراً مشورہ لینے اپنی امی کے پاس پہنچ جاتے۔

"امی ہم الماری کا شیشہ توڑ کے بسکٹ نکال لیں۔؟"

امی کی قہر آلود نظریں دیکھ کر وہ سہم جاتا۔

"غزل کہہ رہی ہے"۔

یہ سن کر اندر منہ لپیٹے ہوئے بتول اٹھ کر آتی اور غزل کی پیٹھ پر تابڑ توڑ مکے برسنے لگتے۔

بی بی کے گھر آنے سے پہلے اماں اس سے نیک چلن بننے کے بہت سے وعدے لے لیتی تھیں — اور غزل انھیں پورا کرنے کی مقدور بھر کوشش کرتی۔

"جب کہیں ٹھکانا نہیں ہے تو اللہ موت کیوں نہیں دے دیتا؟"
اسے مارتے مارتے تھک کر اماں یوں رونے بیٹھ جاتیں جیسے سارے گھونسے ان کے دل پر پڑے ہوں۔

اس لئے غزل کو اپنا ہی گھر پسند تھا۔ جہاں تینوں بھائی بہن مل کر خوب مارکٹائی کرتے۔ اماں چاروں طرف کی آفتیں سہتے سہتے سوکھ کر ہلدی کی گرہ بن گئیں تھیں۔ بی بی بتول کو دیکھتیں تو چھپ چھپ کر روتی تھیں۔ اللہ نے ان کی بیٹیوں کے نصیب بھی کیسے اُجاڑے۔ اب اس کے ہاتھ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ اس کے ہاتھوں کی مار غزل کے موٹے تازے بدن پر ذرا بھی نہ لگتی تھی۔ لیکن جب اماں آپ ہی آپ رونا شروع کرتیں تو غزل ایاز اور شہزاد کی طرح اماں کا منہ چڑانے کے بجائے ان کے گھٹنے سے لگ کر خود بھی بسورنا شروع کر دیتی تھی۔

دن بھر خوب دھماچوکڑی ہوتی — مگر شام کو ابا دفتر سے آتے تو سب کونوں میں دبک جاتے تھے۔

سنسان دوپہروں میں جب اماں سو جاتی تھیں تو غزل کو اپنے وجود کا احساس ہوتا۔ ساری کائنات اپنے قبضے میں آجاتی۔ اس وقت کوئی اس کے ساتھ نہ ہوتا۔ وہ جی بھر کے من مانی شرارتیں کرتی تھی۔ سب ممنوعہ چیزوں کی اٹھا دھری ہوتی اور دماغ اس آزادی کو محسوس کر کے تمتما جاتا تھا۔
پھر چپکے سے وہ دروازہ کھول کر باہر نکل جاتی تھی۔ یوں ہی باہر دیکھنے کے بہانے سارے محلے کا ایک چکر لگا آتی۔ گرمی کی دوپہر میں سیمنٹ کی گرم سڑک پر ننگے پاؤں چلنے سے وہ فرحت حاصل ہوتی جس سے لوگ کشمیر

کی وادیوں میں جا کر بھی محفوظ نہیں ہو پاتے۔ وہ اماں اور ابا کی سب مار بھول جاتی تھی۔ کبھی جی چاہتا کہ بچے پکڑنے والا جادوگر اسے بھی اٹھا کر کسی جادو کی نگری میں لے جائے۔ وہاں ہیرے جواہرات کے ڈھیر ہوں۔ وہ سارے ہیرے جواہرات اٹھا کر بھاگ جائے۔ ان ہیروں کو بیچ کر ایک سرخ چمکیوں والا کرتا خریدیں گے۔ اور کلیجی بھون کر کھائیں گے۔ جیسی کلیجی ایک دن رضیہ ممانی نے پکائی تھی۔ پھر تو ابا اسے مارنا چھوڑ دیں گے۔ انھیں ہیرے جھاڑنے پوچھنے سے فرصت ہی کہاں ملے گی کہ غزل کی ٹھکائی کریں۔ ـــــــ فوزیہ جھوٹ کہتی ہے کہ اس کے ڈیڈی اسے کبھی نہیں مارتے۔ غزل کو اس جھوٹ پر کبھی یقین نہیں آتا تھا۔ لیکن بی بی کے ہاں اسے عجیب و غریب تماشے نظر آتے تھے کہ ماموں فوزیہ کو ہاتھوں پر اچھال اچھال کر پیار کر رہے ہیں اور رضیہ ممانی سے الجھ رہے ہیں کہ اگر شاہین آج شوز کے بجائے سینڈل پہن کر اسکول جانا چاہتا ہے تو زبردستی کیوں کر رہی ہیں۔ شاہین اپنے ڈیڈی کے سامنے خوب قہقہے لگاتا تھا۔ اور ماموں جان اسے ہنستا دیکھ کر ابا کی طرح مارنے کی بجائے خود بھی ہنسنے لگتے تھے۔

"ڈیڈی ہم سے یہ سوال حل نہیں ہوتا۔" فوزیہ بڑے ناز سے کاپی پھینک دیتی تھی۔

"لاؤ ہم سمجھا دیں ـــ" ماموں جان جھک کر کاپی اٹھا لیتے تھے۔

غزل میں اور فوزیہ میں صرف چند مہینے کی چھوٹائی بڑائی تھی اس لئے فوزیہ کی ہر بات کی نقل کرنا اس پر لازم تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے ابا کو خوش کرنے کی ٹھان لی۔

"ابا ابا۔ ہم سے یہ سبق یاد نہیں ہوتا ـــ" اس نے کاپی ابا کے سامنے پھینک دی۔

"اچھا ٹھہرا ابھی یاد کراتا ہوں۔" وہ چھڑی لے کر پل پڑے تھے۔

وہ چاہے اپنی سریلی آواز میں کتنے ہی میٹھے میٹھے گیت گائے۔ چاند آپا کی طرح بن بن کر اپنے سلیقے اور صفائی کا کیسا ہی مظاہرہ کرے لیکن اماں کو کبھی اس پر پیار نہ آتا تھا۔

وہ دن رات منہ لپیٹے پڑی رہتی تھیں۔ کبھی اچانک اٹھ کر بیٹھتیں اور کعبہ شریف کے فوٹو پر سے ساری کا پلو پھیر کر گرد صاف کرنے لگتیں۔ لیمو اور مٹھائی کھاتے دیکھ کر تو سب ہی کے منہ میں پانی آتا ہے۔ مگر کسی بچے کو اس کی ماں سے پیار کرتے دیکھ کر غزل کی تو جیسے بھوک بھڑک اٹھتی تھی۔ اس رات وہ بہت سے خواب دیکھتی۔ جیسے وہ بھی ممانی بیگم کی طرح چم چم کرتی ساری پہنے، ہونٹوں کو سرخی لگائے کہیں جا رہی ہے۔ پھر اچانک اماں جھانسی کی رانی بن جائیں (جیسی ایک بار ڈرامے میں چاند آپا بنی تھیں) اور پھر اسے اٹھا کر کلیجے سے لگا لیتیں۔ خوب جی بھر کے پیار کرتیں کہ وہ تھک کر چور چور ہو جاتی۔ آنکھ کھلتی تو اسے وہ منحوس کپڑے یاد آتے جو اماں نے اپنے کنوارپنے کے زربفت والے پاجامے اور جارجٹ کی ساری کو کاٹ کر بنائے تھے۔ اماں کے نزدیک یہ کپڑے ابھی اتنے قیمتی تھے کہ بس چلتا تو غزل کے جہیز کے لئے اٹھا رکھتیں۔ مگر اس نے جان جان کر اتنے کھونچے لگائے، یوں رس رس کر پہنے کہ ممانی بیگم نے انھیں اپنی الماری میں رکھنے سے انکار کر دیا۔

"جانے کیسی بدبو آ رہی ہے ان کپڑوں سے۔ بہت گندے ہو گئے ہیں۔ اب انھیں گھر لے جا کر اپنے صندوق میں رکھو ــ" ممانی بیگم نے کپڑے اٹھا کر پلنگ پر پھینکے تو وہ زمین پر گر پڑے ـــ غزل کا کلیجہ پھٹ گیا۔

"ہم تو آپ کی الماری میں رکھیں گے یہ بھاری جوڑا۔ کہیں جانا ہو

تو گھر کیسے جائیں گے کپڑے لینے ۔"

"میں نہیں رکھوں گی ۔" ممانی نے ناک سکیڑ کر کہا ۔

"اتنی بڑی ہو گئی اور کپڑے پہننے کا سلیقہ نہیں آیا ۔ ایک ہماری فوزیہ ہے ۔ کیا مجال کبھی سفید فراک پر ایک دھبّہ تو لگا لے ۔ یہ بیچاری تو بس "الف لیلہ" کی شہزادی ہی ہیں ۔۔۔ آتا جاتا کچھ نہیں ۔"

خیر ۔۔۔ ابد کو اس کی بسم اللہ ہوئی تو صرف بی بی نے ہی اس دن کو یاد رکھا ۔ ماں اور ابا کو تو خبر بھی نہ تھی کہ آج غزل کی بسم اللہ کا دن ہے ۔ لیکن شام کو بی بی آئیں ۔ ایک دیگ میں بریانی اور دوسرے کھانے ۔ چار کشتیوں میں مٹھائی اور پھول اور ایک سرخ ساٹن کا پاجامہ سرخ کامدانی کا دوپٹہ اور سرخ چمکیوں والا کرتا ۔ اس جوڑے کو غزل نے اٹھا کر دل میں رکھ لیا جی چاہتا تھا عمر کو اپنے بدن سے جدا نہ کرے ۔

یہ جوڑا اس نے عید کے دن بھی پہنا اور بقرعید کے دن بھی ۔ فوزیہ کی گڑیا کی شادی میں اور پھر چاند آپا کے ساتھ ڈراما دیکھنے جاتے وقت ۔ پھر جب شاہین اور اس کے دوستوں نے "ایوان غزل" میں بچوں کا مشاعرہ کیا تو غزل نے نانا حضرت کی لکھی ہوئی غزل یہی کپڑے پہن کر سنائی ۔ سارا گھر بچوں کا یہ تماشہ دیکھنے اکٹھا ہو گیا تھا ۔ گوہر پھوپو کا تو ہنستے ہنستے برا حال تھا ۔ شاہین تو بالکل دادا حضرت کی کاپی کر رہا تھا ۔ ویسے ہی چیخ چیخ کر شعر پڑھے ۔ اسی طرح اپنے مصرعوں پر خود ہی جھوم رہا تھا ۔ فوزیہ البتہ گھڑی گھڑی شرمائے جا رہی تھی اور ساری غزل بھول بیٹھی تھی مگر غزل نے چاند آپا کی پوری کاپی کی ۔ ان ہی کے ترنم میں ان ہی اداؤں کے ساتھ چاند آپا کے کئے ہوئے میک اپ میں جب وہ غزل پڑھنے اٹھی تو رضیہ نے ناک سکوڑ کے راشد سے کہا ۔

"تصویروں میں بیٹھے ہوئے آپ کے دادا اکڑ دادا آج تو سب

غزل کی اداؤں پر نثار ہوئے جا رہے ہیں ۔" بازاری ادائیں اس چھوکری نے ابھی سے کہاں سے سیکھ لی ہیں ۔

راشد نے غور کیا ۔۔۔ واقعی "ایوان غزل" کی دیواروں پر سنہرے فریموں میں بند سارے شاعر آج جیسے کھلے جا رہے تھے ۔ ایک زمانے بعد انھوں نے ایک نوخیز فتنے کو یہاں حشر اٹھاتے دیکھا تھا ۔ ورنہ اس ایوان میں رات کبھی نہ آتی تھی ۔ کیونکہ رات ہوتے ہی پیمانہ بکف ساقی یہاں طلوع ہو جاتا تھا ۔

اس دن چاند نے غزل کو اپنے خوشبودار کپڑوں سے لگا کر خوب پیار کیا ۔ "شاباش کتنی اچھی ایکٹنگ کی ہے تم نے ۔۔۔ میں تمہیں ڈراموں میں چھوٹے چھوٹے رول دیا کروں گی ۔"

مگر ایاز اور ابا حسب عادت اس دن بھی منہ بسورتے رہے ۔

ابا ایاز اور شہزاد کے لئے تو کبھی کبھار کپڑے بھی لاتے تھے اور کھانے کی چیزیں بھی لاتے کیونکہ وہ لڑکے تھے ۔ اور ہمایوں کو یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی وہ "الف لیلہ" سے ان کی کھوئی ہوئی قسمت کا ستارا ڈھونڈ لائیں گے ۔ اس لئے وہ اپنے بیٹوں کو بہت چاہتے تھے ۔ ان پر کوئی سختی نہ کرتے ۔ ان کی ہر بدتمیزی کو نظر انداز کر جاتے تھے ۔ لیکن غزل سے انھیں بے حد نفرت تھی ۔ ہمایوں کو اپنی ماں کی بات یاد تھی کہ مرشدوں کو بیٹی راس نہیں آتی ۔ اور وہی ہوا ۔ جس دن غزل پیدا ہوئی اسی دن سے "الف لیلہ" پر نحوست کے بادل چھائے ۔ سکین علی شاہ کی موت جو ہمایوں کی قسمت کے بند دروازے کھولنے والی تھی ۔ اس کے نصیبوں کے سارے پٹ بند کر گئی ۔

وہ "الف لیلہ" سے نکل کر ڈیڑھ سو روپیہ کی کلرکی کر رہا تھا ۔۔۔ اور ایک دائم المریض بدقسمت بیوی کو بھگت رہا تھا ۔ ایک منحوس بیٹی کو روٹی کپڑا دے رہا تھا ۔ جس نے اپنے باپ کو اجاڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی

تھی۔

لیکن غزل کے دونوں بھائیوں کو اپنی برتری کی خبر ہی نہ تھی۔ اسکول سے آتے ہی وہ ضد شروع کرتے اور ایک ایک چونی لئے بغیر وہ اماں کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ چونی ملتے ہی وہ دونوں سینما دیکھنے بھاگ جاتے۔ صبح اٹھ کر وہ ناڈیا اور جان کاؤس کی نقل میں لکڑی کی تلواریں لئے دیواروں پر کودتے پھرتے۔ اماں کی ساریوں کے دوشالے بناتے اور پلنگ کھڑے کر کے گھوڑے تیار ہو جاتے۔ ایاز گیارہ برس کا تھا اور شہزاد بارہ برس کا۔ مگر وہ دونوں اپنی عمر سے بہت بڑے دکھائی دیتے تھے۔ اونچے پورے۔ صحت مند۔ ہمایوں کے سارے بچوں میں اپنے دادا کی خوبصورتی اور کشش آئی تھی۔ ہمایوں کی اماں کہتی تھیں غزل کی آنکھ میں وہی موہنی ہے جو سکین علی شاہ کو عورتوں میں مقبول بنائے ہوئے تھی۔ وہی سرخ و سفید طباق سا چہرا —— وہی بھیگی بھیگی —— نیم وا آنکھیں —— ویسے ہی گم سم —— اپنے آپ میں مست —— کاش یہ بچی اپنے دادا کی تقدیر بھی لاتی۔

ایک دن غزل آنگن میں پلنگ پر بیٹھی اماں سے سیپارہ پڑھ رہی تھی کہ ہاتھ میں تلوار لئے شہزاد دھم سے کودا اور غزل کو ایک ہاتھ میں اٹھا کر پلنگ پر چڑھ گیا۔ پھر اس نے دوسرا ہاتھ اٹھا کر جان کاوس کے انداز میں نعرہ بلند کیا ——

ہائے ——

پہلے تو غزل کچھ نہ سمجھی۔ یوں لگا جیسے چیل بوٹی سمجھ کر اسے لے اڑی ہو۔ پھر وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رو پڑی۔ مگر دونوں بھائی خوشی کے مارے مرے جا رہے تھے۔

" گجو آج ہم نے تجھے ناڈیا بنا دیا۔ جان کاوس فلم میں اسی

طرح ناڈیا کو اٹھاتا ہے۔

" نکو میں ناڈیا نہیں بنتی۔ معلوم ہے ناڈیا کو اللہ میاں دوزخ میں جلائیں گے " اسے اماں کی نصیحت یاد آئی۔

مگر دوسرے دن وہ پھر تھر تھر کانپتی۔ شلوار کے پائینچے اٹھائے آنگن میں منتظر کھڑی تھی کہ کب شہزاد دیوار سے تلوار ہاتھ میں لئے کودے اور اس کی کمر پکڑ کے پلنگ کی طرف اڑ جائے۔ وہ بھائیوں کی اس توجہ پر منہ لگائی ڈومنی کی طرح اترائی اترائی پھرنے لگی۔ اپنی اس قدر دانی کے آگے وہ فوزیہ پر رشک کرنا بھی بھول گئی۔ اپنے دونوں بھائیوں کو وہ فلم کے ہیرو سے بھی بڑا بہادر آدمی سمجھتی تھی۔ شاہین بچارا تو لان میں اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل کر ہی خوش ہو لیتا ہے۔ مگر اس کے بھائی کیسے بہادر تھے۔ ان کے فولادی مکے اور ناقابل برداشت لاتیں اور کڑوی ناانصافیاں بھی وہ ہنس ہنس کر سہے جاتی تھی۔

اپنی جانب اٹھنے والی ہر نگاہ کو وہ بڑے غور سے دیکھتی تھی۔ غزل کی چھٹی حس نے اتنی ہی سی عمر ہی میں اسے محبت اور نفرت کی نگاہ کو محسوس کر لینا سکھا دیا تھا۔ وہ اپنی جانب محبت سے دیکھنے والی نگاہ پر سات خون معاف کر دیتی تھی۔ کیونکہ ایسی نگاہیں بہت کم ملتی تھیں۔ اس شخص کے سارے عیب پر دہ ڈال کر اڑ جاتے تھے۔ پھر وہاں امید کی ایک کرن پھوٹتی۔ ایک ننھا سا سر اٹھا کے ادھر ادھر دیکھتا اور اپنی گردن زیادہ لمبی کر دیتا تھا۔ پھر ایک پنکھڑی پنکھ کھولتی۔ اور ایک بیل غزل کی رگ رگ کو جکڑ لیتی۔

———

کل دوپہر سر میں جوئیں دیکھتے وقت، اماں نے اسے بے شمار نصیحتیں کی تھیں وہ غزل کو رہ رہ کر یاد آرہی تھیں۔ ایک وہ کہانی سنائی تھی کہ ایک لڑکی نے اپنے باپ کو پانی نہیں پلایا تو وہ ٹٹیری بن گئی۔ وہ اب آسمان پر ایک بوند پانی کیلئے چلاتی پھرتی ہے اس کے حلق میں سوراخ ہے۔ اس لئے بارش ہوتی تو وہ منہ کھول کر اڑتی ہے تاکہ پانی حلق میں گرے ـــ اور ایک عورت نے اپنے شوہر کا حکم نہیں مانا تو اللہ میاں نے اسے دوزخ میں ڈال دیا تھا۔ ـــــــ ایک لڑکی غیر مردوں کے سامنے جاتی تھی تو ایک بزرگ نے ـــــــ

"تو کیا چاند آپا بھی ٹٹیری بن جائیں گی ـــ؟" اسے چاند آپا کی فکر مارے ڈالتی تھی۔ مگر اماں نے جانے کیوں اس کے سوال پر ایک تھپڑ رسید کر دیا تھا ـــــــ نوالے چباتے ہیں غزل سوچے جا رہی تھی ـــ لیکن گھر میں رونے پیٹنے والی عورتیں اسے کچھ بھی ڈھنگ سے نہیں سوچنے دے رہی تھیں۔ ـــــ وہ چولھے کے پاس زمین پر پھسکڑا مارے بیٹھی تھی اور سایا اسے دودھ شکر میں بھگو کر روٹی کھلا رہی تھی۔ ایسے ترمال اڑاتے وقت بھی وہ رات کا واقعہ نہیں بھولی تھی۔ جب کسی بات پر لڑتے لڑتے ابا نے ایک لات مار کے اماں کو

آنگن میں اچھال دیا تھا۔ غزل نے اپنی پوری طاقت لگا کر انھیں اٹھایا۔ اور جب وہ کسی طرح نہ اٹھیں تو وہ باہر کھیلتے ہوئے شہزاد اور ایاز کو بلا کر لائی۔ ـــــ پھر سارا محلہ گھر میں اکٹھا ہو گیا۔ جیسے دکھیو چپ چاپ پڑی ہوئی اماں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے آج تک کسی نے اماں کو نہیں دیکھا ہو ـــ پھر بی بی کا سارا گھر چیختا چلاتا روتا بسورتا آگیا اور بی بی نے آتے ہی سب سے پہلے غزل کو ایوانِ غزل بھجوا دیا جہاں لنگڑی پھوپو تک نہیں تھیں۔ صرف فوزیہ اور شاہین تھے۔ وہ دونوں بھی غزل کو بڑی رحم بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور اس کی کسی شرارت پر روک ٹوک نہیں ہوئی۔ اس نے جی بھر کے کچے سپوٹے توڑ پھینکے ـــ ورانڈے کے پتھروں پہ خوب تھوکا۔ ممانی بیگم کے اسپرنگ والے پلنگ پر خوب کودی اور فوزیہ اور شاہین سے خوب لڑائیاں ہوئیں۔

شام کو جب وہ گھر بلوائی گئی تو جانے کتنے لوگ گھر میں بھرے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود بڑا سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ ایاز اور شہزاد رونی صورتیں بنائے ہوئے، نہایت شریف بنے، بی بی کے پاس بیٹھے تھے۔ اماں کہاں گئیں۔؟ اس کے بار بار پوچھنے پر بی بی نے رو رو کر کہا کہ اماں اسپتال چلی گئیں۔ غزل بھی یہ سن کر ایک کونے میں چپکی بیٹھ رہی۔ مگر آج جانے کیوں ہر عورت کو اس پر پیار آرہا تھا۔ سب نے بار بار اسے اپنے پاس بلایا اور چھاتی سے لگا کر خوب روئیں۔ غزل رونے دھونے کے اس طویل سلسلے سے اکتائی جا رہی تھی۔ ورنہ کوئی اور وقت ہوتا تو اپنی اس قدر دانی پہ اکڑ کے لقا کبوتر بن جاتی۔

بی بی چپ چاپ خلا میں آنکھیں گاڑے بیٹھی تھیں۔ ممانی بیگم خواہ مخواہ آنکھیں رگڑ رگڑ کے اپنے اوپر رقت طاری کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لنگڑی پھوپو عورتوں کے حلقے میں گھری چلا چلا کر بین کر رہی تھیں۔

انھوں نے اپنے بال چڑیلوں کی طرح بکھیر لئے تھے اور منہ ڈھانپ کر بیان کئے جا رہی تھیں۔

"ابھی عمر ہی کیا تھی۔ اس کی ساتھ والیاں کنواری بیٹھی ہیں۔ انگار لگو ان مرشدوں کی صورت پر —— میری بچی کا کلیجہ بھون کر کھا گئے اجاڑ صورت میری بتول اماں —— تیرے کو کہاں پاؤں میری اماں" ——

پھر سب با جماعت رونے لگے۔

"غزل غزل —— اب تم ہمارے گھر آؤگی تو ہم تمہیں اپنی گڑیا دے دیں گے۔" فوزیہ نے بڑی فراخ دلی سے اعلان کیا۔

"کیوں دے دو گی مجھے ——؟" غزل نے بہتی ہوئی ناک کو پھر اوپر سڑک کر پوچھا۔

"اس لئے کہ تمہاری اماں جو مر گئی ہیں نا آج ——"

"نہیں بیٹے —— ایسا نہیں بولتے ——" رضیہ جلدی سے فوزیہ کا ہاتھ پکڑ کے ایک طرف لے گئی اور اس کے کان میں کچھ کہنے لگی۔

اماں مر گئیں ——؟ تو مر کے کہاں گئیں —— غزل کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اکتا کر وہ مردانے کمرے میں جا نکلی۔

نانا حضرت دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے تھے۔ راشد ماموں بار بار رومال سے اپنی سرخ آنکھیں پونچھتے اور پھر چھت کی طرف دیکھنے لگتے تھے —— ابا بھی بیوقوفوں کی صورت بنائے، بال بکھرائے بیٹھے زور زور سے پاؤں ہلا رہے تھے۔ نئے نئے لوگوں سے کمرہ بھرا ہوا تھا۔ مگر سب چپ تھے۔ جیسے جتنی کہنے کی باتیں تھیں ان کا اسٹاک ختم ہو گیا ہو۔ پھر اس کی نگاہ چاند آپا پر پڑی —— سیاہ شلوار —— سیاہ چمکتا ہوا شرٹ اور سیاہ جالی کا دوپٹہ پہنے بیٹھی تھیں۔ رونے کی وجہ سے ان کا چہرہ سرخ بھبوکا ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

پھر انھوں نے اپنی مترنم آواز میں کہا۔

شیکسپیئر نے کتنی اچھی بات کہی ہے کہ "دنیا ایک اسٹیج ہے جہاں ہر شخص اپنا رول ادا کر کے چلا جاتا ہے۔ مگر بچاری بتول خالہ نے کیسا ٹریجک رول ادا کیا ——" وہ پھر رونے کی تیاری کرنے لگیں تو بیک وقت کئی لوگ انھیں سمجھانے ان کے قریب سرک گئے۔

"آپ تو اتنی تعلیم یافتہ ہیں پھر جاہلوں کی طرح ——"

"خدا کے لئے اپنے دل کو سنبھالئے مس چاندنی —— آخر آپ کتنا غم کریں گی —— ورنہ مجھے کسی ہاسپٹل پہنچا دیجئے۔"

پھر راشد کے دوست سبحان صاحب کو یاد آیا کہ اگر چاندنی یوں ہی غم مناتی رہی تو اس ہیروئن کے پارٹ کا کیا ہوگا جو چاند کو ان کے ڈرامے میں کرنا ہے۔ اس لئے انھوں نے آہستہ سے کہا کہ وہ اور چاند ان کے ساتھ کہیں باہر گھومنے چلیں۔ تاکہ تازہ ہوائیں چاند کی طبیعت کچھ سنبھل جائے —— یہ سن کر راشد نے چاند سے بڑی مدھم آواز میں کہا۔

"تم چلی جاؤ سبحان صاحب کے ساتھ۔ میں تو ابا جان کے ساتھ ہی رہوں گا۔"

سبحان صاحب بڑے اثر و رسوخ والے آدمی تھے۔ دس پانچ ہزار کے کنٹریکٹ دلانا ان کے لئے چند منٹ کا کام تھا۔

"ہائے اللہ نکو جی —— میرا دل کہیں جانے کو نہیں چاہتا۔" چاند نے بڑے نخرے سے منہ بنا کر کہا:

سبحان صاحب چپ ہو گئے شاید اس لئے کہ ایک جوان روح جسم سے جدا ہو گئی تھی۔ یا پھر اس لئے کہ چاند کے اداس چہرے نے کمرے میں بیٹھے ہوئے مردوں کے دلوں میں اندھیرا پھیلا دیا تھا۔ چاند کی

خالہ کے انتقال کی خبر چاند کے تمام [illegible] ستوں کو کھینچ لائی تھی۔ پھر چاند ہمایوں کے یہاں آئی تو لمبی کالی بیوک میں [illegible] اترتے دیکھ کر پاس پڑوس کے تمام مرد ہمایوں کو پرسا دینے کے لئے کمرے میں چلے آ رہے تھے۔ کمرے کے فرش پر کہیں بیٹھنے کے لئے جگہ باقی نہیں بچی تھی۔ اس پر بھی بھان صاحب اپنی پوزیشن کا خیال کئے بغیر چاند کے قریب بغیر دری والے فرش پر نہایت بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ بتول اور اس کی سسرال والوں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ وہ مرے گی تو راشد اور چاند کے ملنے والے اتنے بڑے بڑے لوگ اس کے ہاں تعزیت کے لئے آئیں گے۔

ہمایوں بھی جانتا تھا کہ بھان صاحب بڑے اثر و رسوخ والے آدمی تھے۔ ان کے باپ دادا بیگم بازار میں سود بیاج کی دوکان لگائے بیٹھے تھے۔ اور راشد کے باپ دادا کی دولت کو چپکے چپکے اپنی طرف کھینچتے رہے۔ پھر بھان صاحب نے اس دولت کو داؤ پر لگا کے بہت بڑے پیمانے پر بزنس شروع کر دیا۔ جب وہ حیدرآباد کے سرمایہ داروں میں نمایاں نظر آنے لگے تو انھوں نے شہرت کمانے اور عوام میں مقبول ہونے کے کئی کارنامے انجام دیے۔ لاوارث بچوں کے لئے آرام گھر بنوائے۔ "انسداد بے رحمی بر انسان" کی مہم چلا کر ان ساری لونڈیوں چھوکریوں اور بچوں کو جاگیرداروں کی ڈیوڑھیوں سے باہر نکالا جو ڈیوڑھیوں کے آؤٹ ہاؤس میں پیدا ہوئے تھے۔ زندگی بھر جوتوں سے پیٹے جاتے۔ سلاخوں سے جلائے جاتے۔ لڑکیاں گھر کے جوان مردوں کے پیروں تلے روندی جاتیں اور پھر گھر کی کسی بیگم کے ہاتھ سے پٹتے پٹتے مر جاتی تھیں۔

بھان صاحب ایک کلچرل سوسائٹی کے بھی پریزیڈنٹ تھے۔ میڈیکل کالج کے ایک ڈرامے میں انھوں نے چاند کو دیکھا تو اچانک اپنی کلچرل

سوسائٹی پر چھایا ہوا اماوس کا اندھیرا دور ہوتا دکھائی دیا۔ مگر وہ بڑی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے۔ اسلئے انھوں نے چاند کی خدمت میں راست پھولوں کا گلدستہ اور مبارکباد پیش کرنے کے بجائے راشد سے تعلقات بڑھائے اور اسے ایک بلڈنگ بنوانے کا ٹھیکہ دلوا دیا۔ بس یوں ہی — اور اس طرح وہ اکثر راشد کے ہاں آنے لگے۔ اس کے بدلے میں راشد پر بھی فرض تھا کہ بھان صاحب کی کلچرل سوسائٹی کے لئے چاند جیسی اداکارہ کو چاندی کی کاسٹ میں رکھ کر پیش کرے۔ پہلی بار بھان صاحب چاند سے بڑے تکلف، بڑے اہتمام سے ملے۔ چاند نے بھی رسمی ملاقات سے زیادہ انھیں کوئی اہمیت نہ دی۔ کیوں کہ بھان صاحب چالیس سے اوپر پہنچ چکے تھے۔ ان کی گنجی چاند، بھاری بھر کم تن و توش اور سیاہ رنگ میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو چاند جیسی ماہ پاراؤں کی توجہ کھینچ سکے۔ اس لئے وہ چاند کے آگے سوائے اپنے اخلاق اور اپنی دولت کے اور کیا پیش کرتے۔

البتہ آج انھوں نے تھوڑی سی کوشش کے بعد چاند کو اپنے ساتھ "ہوش رُبا" لے جانے پر راضی کر ہی لیا۔

جب چاند آپا ایک لمبی سی چمکیلی کار میں بیٹھ کر اس گنجے آدمی کے ساتھ چلی گئیں تو غزل پھر اندر آگئی۔

گیلے فرش پر چھپک چھپا کرتی گھومتی رہی۔ آخر ایک کپڑوں کے ڈھیر پر لیٹ کر آنکھیں ملنے لگی۔ اماں مر گئیں۔ — اس بات پر اگر وہ رونا شروع کر دے تو ابا ضرور ماریں گے۔ اس بات پر اسے پھر اماں یاد آئیں اور وہ سچ مچ رونے لگی۔

اس کی آواز سن کر سب دوڑے آگئے۔ جیسے آج سے پہلے اسے کسی نے روتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔ اور غزل کے ساتھ سب

ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔

"ہمایوں میاں تم اپنے لڑکوں کو سنبھالو، غزل کو میں اپنے پاس رکھوں گی۔"

"ہاں غزل "ایوانِ غزل" میں رہے گی ــــــــ" واحد حسین نے بھی بڑے جوش سے کہا۔

صبح ہمایوں منہ تمتمائے دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا۔ سائرہ نے لاکھ چاہا کہ اپنے ہاتھوں کی مٹھاس گھول کر اسے چائے پلا دے مگر اس نے دونوں بار اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ بتول سے کوئی آرام نہیں تھا مگر وقت بے وقت سو دو سو روپے اپنے میکے سے لے آتی تھی تو کام چل جاتا تھا۔ اب اسے دوسری پیسے والی بیوی کہاں ملے گی ایسی فکر اسے کل سے کھائے جا رہی تھی۔

چولھے کے پاس بی بی بیٹھی ایاز اور شہزاد کو گھی میں تل کر پوریاں کھلا رہی تھیں۔ اور اس طرح ایک مہینے کے خرچ کا گھی آج ہی ختم کئے ڈال رہی تھیں۔ مگر اس کی ساس کو ان باتوں سے کیا غرض ــــ "ایوانِ غزل" کی ملکہ ٹھہریں ــــ انھیں تو اس وقت داماد کو یہ دکھانا تھا کہ وہ اپنے نواسوں کو کتنا چاہتی ہیں۔

میٹھی پوریوں کی خوشبو سونگھ کر غزل نے بھی وہ میلا چیکٹ تکیہ چھوڑا جس میں ابھی تک اماں کی خوشبو بسی ہوئی تھی اور چولھے کی طرف بھاگی۔ مگر ہمایوں کو گھورتے دیکھ کر نل کی طرف مڑ جانا پڑا۔ نل کے ٹپکتے ہوئے قطرے دو چار ڈال کر اس نے پورے چہرے پر یوں مالش کی کہ سارا چہرہ دھلا ہوا لگے۔ پھر پانی کے میلے ٹپکتے ہاتھ لئے وہ پوریوں

پر پل پڑی ۔

غزل کی ماں مرگئی ـــــ ہمایوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ دبلی پتلی بے زبان عورت اسے اتنی بڑی زک دے سکتی ہے ۔ اب وہ ان تین نالائق بچوں کا کیا کرے ـــــ ؟ چلو غزل کو تو نانا کے ہاں ٹھکانا مل جائے گا ۔ مگر ایاز اور شہزاد کو یتیم خانے میں ڈالنا پڑے گا تاکہ قبر میں پڑی ہوئی بتول کو وہ اسی طرح لاتیں رسید کر سکے ۔

اماں مرگئیں ـــــ ! باورچی خانے میں اماں کی مخصوص چوکی پر بی بی کو دیکھ کر بار بار غزل کو یاد آرہا تھا ۔ بار بار نوالہ لوٹ کر حلق میں آجاتا ـــــ آج جانے کیوں میٹھی پوریوں میں ذرا مزہ نہ آرہا تھا ۔ اماں کب آئیں گی ـــــ میں بھی اماں کے پاس جاؤں ـــــ اس بات پر اسے ضد کرنے کا پورا حق ہے ۔ کیوں کہ اماں نے پھر بے ایمانی کی تھی ۔ یوں ہی چلی گئی تھیں جیسے "ایوان غزل" جاتے وقت اسے دھوکا دے کر سلا دیتی تھیں ۔ صبح آنکھ کھلتی تو وہ خوب شور مچاتی تھی ۔ یہاں تک کہ ابا اسے گود میں اٹھا کر اماں کے پاس پہنچ آتے تھے ۔

" اب ہم اماں کے پاس جائیں گے ـــــ " پوریوں سے پیٹ بھرنے کے بعد اس نے سسکیاں بھرنا شروع کیں کہ آج پھر ابا کی گود میں چڑھ کر بی بی کے ہاں جائے گی ۔

" بی بی ـــــ " ہمایوں نے غزل کو غصے سے دیکھا ۔

" بی بی ۔ اس پوٹی کا رونا بند کروائیے ۔ نہیں تو میں سچّی بھی اسے اس کی ماں کے پاس بھیج دوں گا ! مجھ سے یہ کتیا کے پلے اب نہیں پلیں گے ۔"

یہ سن کر غزل رونا دھونا پھینک پھانک بھاگ کھڑی ہوئی ۔

رات کو جب وہ زبردستی اکیلے کھٹولے پر سلوائی گئی تو اسے شبّو بیاں سے سنی ہوئی جن بھوتوں کی کہانیاں یاد آنے لگیں اور وہ ڈر کے مارے اس تکیے سے لپٹ گئی جو اماں کے پسینے کی بو میں بسا ہوا تھا ۔

اب صبح کے وقت گھر میں بڑا ہنگامہ مچنے لگا ۔

یوں تو بدانتظامی اماں کے وقت سے ہی اس گھر کی روایت بن چکی تھی ۔ یہاں سایا کا راج تھا اور بتول اسپتال میں پڑی رہتی تھی ۔ کبھی ٹھیک ہو کر آتی تو ہمایوں پھر اس کا کوئی کل پرزہ توڑ کے میکے بھجوا دیتا تھا ۔ باپ کے مرتے ہی جب ہمایوں "الف لیلہ" سے نکالا گیا تو واحد حسین نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اسے کسی دفتر میں اہلکار کروا دیا تھا ۔ رفتہ رفتہ ہمایوں کو احساس ہوا کہ زندگی زہر کا گھونٹ ہے اور بیوی سب سے بڑی بلا ہے ۔ بچوں کا پالنا اور گھر کی ذمہ داری کی خاطر اپنے اوپر ہر عیش کو حرام کر ڈالنا ۔ اس سے بڑی سزا اور کیا ہوگی ۔

"الف لیلہ" سے نکلنے کے بعد ہی اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ کسی طرح مار پیٹ کے ہمیشہ کے لئے بتول اور بچوں سے چھٹکارا پالے ۔ مگر بتول تو اس کے گلے کا ہار بن چکی تھی ۔ چاہے کتنی ہی لاتیں مارو یا ٹھوکریں لگاؤ وہ قدموں میں لوٹے جاتی ۔ جب حکم دو فوراً اپنے باپ سے سو دو سو روپے لا دیتی ۔ بچوں سے ہمایوں کو اب کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ خصوصاً غزل سے تو انتہائی نفرت تھی ۔ جیسے "الف لیلہ" کا جادوئی چراغ چرانے والی یہی مکار چڑیل تھی جس نے ہمایوں کو محل سے نکال کر جھونپڑی میں لا

پھینکا تھا۔

بتول کے مرنے کے بعد ایاز اور شہزاد کے تو خوب مزے ہوگئے۔ ابا دن بھر دفتر میں رہتے تھے۔ سایا کو وہ خاطر میں نہ لاتے۔ اس لیے اماں کی سرمہ دانی سے لے کر ابا کے پرانے جوتے تک بیچ کر انہوں نے سینما دیکھ ڈالا۔ البتہ ایاز کو کچھ پڑھنے سے بھی دلچسپی تھی۔ اکثر کتاب کھول کر کسی کونے میں جا بیٹھتا تھا۔

صبح وہ تینوں سوئے ہوئے فتنوں کی طرح جاگتے تھے۔ ناشتے پر وہ لوٹ مار مچتی کہ اکثر ہمایوں بھوکا ہی دفتر چلا جاتا تھا اور غزل ناشتہ نہ ملنے کے غم میں پچھاڑیں کھاتی تھی۔ لیکن بتول کے مرنے کے بعد تو غزل کی چیخوں پر کوئی بھی کان نہ دھرتا تھا۔ ہمایوں نے تو خیر اسی دن اس کے وجود پر لعنت بھیج دی تھی جس دن وہ پیدا ہوئی مگر ایاز اور شہزاد کو بھی اس سے جنم جنم کا بیر تھا۔ اس لئے ہر طرف کی دھتکار کے بعد اسے صرف اماں کے سوکھے سینے سے لگ کر سکون ملتا تھا۔ ہمایوں کے بے رحم ہاتھو سے بچانا بھی صرف بتول ہی کا کام تھا۔ مگر بتول کے مرتے ہی ہمایوں کو تو غزل کو پیٹنے کے سوا اور کوئی دوسرا کام یاد نہ رہا۔ بی بی نے کئی بار اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے کہا لیکن ہمایوں راضی نہ ہوا۔ وہ کہتا تھا صرف غزل ہی کیوں ۔۔۔؟ لے جانا ہے تو تینوں بچوں کو لے جاؤ تاکہ اسے چھٹکارا ملے ۔۔۔ اب ایسے شیطان بچوں کی پلٹن بی بی کیسے پال سکتی تھیں اور وہ پال بھی لیتیں تو رضیہ کب راضی ہوتی!

اس لئے غزل عقاب کی زد میں آنے والی فاختہ کی طرح دن بھر کسی کونے میں دبکی لرزا کرتی تھی۔

اب ننھی پنکھیا سی سوکھی ماری پھوپی جان بھی بھائی کا اجڑا گھر سنبھالنے آگئی تھیں۔ وہ بچاری بغدادی قاعدے والی تمام نصیحتیں نہایت نستعلیق انداز میں ایاز اور شہزاد کو سناتی تھیں کہ بہن کو مارنا چھوڑ دو۔ پھر تنگ آکر اپنے گھر چلے جانے کی دھمکیاں دیتی تھیں، جسے سن کر سب چند منٹ کے لئے چپ ہو جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ پھوپی جان کو اپنی بہو اور بیٹے میں صلح کرانے

کے لئے گھر جانا پڑتا تو یہاں سب کا بیڑا ہو جاتا تھا۔ ایک بات ہو تو گنائی جائے۔

سایا کو ہمایوں کی ناز برداری سے فرصت نہیں ملتی تھی کہ بچوں کے لئے کھانا پکائے۔ ایاز کا جوتا کھو گیا۔ شہزاد نے ایاز کی کتاب پھاڑ ڈالی۔ پھر دونوں لڑ پڑے۔ اور اس دھینگا مشتی میں صراحی ٹوٹ گئی۔ اچار کا مرتبان گر گیا۔ ایاز کی نکسیر پھوٹ گئی۔ شہزاد کا گھونسہ بیچ بچاؤ کرنے والی غزل کے پیٹ میں جا لگا۔

جب دونوں بھائی من مانی شرارتیں کر کے تھک جاتے تھے تو غزل سے چھیڑ خانی کرنے بیٹھ جاتے۔ بتول کو اسی بلئے بائے نے کھا لیا تھا۔ یہ تو پھوپی جان کی محبت تھی کہ دو مہینے سے وہ ٹانک پاپی کر اس گھر کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھیں۔ جب دن غزل کی رکابی میں سے ایاز بوٹی اٹھا کر کھا لیتا تھا تو وہ گھنٹوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر یوں روتی جیسے دشمنوں نے اس کے دل کی بوٹیاں چبا ڈالی ہوں۔

سایا بازار جاتے جاتے اسے گونگی بھکارن کی جھولی میں ڈالنے کی دھمکی دیتی تھی۔ اس گونگی بھکارن کی پھٹی ہوئی آنکھوں سے غزل کو بے حد ڈر لگتا تھا۔ پھر وہ اور زور زور سے رونا شروع کر دیتی تھی۔ بی بی کہتی تھیں کہ غزل کے ہر وقت کے رونے ہی سے اتنی نحوست پھیلی کہ بتول مر گئی۔ ایسے وقت ہمایوں جھنجھلا کر ایاز کو چولہے میں کی جلتی ہوئی لکڑی لانے کا حکم دیتا تھا۔ چنانچہ کپڑوں سے دھول جھاڑتی، کلائی سے بہتی ہوئی ناک پونچھتی ہوئی وہ کھڑی ہو جاتی۔ اسی پر بات ختم نہ ہوتی۔ اچانک ہمایوں کو یاد آتا کہ اس بے ماں کی بچی کو پالنے کی ذمہ داری صرف اسی پر ہے۔ لہٰذا اسے فوراً اسکول جانے کا حکم ملتا۔ اور اسکول جانے سے پہلے جوتے ڈھونڈنے کا اور جوتے ڈھونڈنے سے پہلے بالوں میں سایا سے کنگھی کروانے کا ۔۔۔ اور کنگھی کروانے سے پہلے سبق یاد کرنے کا ۔۔۔ اور ۔۔۔ ظاہر ہے کہ یہ نہایت نامعقول اور فضول کام ہوتے جو اسے محض رونے کی سزا کے طور پر کرنا تھے۔ اس لئے وہ ان سنی کر کے نہایت لاپرواہی

کے ساتھ دیوار کا چونا ناخنوں سے کھرچے جاتی تھی۔ کیونکہ ڈھولش کے ساتھ حکم بجالانا اسے قطعی پسند نہ تھا۔ کوئی محبت سے حکم کے ساتھ چار گھونسے بھی اماں کی طرح لگا دیتا تو وہ مان لیتی تھی۔ ابا دن بھر اسے مارتے پیٹتے اور دن بھر وہ منتظر رہتی کہ اب کی بار مارنے کے بعد ابا اسے کلیجے سے لگائیں گے اور ان کی گود میں منہ چھپا کر وہ رو پڑے گی۔ دن رات رونے کے باوجود اس کی آنکھیں ان آنسوؤں کو سنبھالے بوجھل ہو گئی تھیں جو کسی کے ہمدردی کے بولوں پر ہی بہائے جا سکتے تھے۔

ویسے تو اماں کو بھی ہزار فکروں نے کبھی اتنی فرصت نہیں دی تھی کہ وہ رضیہ کی طرح اپنی بیٹی کے گالوں پر پیار کریں۔ مگر کبھی کبھار ابا کی مار کھانے کے بعد وہ غزل کو سینے سے لگا کر روتی تھیں تو غزل کو بڑا اچھا لگتا ـــ جی چاہتا اماں یوں ہی روتی رہیں۔ اور وہ ان کے سینے سے لگے لگے سوتی رہے۔ لیکن اب تو کوئی بھی ایسا آدمی نہیں رہا تھا۔ ابا تو اس کی طرف صرف دیکھ لیتے تو زمین و آسمان ہلنے لگتا تھا۔ غزل کا جی چاہتا کہ ان سب مارنے پیٹنے والوں کا قیمہ بنا کر چیل کوؤں کو کھلا دے۔ صرف چاند آپا رہ جائیں دنیا میں۔

ہر طرف کی دھتکار سننے کے بعد وہ میلے کپڑوں کے ڈھیر پر جا کر لیٹ جاتی تھی۔ بتول کی موت کے بعد بتول کا حق جائیداد میں سے وصول کرنے پر واحد حسین اور ہمایوں کے درمیان ایک زوردار جھگڑا ہوا تھا۔ اس لئے غزل پر ایوان غزل کا پھاٹک بند ہو چکا تھا۔ دن بھر وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح سارے محلے کی خاک چھانتی پھرتی۔ ـــ رات کو خواب دیکھتی کہ جیسے وہ بھی چاند آپا بن گئی ہے اور وہ لمبے لمبے بالوں والا گویا سعادت زمین پر بیٹھا اسے سجدے کر رہا ہے۔ پھر وہ بھی چاند آپا کی طرح اپنی ساری کا سنہرا بارڈر اس کے گندے ہاتھوں سے چھڑا رہی ہے اور کہہ رہی ہے۔

"ہوش میں آؤ سعادت۔ اتنا مت پیار کرو۔"

پھر ایک لمبی سی سیاہ موٹر آتی اور اسے کوئی تہہ خانے میں دھکیل دیتا۔ پھر

یوں لگتا جیسے وہ راشد ماموں کی گود میں بیٹھی چاکلیٹ کھا رہی ہے اور دلہن ممانی اسے خوب پیار کر رہی ہیں۔ اتنا کہ وہ رو پڑی ہے ـــ روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتیں جب آنکھ کھلتی تو اس کا تکیہ سچ مچ بھیگا ہوتا اور وہ سسکیاں لیتی۔

پھر وہ بڑی دیر تک سوچا کرتی تھی کہ چاند آپا بننے کے لیئے سب سے پہلے تو وائلن بجانا سیکھنا ہوگا۔ اسے نہ تو کتابیں پڑھنا آتا ہے اور نہ ڈراموں میں کام کر سکتی ہے۔ البتہ اس نے چاند آپا سے سنے ہوئے سب گیت اسی ٹیون میں یاد کر لئے تھے۔ ان کی طرح ہنسنا بھی آ گیا تھا۔ جی چاہتا ایک بار پھر چاند آپا مل جائیں تو ان سے یوں چپٹے کہ کبھی نہ چھوڑے۔ ایک بار وہ اماں کے پاس سونے لیٹی تھی تو اس نے اماں کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

"اماں اماں چاند آپا اتنے زور سے کیوں ہنستی ہیں؟"

"اونہہ ـــ" اماں نے کروٹ بدل لی۔

"اماں میں بھی چاند آپا کی طرح ہنسوں گی؟"

"تو مجھے قبر میں بھی چین سے مت سونے دینا۔ اچھا۔"

انھوں نے دانت کچکچا کر کہا اور جانے کیوں رونے لگیں۔

غزل سہم گئی ـــ اماں تو صابن کا جھاگ بن گئیں تھیں۔ ذرا سی ٹھیس لگی اور پھوٹیں۔

"گر چاند آپا بننے کے لئے تو خوب پڑھنا ہوگا۔ ـــ"

اس دن سے وہ صبح ہی اٹھ کر اسکول بھاگنے لگی۔ اور رات کو بڑی دیر تک سلیٹ پر تھوک مل مل کر ہوم ورک کرتی۔

حیدر علی خاں نے چاند سے بالکل ہی قطع تعلق کر لیا تھا۔ کیونکہ انھیں چاند کی سوشل سرگرمیاں قطعی پسند نہ تھیں۔ کئی بار باپ بیٹی میں سخت تکرار ہوئی۔ اس کے بعد چاند کے لئے سو روپیہ مہینہ بھیجنا حیدر علی خاں نے ختم کر دیا۔ یوں بھی حیدر علی خاں نے پریکٹس چھوڑ دی تھی۔ اور کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو چکے تھے۔ وہ تلنگانے کے چھاپہ مار دستوں کے ساتھ سازشوں میں مصروف تھے۔ لیکن ظاہر میں صرف ترقی پسند مصنفین کی مقامی شاخ کے سکریٹری تھے۔ اور اسی کے آفس میں بیٹھے کام کرتے تھے۔ چاند اب اپنے گھر نہیں جاتی تھی۔ اس کی کمیونسٹ ورکر سوتیلی ماں نے حیدر علی خاں کو بالکل اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ اور وہ دونوں اپنے سارے فرض اور دلچسپیاں بھول کر پارٹی کے کاموں میں کھو چکے تھے۔ ان دنوں تلنگانے میں چھاپہ مار دستوں کا بہت زور تھا۔ وہ باقاعدہ فوجی ٹریننگ لے کر نظام کی فوج سے لڑتے تھے۔ کئی جگہ ان دستوں کی قیادت نوجوان لڑکیاں کرتی تھیں۔ وہ لوگ سرکاری فوج سے ہتھیار چھین کر اکھٹے کرتے اور کہیں کہیں تو پورے ضلع پر قبضہ کر لیتے تھے۔ حکومت نے پارٹی پر احتساب عائد کر دیا تھا۔ اس لئے اہم پارٹی ورکر انڈر گراؤنڈ رہتے۔ جو باہر ہوتے وہ ادبی سطح پر ترقی پسند تحریک کے ممبر بن کر کام کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گاؤں میں دیشمکھوں اور جاگیرداروں نے لوٹ کھسوٹ کو اپنا حق بنا لیا تھا۔ گاؤں میں کسی کسان

کی عزت بچی تھی نہ دولت۔ وہ دن دہاڑے کھیتوں پر کام کرنے والی لڑکیوں کو موٹروں میں ڈال کر لے جاتے۔ کھڑی فصلیں کٹوا لیتے۔ اسی لئے پارٹی کی مقبولیت بڑھ رہی تھی۔ خصوصاً مزدور اور کسانوں کا طبقہ پوری طرح پارٹی کے ساتھ تھا۔ وہ پہاڑیوں کے ناقابل عبور راستوں پر دلم کی رہنمائی کرتے تھے اور سرکاری فوجوں کی مخبری کا کام انجام دیتے۔ نظام نے اس طوفان کو روکنے کے لئے بہت سے بندھ باندھے۔ کسانوں کے نوجوان لڑکوں کو ان ہی کے آنگن میں، کھڑے پیڑوں سے لٹکا کر پھانسیاں دی گئیں۔ نوجوان لڑکیوں کو سرکاری سپاہی سب کے سامنے اٹھا کر لے جاتے۔ پورے خاندان کے آگے باغی افراد کو شوٹ کیا جاتا تھا۔ لیکن ان ہی عبرتناک سزاؤں نے عوام میں غم و غصہ کی لہر دوڑا دی تھی۔ جاگیردار اور دیس مکھ اس طوفان سے کانپنے لگے تھے۔

واحد حسین کا بلڈ پریشر بھی بڑھ گیا تھا۔ ان کے لئے یہ بات بڑی پریشان کن تھی کہ خود ان ہی کا داماد اور ایک جاگیردار گھر کا معزز پڑھا لکھا لڑکا ان غنڈوں میں جا ملا تھا اور ان کی راہ نمائی کر رہا تھا۔ غصے کے مارے ان کی حیدر علی خاں سے بات چیت بند تھی۔ کیونکہ کئی بار سرکاری طور پر باز پرس ہو چکی تھی کہ واحد حسین کا اپنے داماد سے کیا تعلق ہے اور حیدر علی خاں کی بیٹی "ایوان غزل" میں کیوں رہتی ہے! حالانکہ چاند اپنے ڈیڈی کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسے میک اپ کے نئے نئے ڈھنگ سیکھنے اور پارٹیوں میں عاشقوں کے گروہوں سے نبٹنے سے ہی فرصت نہ تھی۔ اس نے کبھی بھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ اس کے باپ نے عیش و آرام کی زندگی تج کر ان جھمیلوں میں پڑنا کیوں قبول کیا۔ اور اخباروں میں نہرو اور گاندھی جی کیا چنگھاڑ رہے ہیں۔ البتہ ایک بار جب کسی نے اس کی نزاکت پر چوٹ کر کے کہا کہ وہ تو بڑے مضبوط باپ کی بیٹی ہے، تو اسے احساس ہوا کہ شاید اسے بھی ڈیڈی کے کارناموں پر شان دکھانا چاہیئے۔ سنا ہے وہ غریبوں کی حمایت کر رہے ہیں۔

ان ہی دنوں میڈیکل کالج کی بلڈنگ کا افتتاح کرنے حضور تشریف لائے تو

اسٹوڈنٹس یونین کی پریسیڈنٹ بن کر چاند ایڈریس پڑھنے کھڑی ہوئی۔ حضور دنیا کو بڑی لاپروائی سے، بڑی حقارت سے دیکھتے تھے۔ مگر خوبصورت چہرے کو دیکھتے ہی ریشہ خطمی ہو جانا ان کے خمیر میں شامل تھا۔ بس فوراً چاند کے بارے میں پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ اور انھوں نے اپنے ایک منظورِ نظر سیاہ فام صاحبزادے کے لئے چاند کو منتخب کر لیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب چاند اور سبحان صاحب کا معاشقہ پورے شہر میں مشہور ہو رہا تھا۔ اس لئے واحد حسین نے فیصلہ کر لیا کہ اس رشتے کو قبول کر لیں۔ بھلا اس سے زیادہ عزت افزائی ان کے خاندان کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے کہ چاند شاہی خاندان کی بہو بن جائے۔ اس طرح چاند کے باپ کی خطائیں بھی نظر انداز ہو سکتی تھیں اور واحد حسین کے سوئے ہوئے نصیب جاگ اٹھیں گے۔ یوں بھی شاہی رشتہ کبھی ٹھکرایا نہیں گیا۔ اعلیٰ حضرت کی پسند تو وہ مضبوط بندھن ہوتا تھا جسے وقت اور ذاتی پسند کی کوئی تلوار نہیں کاٹ سکتی تھی۔

یہ سب کچھ جانتے ہوئے چاند نے بڑی لاپروائی سے اس پیغام پر تھوک دیا۔
آخ تھو ـــــــ میں کیوں کرنے لگی ایسی اجاڑ صورتوں سے شادی ـــ"
واحد حسین نے سنا تو تھر تھر کانپنے لگے ـ اب جانے ان کے خاندان پر کیسا عتاب نازل ہوگا!

ایک دن شام کو چاند سج بن کر کہیں جانے کی تیاری میں مصروف تھی کہ ایک کالا سا بڑے بڑے بالوں والا ہندو لڑکا حیدر علی خاں کا خط لے کر آیا چاند کے لئے۔ ایک مدت کے بعد ڈیڈی کا خط پڑھ کر چاند اداس ہو گئی۔ انھوں نے کتنے دکھ سے لکھا تھا کہ اب چاند بڑی ہو گئی ہے اس لئے اپنا حکم بیٹی پر لادنے کا انھیں کوئی حق نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ یہ نہیں چاہتے کہ چاند کی شادی شاہی خاندان میں ہو۔

خط پڑھ کر چاند نے نظریں اٹھائیں تو گھبرا گئی۔ وہ سیاہ فام نوجوان

اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ چند سکینڈ بعد چاند نے گھبرا کے پوچھا ـــ "
"بابا آج کل کہاں ہیں ـــ؟"
"بہت دور ـــ" اس نے اسی محویت کے عالم میں جواب دیا۔
"کیا آپ بھی بابا کے ساتھی ہیں؟"
"ہاں ـــ میں ایک مجسمہ ساز ہوں ـ اپنا کام چھوڑ کر پارٹی میں شریک ہو گیا ہوں لیکن ابھی مجھے آپ کو دیکھ کر خیال آیا کہ مجھے اپنا کام نہیں چھوڑنا چاہیئے۔"
"کیوں ـــــــ" چاند ہنس پڑی ـ اجنبیوں سے خوش اخلاقی برتنے میں وہ ماہر تھی۔
"کیونکہ مجھے خائف پا کر خدا مجسمہ سازی کے فن میں بہت ترقی کر رہا ہے ـــ وہ آپ جیسی حسین شبیہ بنانے لگا۔"

چاند کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ ایسی انوکھی تعریف کرنے والا یہ لاابالی سا مست آنکھوں والا نوجوان جانے کیوں اسے اچانک اچھا لگنے لگا۔
"اچھا اب جاتا ہوں ـ" وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔
"کیوں تھوڑی دیر بیٹھیے نا ـ آپ بابا کے دوست ہیں تو چائے پیئے بغیر نہیں جائیں گے؟"

وہ بیٹھ گیا ـــ پھر وہ بڑے سے پرانی وضع کے ڈرائنگ روم لگی ہوئی تصویریں اور قیمتی سامان دیکھنے لگا۔
"باہر سے آپ کا مکان کتنا خراب لگتا ہے ـ لیکن اندر آ کر معلوم ہوا کہ یہ ایوان ہے اور آپ اس کی غزل ہیں۔"

چاند کو پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا ـــ (سبحان صاحب کہتے تھے ہنستے وقت چاند دوگنی خوبصورت لگتی ہے۔ اسی لئے اسے ڈراموں میں بار بار ہنسایا جاتا تھا ـ اور ہر بار نوجوان زور زور سے تالیاں پیٹتے ونس مور ونس مور کا شور مچاتے تھے)
"آپ پھر کبھی آئیے ـــ" گیٹ تک آ کر چاند نے اسے بڑے پیار سے دیکھا۔

سنا ہے میں عنقریب گرفتار ہونے والا ہوں ۔ اگر بچ گیا تو پھر ایک بار آؤں گا۔
ندا کی مجسمہ سازی کا فن دیکھنے ـــــ
مگر چاند اسے نہیں بھول سکی ـــ جانے کون تھا وہ ـــ کیسا شوخ چنچل ـــ
الکل کرشن کنھیا سا لگتا تھا ـــ اس نے نام بھی تو نہ پوچھا۔
ایک بار کسی نے بتایا کہ حیدر علی خاں پر سے مقدمہ اٹھا لیا گیا اور وہ گھر واپس
گئے ہیں ۔ مگر چاند ان سے ملنے انجمن کے آفس گئی ۔ بابا سے مل کر خوب روئی ۔ پھر
س خط کا ذکر آیا ـــ پھر اس نوجوان کا ۔
" سنجیوا ـــ " حیدر علی خاں نے کہا ـ " آج کل پولیس اس کی تاک میں ہے ۔
وہ کہیں چلا گیا ہے ـــ "
" یہ کیا چھوٹے بچوں کی طرح رو رہی ہو ـــ " حیدر علی خاں نے اس کے
سر پر ہاتھ رکھا ـــ " وہی کرو جو اپنے لئے بہتر سمجھتی ہو ـــ لوگوں کے جال میں مت
پھنس جانا ـــ جاؤ گھر جاؤ ـــ آئندہ مجھ سے ملنے یہاں مت آنا ۔"
بابا اسے چھوڑنے نیچے آئے ۔
" تو کبھی کبھی سنجیوا کو بھیج دیا کیجئے اپنی خیریت کے لئے ۔"
اس نے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا ۔
کئی مہینے بعد چاند راشد ماموں کے ساتھ کسی جلسے سے باہر جا رہی تھی تو
سنجیوا نظر آیا ۔ وہ ہال کے کوریڈور میں کسی آدمی سے بحث میں مصروف تھا ۔ اس
نے چاند پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر اپنی باتوں میں مصروف ہو گیا ۔ چاند آگے بڑھی تو
یوں لگا جیسے پیچھے کچھ رہ گیا ہے ۔ اُسے جانے کیوں اپنی ذلت کا احساس ہونے لگا ۔
آج تک کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ کوئی اسے یوں نظر انداز کر دے ۔
دوسرے دن وہ بابا سے ملنے انجمن کے آفس گئی ۔ ـــ بابا نہیں تھے ۔
کوئی نہیں تھا ـــ وہ واپس جا رہی تھی تو گیٹ پر سنجیوا نظر آیا ۔
" آپ کے بابا کی طبیعت خراب ہے ۔ اس لئے وہ یہاں نہیں آرہے ہیں ۔"

" لیکن آپ کیوں نہیں آئے ـــ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا ۔"
(چاند نے پہلی بار کسی مرد سے اتنے نرم لہجے میں بات کی تھی)
اس نے غور سے سنجیوا کو دیکھا ۔ اس کے لمبے لمبے اُلجھے اُلجھے گھنے بالوں کا ٹوکرا
سا بنا سر پر رکھا تھا ۔ اس کے نقوش بڑے تیکھے تھے ۔ بڑی بڑی منڈی منڈی آنکھوں
میں جانے کیسی کشش تھی کہ چاند اسے بھولتی ہی نہ تھی ۔ وہ بہت ہی معمولی سی پینٹ
شرٹ پہنے تھا ۔ (بابا نے اس دن بتایا تھا کہ وہ بڑے امیر ریڈی خاندان کا
لڑکا ہے اور بہت اچھا مجسمہ ساز ہے)
" وعدہ تو کیا تھا ـــ " اس نے سگریٹ سلگاتے میں کہا ۔
" لیکن زمین پر پڑے ہوئے کاموں سے فرصت نہیں ملتی ـــ آسمان پر چمکنے
والے چاند کو کیسے دیکھیں ۔"
چاند کو ہنسی آگئی ۔ بڑی ادا سے ـــ بڑی نزاکت سے اس نے کہا ۔
" آپ آیئے تو میں زمین پر ہی ہوں گی ـــ مجھے آپ سے آرٹ پر کچھ ڈسکس
کرنا ہے ۔"
" ارے نہیں بھئی ـــ " سنجیوا نے لاپرواہی سے سگریٹ کا کش لیا ۔
" میں آپ جیسی نازک خیال آرٹسٹوں سے بحث نہیں کرتا ۔ میں ٹھہرا بالکل
اجڈ آدمی ۔ پتھر پھوڑنے والا ۔"
چاند کو سنجیوا کی باتیں بہت اچھی لگیں ۔ اور اس نے دوسرے دن اپنی
آرٹ سوسائٹی کے آفس میں سنجیوا کو بڑے اصرار سے بلوایا تاکہ نئے ڈرامے کے
موضوع پر اس سے مشورہ لے سکے ۔
اور پھر اسی دن چاند کے اصرار پر سبحان صاحب نے سنجیوا کو اپنی سوسائٹی
کا ممبر بنا لیا ۔ اس وقت تو سبحان صاحب نے یہی سوچا کہ ایک کمیونسٹ کو
ممبر بنا لینے سے اچھا ہے کہ ذرا نوجوان اس سوسائٹی کی طرف متوجہ ہو جائیں
گے اور ایسے بہروپ پلٹ نوجوان کی بدولت واقعی ڈراموں میں نئے نئے

آئیڈیے پیش کئے جاسکیں گے۔ انھیں ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کالے معمولی حیثیت کے لڑکے کے پیچھے چاند ایسی دیوانی ہوگئی کہ بات بات پر انھیں بھی جھڑک دے۔

چاند کا پیغام واپس ہوا تو بیچ بیچ شاہی عتاب نازل ہوا ــــ مگر واحد حسین پر نہیں ــــ بلکہ حیدر علی خاں پر ــــ ان کی گرفتاری کے وارنٹ نکلے اور وہ مع اپنے گروپ کے انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ بس چاند تو یکبارگی لے کر بیٹھ گئی ــــ بالکل میرابائی کے انداز میں اس نے سفید ساری پہن کر بال کھول لیئے اور سنجیوا کی یاد میں گانے لگی ــــ کون گلی گیو شام بتادے کوئی ــــ چاند کو یوں آئے دن نت نئے سوانگ بھرتے دیکھ کر واحد حسین سوچتے کہ اب تو پانی سر سے اونچا ہوگیا ہے انھیں شروع ہی میں اس کی بیخ کنی کرنی چاہیئے تھی۔ اصل میں چاند کے بگڑنے میں اس کا بھی کیا قصور ہے۔ وقت پر اس کی شادی ہو جاتی تو آج کیوں یہ دن آتا! لیکن راشد کو چاند سے اتنے کام لیئے تھے شادی کیسے کرتے!

آج "ایوانِ غزل" میں مشاعرہ تھا۔ فانی بدایونی شاہی طلبی پر آئے ہوئے تھے۔ واحد حسین جانتے تھے کہ ان کے پاؤں دکن میں نہیں جمنے دیے جائیں گے ــــ مگر اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے ایک مشاعرہ منعقد کر دیا تھا۔ جس میں حسرت موہانی، فانی بدایونی، استاد جلیل مانک پوری، علی اختر اور حیرت بدایونی آنے والے تھے۔

مگر آج لاکھ سر پٹکنے پر بھی ایک مصرعہ موزوں نہ ہوسکا۔ اور مشاعرے میں

تازہ غزل سنا نا ان کی روایت رہی ہے۔

پھر انھوں نے بیاض ایک طرف سرکا کے رکھ دی۔ عینک اتار کے کرتے کے دامن سے صاف کی اور پھر لگا کے چاروں طرف یوں دیکھا جیسے اب دنیا کا رنگ اور ہی نظر آئے گا۔ پہلی نظر رضیہ پر پڑ گئی جو دالان میں ایک کرسی پر کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی بیٹھی تھی۔ پھر وہ اپنی ساس سے کہنے لگی۔

" بی بی قیصر بچاری کا عقد بچا پاشا سے کروا دیجئے نا۔ جہاں اتنی مالن بی وغیرہ چھوکریاں اجالا بچی نے اکھٹی کر لی ہیں۔ اس کی بھی روٹی کا ٹھکانا ہو جائے گا۔

" ہو ہو ــــ کوشش کر کے دیکھو بیگم ــــ" واحد حسین نے فوراً اس بحث میں شرکت کر لی۔

" اوئی تم لوگوں کے دماغ کو کیا ہوا ہے! کوئی بات بھی یاد ہے۔"

بی بی کے کچھ کہنے سے پہلے حسب عادت گوہر پھوپو بیچ میں کود پڑیں۔

" یہ بات تو ایک سال پہلے خود چھوٹے بھائی نے اٹھائی تھی پچھلے سال فوزیہ کی سالگرہ میں انھوں نے قیصر کو دیکھا تھا تو۔"

" اچھا ــــ؟ تو پھر ــــ" رضیہ منہ اٹھائے چھوٹی بچیوں کی طرح ہنسنے لگی۔

" ہوتا کیا ــــ؟" بی بی نے لنگڑی پھوپو سے بات چھینی۔

" یوں ہی مذاق میں احمد میاں نے فاطمہ بیگم سے کہا کہ تمہاری پوتی اب جوان ہوگئی ہے ہمارے سامنے مت لایا کرو۔ ورنہ ہم کسی دن پکڑ کے اس سے نکاح وکاح کر ڈالیں گے۔ یہ سن کر فاطمہ بیگم تو چپ ہو گئیں مگر قیصر بڑے غصے میں آگے بڑھی۔

" ہاتھ تو لگا کے دیکھو مجھے۔ ہاتھ توڑ ڈالوں گی۔ میرے ابا کو ڈرا دھمکا کے اپنا غلام بنا لیا ہوگا۔ میں کسی کے جھانسے میں نہیں آؤں گی ــــ" اس کی باتیں سن کر سب سناٹے میں آگئے۔

وہ تو کہو چھوٹے بھائی بھابی کا لحاظ کر گئے ۔۔۔۔ " گوہر پھوپو نے کہا۔

" ورنہ تم تو جانتے ہو ان بھائیوں کا غصہ۔ اگر فاطمہ بیگم کے سامنے ہی اسے اٹھا کرنے جاتے تو کوئی کیا کر لیتا !"

واحد حسین منہ کھولے پہلی بار قیصر کی خودسری کا یہ قصہ سن رہے تھے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ ایک بار انھیں کہیں قیصر مل جائے تو وہ اسے زبان درازی کا مزہ چکھا دیں۔

" وہ تو کہو ابا لاجی تک یہ بات نہیں پہنچی ورنہ وہ تو سچ مچ احمد بھائی سے اس چھوکری کا منہ کالا کروا کے چھوڑتیں۔"

" اللہ توبہ ۔۔۔۔ کیسی مردار نکلیں یہ دونوں ماں بیٹیاں۔" رضیہ کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ اس نے کبھی ان نیچ ذات عورتوں کی اتنی خودسری نہیں دیکھی تھی۔

" یہ سب قیامت کے آثار ہیں۔ کل محبوب علی کل پیاز کی ڈلی ۔۔۔۔ " گوہر پھوپو نے آہ بھر کر کہا۔

" اب یہی دیکھو کہ چاند کی حرص میں اسے بھی کالج میں پڑھایا جا رہا ہے۔ بھلا ایسی چھوکریوں کو کالج میں داخلہ مل سکتا تھا؟ بس نام لے دیا ہوگا کہ نواب واحد حسین خاں میرے ماموں ہیں اور شرافت جنگ میرے دادا تھے۔ ۔۔۔ "

ہاہاہا ۔۔۔۔ رضیہ کو ہنسی آ گئی لنگڑی پھوپو کی باتوں پر۔ پھر اٹھتے اٹھتے اس نے کہا۔

" مٹی ڈالو ان کمینی عورتوں پر ۔۔۔ میرے سامنے ان کا نام نہ لو۔"

" ہاں بھئی ہمارے گھر میں ان آوارہ عورتوں کا کیا ذکر ۔۔۔ "

واحد حسین نے اچانک اپنی آواز میں تشویش بھر کے کہا۔

" حالات ویسے ہی خراب ہو رہے ہیں۔ تم لوگ کیا جانو کیا ہو رہا ہے ۔۔۔ "

" کیوں کیا ہوا ۔۔۔۔ ؟" بی بی کے ہاتھ سے سروتا چھوٹ گرا۔

" ہوتا کیا ۔۔۔۔ " واحد حسین نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

" سنا ہے نلگنڈہ پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور اس ساری کارروائی میں آپ کے داماد پیش پیش ہیں۔"

" اگے میری ماں ۔۔۔۔ " بی بی نے دل پر ہاتھ رکھا ۔۔۔۔ رضیہ اور لنگڑی پھوپو بھی ساکت ہو گئیں۔

" ادھر یہ ہندوستانیاں انگریزوں کو نکالنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ہندوستان میں کتنے پل توڑ رہے ہیں۔ ریلوں کو آگ لگائی جا رہی ہے۔ میرے کو تو یہ کچھ اچھے آثار نہیں لگتے۔"

" ہو سنا ہے کرپس کا پلان نہرو اور جناح نے واپس لوٹا دیا۔؟"

راشد جانے کہاں اندر کمرے میں بیٹھا تھا مگر اپنے ابا سے بات کرنے باہر آ بیٹھا۔

" مگر ایک بات ہے ابا جان، اگر انگریز چلے گئے تو یہ کانگریسی اور مسلم لیگی نہیں جینے دیں گے! دیکھ لینا نہرو تو وہی روس کی نقل میں کمیونسٹوں کا راج لے آئیں گے یہاں۔"

" ہٹو میاں ۔۔۔۔ کانگریسی اور مسلم لیگی کبھو نہیں بولے کہ جاگیریں ختم کرو۔ مگر یہ کمیونسٹاں تو اپنے دشمن ہیں۔"

یہ سن کر راشد اپنا سر کھجانے لگا۔

" میں ہوتا اپنی فوج کا کمانڈر ان چیف، ایک ہی دن میں سارے غنڈوں کا سر کچل ڈالتا۔"

واحد حسین نے غصے میں مٹھیاں بھینچ کر کہا۔

" آج کل کے نوجوانوں میں عقل ہی نہیں ہے۔ ایک ہم تھے کہ انگریز ریزیڈنٹ کو ہمیشہ اپنی مٹھی میں رکھا۔ کسی کی مجال نہ ہوئی کہ منہ کھولے۔"

واحد حسین کہتے رہے۔ راشد یوں ہی سر جھکائے بیٹھا سنتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ یوں ہی خلا میں نظریں جما کے کہنے لگا۔

" سنجیو ایک دن کہہ رہا تھا کہ فولاد سے ٹکرانے کے لیے آدمی کا کیا جوڑ۔! جانے کون سے کمانڈر ان چیف کی باتیں لئے پھرتے آپ! سنجیو کہتا ہے کہ دیہاتوں میں

چٹانیں اپنی آغوش کھول کر ہمیں چھپا لیتی ہیں اور پہاڑیاں توپ کے دھانے بن کر انھیں اچھالتی ہیں۔ وہ کہتا ہے صدیوں سے آرام کرنے والے ہاتھ اس قوت کا مقابلہ نہیں کرسکتے جو صدیوں سے کام کرتے آئے ہیں۔"

"افوہ —— آپ تو یوں سنجوا کی بات سنا رہے ہیں جیسے خود بھی ہاتھ میں سرخ جھنڈا لے کر دلم ہیں جانے والے ہیں۔"

واحد حسین کی بات پر رضیہ کو ہنسی آگئی۔ راشد بھی کھسیانا ہوگیا۔

"مگر یہ جھوٹ تھوڑی ہے ابا جان ——" راشد نے بڑے دکھ سے کہا۔

"پہلے کبھی سنا تھا کہ کسی دھیر لڑنے بندوق چلائی ہو۔ مگر آج وہ پورے ایک ضلع پر قبضہ کیے بیٹھے ہیں۔ حکومت کر رہے ہیں۔" بات ختم کرکے اس کے چہرے پر بڑی تلخ مایوسی چھاگئی۔

"ہم لوگ گاؤں جاتے ہیں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں تو پتھر توڑنے والی وڈرنیاں اکڑ کے جواب دینے لگی ہیں۔"

راشد کی اس بات پر رضیہ کو ہنسی آگئی۔ کیونکہ اس نے سن رکھا تھا کہ یہ انجینیر لوگ جب ٹور پر جاتے ہیں تو ہر رات ایک وڈرنی ان کے لئے پکڑ کر لائی جاتی ہے۔

لنگڑی پھوپو چولھے کے پاس رات کے کھانے کے لئے جنس تلوانے میں لگی تھیں۔ مگر انھوں نے وڈرنیوں کی بات سنی تو پلٹ آئیں۔

"راشد میاں کیا بول رہے کتنے! وڈرنیاں کیا کر رہی ہیں؟"

"حکومت کر رہی ہیں پھوپو —— قلم ہاتھ میں لے کر کتاباں لکھ رہی ہیں۔"

"چل ہٹ ——" لنگڑی پھوپو کو ہنسنا آتا تو اس وقت وہ یقیناً ہنستیں۔

"وڈرنیاں نہ ہوئیں اجاڑ صورت بیگماں ہوگئیں۔"

"ہو پھوپو بیگماں بن کر پورے گاؤں پر راج کر رہی ہیں۔"

"اچھا تو پھر وہاں پتھر کون پھوڑ رہا ہے ——؟"

"ہماری تقدیریں پھوڑ رہی ہیں گوہر بیگم ——" واحد حسین اب رونے کے قریب تھے۔ شام کو مشاعرہ تھا اور ایک مصرعہ بھی موزوں نہیں ہوا —— پھر ایوان غزل کی صفائی —— فرش کروانا —— کھانے اور چائے کا انتظام۔

"لو تمہارا لے خط ہے رضیہ ——"

راشد نے الٹ پلٹ کر لفافہ رضیہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"خیریت تو ہے؟ تمہارے ابا کا کیا حال ہے؟" لنگڑی پھوپو کو ہر وقت رضیہ کے باپ کے مرنے کا انتظار رہتا تھا کہ جلدی سے اکلوتا داماد راشد تمام جائداد کا مالک بنے۔

"حامد بھائی کا ہے ——" رضیہ جانے کیوں مسکرائے جا رہی تھی۔

"اور تمہارے والد صاحب کا مزاج کیسا ہے؟"

"سنا آپ نے —— وہ جو ہمارے ایک موٹے ٹھوسے سے حامد بھائی ہیں نا؟ ان کی شادی ہو رہی ہے۔" وہ لنگڑی پھوپو کو جواب دینے کے بجائے راشد سے مخاطب ہوئی۔

ہاہاہا —— راشد کو ہنسی آگئی۔

"سچ ——؟" اونگھتے ہوئے واحد حسین اور منہ میں پان لے جاتی ہوئی بی بی بھی ہمہ تن گوش ہوگئیں۔

"لکھا ہے خلوت میں کہیں بات چیت ہو رہی ہے۔ لڑکی والے تین ہزار گھوڑے جوڑے کا وعدہ کر رہے ہیں۔ مگر حامد بھائی چاہتے ہیں کہ ہم لوگ جا کر وہاں کے لوگوں سے ملیں اور اس بات کا اندازہ کر آئیں کہ وہ لوگ واقعی تین ہزار دیں گے یا نہیں!"

"ٹھیک تو لکھا ہے ——" لنگڑی پھوپو نے بی بی کی طرف دیکھ کر ناک سکوڑی۔

"کیا معلوم کوئی فقیر، چپراسی، ارذل وغیرہ ہوں اور دھوکے میں آجائیں بچارے حامد میاں۔"

"چھوڑو جی اس بات کو ——" واحد حسین کھسیا گئے۔

"تو آخر حامد میاں شادی پر پیسے خرچ کرنے اور بیوی کے اخراجات برداشت

کرنے پر تیار ہو ہی گئے۔"

حامد میاں دراصل لاوارث مال تھے۔ اور اپنی کنجوسی کی وجہ سے پورے خاندان میں مشہور تھے۔ خاندان میں کوئی انھیں اپنا بھائی بنانے پر تیار نہیں ہوا۔ میٹرک تک رضیہ کے ابا نے پڑھا دیا۔ اس کے بعد فیس معاف کرا کے آخر گریجویٹ ہو ہی گئے۔ اس کے بعد انھیں کلرکی دلانے میں صرف واحد حسین کی کوششوں کا دخل تھا۔ وہ بھی آبکاری جیسے محکمے میں جہاں حامد میاں کو چاندی بنانے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ لیکن یتیمی کے دھکوں اور دائمی مفلسی کے جھٹکوں نے حامد کو اس حال پر پہنچا دیا تھا کہ ان کے لیے پیسہ ہی دنیا کی سب سے بڑی سچائی تھا۔ پہلے اس لیے وہ بھوکے سوتے تھے کہ کھانے کو کچھ نہ ملتا۔ اور اب اس لیے بھوکے سوتے تھے کہ پیسہ خرچ نہیں کیا جاتا تھا۔ سب ان کا مذاق اڑاتے لیکن وہ ہنس کر ٹال جاتے۔ خاندان میں ان کی کنجوسی کے لطیفے سارے بچوں کو یاد تھے لیکن وہ مذاق کرنے والوں کو ہنس ہنس کر دیکھتے تھے۔ جیسے سوچ رہے ہوں کہ اور تھوڑے دنوں ہنس لو۔ پھر جب میں موٹر میں بیٹھ کر آؤں گا اور تمہارا سگا بھتیجا بن جاؤں گا۔ تب سب کے چہروں سے مسکراہٹ غائب ہو جائے گی۔

ویسے حامد کا کوئی اور کام آ پڑتا تو کوئی پلٹ کر بھی نہ دیکھتا۔ مگر یہ تو شادی کا معاملہ تھا اور وہ بھی ایک شریف کمار ہونہار نوجوان کی شادی جس میں سمدھنوں کو اپنے ناز نخرے دکھانے اور دعوتیں اڑانے کا خوب موقع ملتا ہے۔ ادھر تو لڑکی والے آ کر بھگت کریں گے ادھر حامد میاں پر یہ احسان کہ لو بھئی تمہارے سارے فرائض آخر ہم نے ہی ادا کیے ہیں۔

ایک دم گھر میں ہل چل سی مچ گئی۔

بی بی نے ایک دن سیف میں سے زیوروں کا صندوقچہ نکال کر کھولا۔

سمدھن بن کر جاتے وقت زیور پہننا بہت ضروری ہوتا ہے نا! چاند نے بھی اس شادی میں دلچسپی لی کیوں کہ حامد بھائی کی کنجوسی کی وجہ سے لطف لینے کی خاطر وہ حامد بھائی سے خوب ہنسی مذاق کرتی تھی اور انھوں نے خط میں خاص طور سے تاکید کی تھی کہ چاند بھی سمدھنوں میں شامل ہو جائے تو ذرا حامد میاں کے خاندان کا رعب

پڑ جائے گا۔ اس لیے چاند نے فوراً درزی کو بلا کر بلاؤز کا نیا ڈیزائن سمجھایا۔ اور رضیہ راشد کے ساتھ نئی کنجی وام کی ساری لانے بازار گئی۔

ایک ہفتہ بعد دلہن والوں کے ہاں سے ان لوگوں کو ساتھ لے جانے کے لیے دلہن کا چھوٹا بھائی آیا تو سب کیل کانٹے سے لیس ہو چکے تھے۔ آج تو لنگڑی پھوپو نے بھی کلی دار کرتا اور کھڑا دوپٹہ اتار کے وہ گلابی بنارسی ساری پہن لی تھی جو ان کے جہیز کے کپڑوں میں رکھی ہوئی تھی۔ لنگڑی پھوپو کنواری تھیں۔ اس لئے وہ کنواریوں کا لباس پاجامہ اور کھڑا دوپٹہ ہی پہنتی تھیں لیکن چالیس سال کے قریب جا چکی تھیں، اس لئے خاص خاص موقعوں پر ساری بھی پہن لیتی تھیں۔ اس لباس میں بقول بی بی کے ان کا حسن نکھر آتا تھا۔ آج تو انھوں نے رضیہ کی سیف میں رکھے ہوئے اپنے کچھ زیور بھی نکال کر پہن لیے تھے اور بار بار اپنے سفید اور سیاہ بال ملے ہوئے سر کو ساری سے ڈھانپ رہی تھیں۔ بی بی نے گہری ہری کتان کی ساری پہنی تھی اور بقول شخصے دھڑے کی مستی میں ان کا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ بی بی نے جانے اپنا حسن کہاں محفوظ رکھا تھا کہ اس کی چمک دمک ماند ہی نہیں پڑتی تھی۔ حالانکہ انھوں نے اپنا حسن پہلے بتول اور بشیر کو بانٹا۔ پھر چاند نے اس کے حصے بخرے کیے۔ مگر ان کی ہنسی آج بھی واحد حسین کے لیے ایک کا فرادا کا وہ التفات تھا جو ان سے غزلوں پر غزلیں لکھوائے چلا جاتا۔

پھر لنگڑی پھوپو آئیں اور انھوں نے موقعہ کے لحاظ سے بی بی کو ضروری زیور پہنائے۔ کہیں جاتے وقت بھاوج کا بناؤ سنگھار کرنا نندوں کا حق ہوتا ہے اور لنگڑی پھوپو نے ہمیشہ اس فرض کو خوشی خوشی پورا کیا تھا۔ گلے میں ست لڑا اور چندن ہار اور ہنسلی۔ دسوں انگلیوں میں دس انگوٹھیاں۔ اور سفید رنگوں کے بھر بھر کلائیاں جوڑے کے پیچھے لڑے اور سامنے کنگن سے پھر بھی زیوروں کی صندوقچی جوں کی توں بھری رہی تو لنگڑی پھوپو رضیہ سے کہتی رہیں کہ وہ کچھ اور زیور پہن لے۔ کیوں کہ رضیہ نے صرف جڑاؤ لچھے کے ساتھ چاند بالیاں پہنی تھیں، جو اودی کتان کی ساری پر بڑا غضب ڈھا رہی تھیں اور چاند کی ہدایت تھی کہ اس کے علاوہ اور کوئی بے جوڑ زیور نہ لادنا۔

لہذا رضیہ نے لاکھ اصرار پر بھی کچھ نہ پہنا۔

"بی بی۔ آپ یہ زیوروں کی صندوقچی بھی ہمارے ساتھ لے چلئے نا۔ سب کو دکھا دیں گے۔" غزل کی اس بات پر بی بی کو ہنسی آگئی اور لنگڑی پھوپو نے غصہ میں کہا۔

"اوئی کیا بھولی بچی ہے ماں یہ۔ کیا ہم سب کو دکھانے کے لیے زیور پہن رہے ہیں!"

البتہ چاند نے سخت اصرار کے باوجود کسی زیور کو ہاتھ نہیں لگایا۔ آج اس نے بیگم پارہ کی طرح نیچے گلے اور بغیر آستینوں والا سونے کا بلاؤز پہنا تھا۔ یہ بلاؤز اتنا اونچا تھا کہ اس کی گوری کمر گہری نیلی جارجٹ کی ساری میں سے خوب جھلک رہی تھی اور جب کسی کام کے لیے وہ ذرا سی جھکتی تو غزل فوراً ادھر ادھر دیکھنے لگتی کہ کہیں کھلے گلے میں سے جھانکتے ہوئے چاند آپا کے ننگے بدن پر اس کی نظر نہ پڑ جائے۔ آج چاند پورے دو گھنٹے تک ہیر ڈریسر کے ہاں جا کر بیٹھی تھی۔ اس کے بال سامنے سے تاج کی طرح اوپر چڑھائی چڑھتے چلے گئے تھے اور پھر نیچے کی طرف لہروں اور دائروں کی شکل میں گر رہے تھے، مچل رہے تھے، چاند کے دمکتے ہوئے گالوں کو چھو لینے کے ارادے سے کانپ رہے تھے۔ سفید ننگی کلائیوں پر صرف سیاہ اسٹریپ کی ننھی سی گھڑی تھی۔ اور سیاہ مخمل کی چپل۔ اس سادگی میں چاند ایسی چمک رہی تھی کہ رضیہ تو اچھل پڑی۔

"اللہ چاند تو آج بڑی لائٹ مار رہی ہے۔" وہ چاند سے لپٹ گئی اور چاند نے بڑی مشکل سے اپنے گلے اور گالوں کو رضیہ کے لپ اسٹک والے ہونٹوں سے بچایا۔ چاند باہر آئی تو لنگڑی پھوپو نے آنکھیں کھول کر پہلے تو اسے دیکھا اور پھر مسحور ہو کر بولیں۔

"اوئی اماں یہ کون سا اجڑا فیشن ہے کہ بال سارے منہ پر بکھرے ہیں۔ اور لنڈورے ہاتھ لیے چلی جا رہی ہیں؟" لنگڑی پھوپو کو بھی چاند اس وقت بے حد پیاری لگ رہی تھی مگر وہ اعتراض برائے اعتراض کی شدت سے قائل تھیں۔

فوزیہ کی آپا نے اسے بہت دیر ہوئی تیار کر دیا تھا۔ اس نے مخمل کا سرخ فراک

پہنا تھا۔ سرخ ربن بالوں میں باندھی تھی۔ اور سرخ جوتوں کے پھندوں کو اچھالتی ادھر ادھر اکڑتی پھر رہی تھی۔ آج کیوں کہ خواتین کو جانا تھا۔ لہذا ایک مرد ہونے کی حیثیت سے شاہین نے وہاں جانا پسند نہیں کیا اور اسکول چلا گیا۔ البتہ غزل بار بار فوزیہ کو رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اور پھر اپنے اس پرانے فراک کو دیکھتی۔ جو فوزیہ کا تھا اور بی بی نے رضیہ سے مانگ کر اسے پہنا دیا تھا۔ اسی لیے فوزیہ آج غزل کی ہر نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی اور غزل حسب عادت جب فراک کا کونا دانتوں سے پھاڑتی اور دلہن کے بھائی کو مار کے بھاگتی تھی تو جتا دیتی تھی کہ اس کا فراک پھٹ جائے گا۔

مگر غزل اس وقت دلہن کے بھائی کو ستانے پر تلی ہوئی تھی دلہن کا بھائی گیارہ بارہ سال کا منحنی سا ہونقوں کی صورت لڑکا تھا۔ وہ بیچارہ دالان میں ایک کرسی پر بیٹھا غزل کے مکے اور دھکے محض اس لیے برداشت کر رہا تھا کہ یہ لڑکی غالباً اس کی بہن کی سب سے چہیتی نند بننے والی ہے اس لیے غزل بار بار ٹوپی چھین کر بھاگتی تو وہ کچھ نہ کہتا۔

بی بی نے دلہن کے بھائی کو چائے کے ساتھ گلاب جامن پیسٹری اور بسکٹ کھلائے تو وہ بڑے خلوص سے بولا۔

"آپ لوگوں نے کیوں اتنے پیسے خرچ کر ڈالے۔؟"

اس کی بات پر رضیہ کو ہنسی آگئی اور اس نے آہستہ سے بی بی سے کہا۔"

بی بی" حامد بھائی کا جوڑا اچھا رہے گا۔ جب سالا ہر چیز کی قیمت پر ابھی سے غور کر رہا ہے تو بیوی بھی ایسی ہی ملے گی۔"

یہ سن کر بی بی اس لڑکے کے پاس آ بیٹھی اس کے چہرے پر ایسی کرب آمیز شرافت تھی جیسے وہ کبھی جی بھر کے نہ ہنسا ہو۔ پیٹ بھر کے نہ کھایا ہو اس کے باوجود انتہائی فرماں بردار اور سمجھ دار تھا۔ وہ معمولی سے کاٹن کی بغیر استری والا شیروانی پہنے تھا۔ گھر کا دھلا ہوا میلا سا پاجامہ اور کینوس کے جوتے

ترکی ٹوپی کا پھندنا نہیں تھا۔ آتے ہی اس نے جھک جھک کر سب کو سلام کیے یہاں تک بسم اللہ بی کے بعد جب وہ شاہین کو سلام کرنے کھڑا ہوا تو وہ غزل کے ساتھ ساتھ چاند کو بھی ہنسی آگئی۔

اس نے آتے ہی سب سے بے تکلفی پیدا کرلی اور ہر ایک کو بھائی جان، خالہ جان اور دادی جان کے خطاب بھی دے ڈالے سب جانے کی تیاریوں میں لگے تھے اسی لئے غزل نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا اور کرسیوں پر سے نیچے کود کر دلہن کے بھائی کو اپنے کارنامے دکھانے لگی پھر اس کھیل سے جی بھر گیا تو اس نے مذاق ہی مذاق میں اس دیوانے لڑکے کو دھولیں مارنا شروع کیں۔ اس کی ٹوپی چھین کر بھاگی وہ بیچارہ نہایت اخلاق سے اسے سمجھاتا رہا۔

"اجی ہماری ٹوپی دے کر نکو بھاگو ۔۔ دیکھو آپ کے اماں جان آرئیں:۔

"ہماری امی جان تو مر بھی گئے"۔ اس نے نہایت بے فکری سے جواب دیا اور وہ بدستور اس کی پیٹھ پر دھپ رسید کرتی رہی۔

"اچھا آپ کون سے اسکول جاتے ۔۔؟"

"انو میری فراک پہنے"۔ فوزیہ نے دلہن کے بھائی کو اطلاع دی۔

"ہائیں بری بات ہے۔ ایسا نہیں بولنا۔ دلہن کے بھائی نے فوزیہ کو سمجھایا۔

"کیوں۔ کیوں نہیں بولنا ۔۔۔؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"ذرا دیر کے لیے کسی کے کپڑے مانگ لیے تو کیا ہوا ۔۔۔" اس نے سمجھایا۔ اتنی دیر میں غزل نے اس کی شیروانی پر ایک اور بکٹا مارا اور جو ہنستی ہوئی پیچھے کی طرف بھاگی تو سیڑھیوں پر سے لڑھکتی آنگن میں جاگری ۔۔ پیچھے پیچھے وہ لڑکا بھاگا اور اس نے جلدی سے روتی ہوئی غزل کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگالیا۔

"نکو۔ میری منی۔ رونا نئیں۔ آپ کی آنکھاں کتنی اچھی ہیں نا۔ روئے تو خراب ہو جائیں گی۔

غزل کو منا کر وہ بی بی کے پاس گیا۔

"اب جلدی چلیے نا ہماری آپا نے دوپہر کا کھانا تیار کرلیا ہوگا"۔

"نہیں بھائی۔ ہم وہاں کھانا نہیں کھائیں گے"۔ رضیہ نے کہا۔

"آپ کو کھانا ضرور ہے۔ ہمارے پانچ روپے خرچ ہوگئے ہیں نا۔

"اچھا تو شام کو کھالیں گے۔" بی بی نے جلدی سے کہا کہ اس کا جی نہ دکھے۔

"لیکن آپ لوگ شام تک ہمارے ہاں رہے تو برتن ۔۔!"

"برتن کیا ۔۔۔؟" رضیہ نے گھبرا کے پوچھا۔

"جی ہم حسن کے ہاں سے برتن لائے ہیں انھوں نے کہا ہے کہ چار بجے تک واپس کردو۔

"آپ کی کتنی بہنیں ہیں ۔۔۔؟" اب رضیہ نے ذرا سنجیدگی سے پوچھا۔

"جی دو ہیں۔ بڑی آپا اسکول میں ٹیچر ہیں"۔

"ان ہی کی شادی ہورہی ہے؟"

"جی نہیں ۔۔۔ وہ لڑکا گھبرا گیا ۔۔۔ بڑی آپا کہتی ہیں۔ وہ اب شادی نہیں کریں گی۔ اپنی ساری تنخواہ چھوٹی آپا کے جہیز کے لیے جمع کررہی ہیں۔

"اچھا تو وہی تین ہزار گھوڑے جوڑے کے دے رہی ہیں؟"

"جی ہاں ۔۔ ہمارے بھائی جان نے بھی سات سو روپے جمع کئے ہیں چھوٹی آپا کے لیے۔

"اچھا تو اسی لیے آپ لوگ اتنی جلدی شادی کرنے والے ہیں جہیز وغیرہ سب تیار ہے"

"جی ہاں ۔۔ ہماری اماں جان بولتے چھوٹی آپا کی شادی جلد کردیا نئیں تو انوں بھی بڑی آپا کی طرح بولنے لگیں گی کہ میں شادی نہیں کرتی۔"

خیر سب کاروں میں لدکر چلے تو رضیہ کا دل ان لوگوں سے اچاٹ ہوچکا تھا۔ اور اسے شک تھا کہ ایسے بھٹیچر لوگ ہرگز تین ہزار نقد نہیں دے سکتے۔

وہاں جاکر یہ لوگ ایک چھوٹے سے بے سروسامان صاف ستھرے گھر میں اترے، جہاں نہایت مدقوق مسکین صورت دو خواتین نے ان کا استقبال کیا۔ ایک دلہن کی ماں تھیں اور دوسری بڑی بہن۔ دونوں حد سے زیادہ نحیف و نزار۔ اس لئے فوزیہ اور چاند بہت بور ہوئیں کہ ان کا فیشن اور چک دمک سراہنے والا کوئی نہ تھا۔ ایک دلہن

کی بڑی بہن تھیں۔ تیس پینتیس برس کی سوکھی کانٹا۔ جب کبھی انتہائی ضرورت پر مسکرانا چاہتیں تو یوں لگتا جیسے رونا چاہیں اور رو نہ سکیں۔ دلہن کی ماں تھیں تو یوں ہانپتی کانپتی مسلسل لمبی لمبی سانسیں لیے جا رہی تھیں ـــــ اتنی سنجیدہ فضا کو دیکھ کر غزل تو فوراً اڑوس پڑوس کی اس لونڈھیار میں شامل ہوگئی جو ایسی زرق برق خواتین کو دیکھ کر اکٹھی ہوگئی تھی ۔ اب وہ نہایت بےفکری سے آنگن میں بیٹھی بی بی اور لنگڑی پھوپو کی نقلیں اتار رہی تھی۔ پھر آم کے درخت پر کیریاں دیکھ کر وہ فوراً بندریا کی طرح درخت پر چڑھ گئی یہ دیکھ کر فوزیہ اور دلہن کا چھوٹا بھائی سرور چلانے لگا۔ فوزیہ کو اپنی فراک کے پھٹنے کا ڈر تھا اور سرور کو کیریوں کا۔

"اجی غزل بیگم جھاڑ سے نیچے اترو ـــ یہ آم ہم پارڈی کے ہاتھ بیچ دیئے۔ ایک بھی کم ہوا تو وہ پیسے نہیں دے گا۔"

"چھی ـــ تم لوگ اتنے کنجوس کیوں ہو۔ خود کیوں نہیں کھاتے۔؟"

غزل کو درخت پر چڑھتا دیکھ کر بی بی اور رضیہ بھی گھبرا گئیں۔

"ارے بی بی ابھی کچے پھل ہیں۔ کھاؤ گی تو کھانسی ہو جائے گی۔ دلہن کی اماں نے نہایت رسان سے کہا۔

"اصل میں ہمارے ہاں کسی کو آم پسند نہیں ہیں۔ اس لیے ہم نے اس درخت کی فصل بیچ دی ہے ۔ضائع کرنے سے کیا فائدہ ـــ!"

"جی ہاں ۔ اچھا کیا۔" بی بی نے تائید کی۔

"اری غزل کی بچی ـــ جلدی اتر ۔ آج تیری ٹانگیں توڑ دوں گی۔" نیچے سے لنگڑی پھوپو دانت کٹکٹا رہی تھیں۔

نیچے اتر کر غزل کھانے پر ٹوٹی ـــ اور مرغ سے لے کر شامی کباب تک نگل ڈالے کھانے کے دوران دلہن کی بہن نے گرانی کا مسئلہ چھیڑ کے بتا دیا کہ مرغ پورے دو روپے کا تھا اور کھانے پر دس بارہ روپے خرچ ہو گئے ہیں۔

پھر غزل ان بند کمروں کے معائنے میں مصروف ہو گئی جن میں سارے گھر کا ٹوٹا پھوٹا

سامان سمیٹ کر ان پر میلی چادریں ڈال دی تھیں۔ اس کھٹراگ میں سے وہ ایک تصویروں والی کتاب نکال کر لائی اور اچھے اچھے فوٹو پھاڑ کے کھانے بیٹھ گئی۔ ابھی دو تین فوٹو بھی نہ چبائے تھے کہ سرور آ گیا اور کتاب کی حالت دیکھ کر اسے کسی نے آگ میں جھونک دیا۔

"یہ کیا کر دیا! پورے آٹھ آنے کی کتاب تھی۔"

اس نے کتاب غزل کے ہاتھ سے چھینی تو غزل نے اس کا منہ چڑا دیا۔ "کنجوس مکھی چوس۔"

جب دلہن کی اماں اور بہن دلہن کو لانے اندر گئیں تو لنگڑی پھوپو نے آہستہ سے کہا کہ مجھے تو یہ لوگ تین ہزار نقد دینے والے نظر نہیں آتے۔ اس لیے ان سے جہیز اور نقد رقم کی فہرست لے لینا چاہیے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ بعد میں حیل وحجت کریں اور حامد میاں بیچارے ٹاپتے رہ جائیں۔ دلہن بھی اپنی بہن کی طرح ہڈی چمڑے کا ڈھیر تھی۔ لمبی تاڑ کا جھاڑ ـــ صورت شکل بھی بس کام چلاؤ۔

"جہیز میں ہم دس برتن دیں گے۔ گیارہ جوڑے ـــ جو ساری میں پہنے ہوں۔" چالیس روپے کی ہے۔ "یہ بھی جہیز ہی میں دیں گے۔" دلہن کی بہن نے جہیز کی فہرست کا رعب جمانا شروع کیا۔

"اچھا تو آپ ہمیں جہیز کی فہرست ابھی لکھوا دیجیے۔ اور اگلے جمعہ کو "پاؤں ملیں" کی رسم کر کے گھوڑے جوڑے کے تین ہزار بھی دے دیجیے۔" لنگڑی پھوپو نے بات صاف کر دی۔

"ابھی ـــ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" دلہن کی اماں ہکلانے لگیں۔

"ہم تھوڑا تھوڑا کر کے جہیز جمع کر رہے ہیں۔ لیکن آپ ہماری بات پر یقین کیجیے۔ ہم کوئی ایسے ویسے لوگ نہیں ہیں۔ بچوں کے باپ کا بے وقت انتقال نہ ہوتا تو میں آپ کو لاکھوں کا جہیز دیتی۔" لنگڑی پھوپو نے منہ بنا کر ادھر ادھر دیکھا۔

"اے ذرا پان لانا بھئی۔ پان نہ کھانے سے منہ دکھ رہا ہے۔" بی بی نے جمائی لے کر کہا۔

"ابھی بازار سے منگواتی ہوں۔" دلہن کی ماں نے ساڑی میں اڑسی ہوئی میلی سی کپڑے کی تھیلی میں پیسے تلاش کیے۔

"کیا بتاؤں خالہ جان میں نے پان کھانا چھوڑ دیا ہے۔ جوان لڑکیاں سامنے ہیں۔ کچھ آگے کی بھی سوچنا ہے نا!"

جب وہ لوگ جانے کے لیے اٹھے تو دلہن کی اماں نے پھر جہیز کی فہرست دہرائی۔

"ان کے چچا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ منہ دکھائی میں دولہا کو سونے کی انگوٹھی دیں گے۔ اور ان کی پھوپی لاکٹ دینے والی ہیں۔"

"آپ سے ایک سچی سچی بات کہہ دوں ــــ؟" دلہن کی بہن نے رکتے رکتے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا۔

"ڈیڑھ ہزار روپے تو ہم ابھی دے سکتے ہیں اور باقی ڈیڑھ ہزار روپے میں ہر مہینے سو روپے کرکے ادا کردوں گی۔"

"آپ لوگ ہماری زبان پر یقین کر لیجیے۔ آخر بڑے لوگوں کی زبان ہی سب کچھ ہوتی ہے۔" ان کی اماں گھگھیائیں۔

یہ سن کر سب چونک پڑے۔

"ادھار ــــ؟ ہائے اللہ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ کہیں جوڑے کی رقم بھی ادھار ہوتی ہے ــــ؟" لنگڑی پھوپو نے تنک کر کہا۔

اور پھر آپ کی بیٹی کی تنخواہ کا کیا بھروسہ۔ کل ہی کہیں شادی ہوگئی تو ان کے شوہر کیوں ادا کرنے لگے۔ آپ ہمیں پکے کاغذ پر لکھ کر دے دیں گی کیا ــــ؟"

"میری شادی؟" دلہن کی بڑی بہن کہیں خلا میں گھورنے لگی۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ مجھ سے ؟ میرا مطلب ہے اب میری شادی۔ کیا میں کہیں جا سکتی ہوں ــــ؟"

اس نے گردن اٹھا کر رضیہ سے پوچھا۔ رضیہ نے اس کے سر پر کھلتی ہوئی دھوپ چھاؤں دیکھی۔ اس کے چہرے پر چھایا ہوا شام کا اندھیرا دیکھا اور لاجواب سی ہوگئی جیسے واقعی پکے کاغذ پر لکھوانے کی ضرورت نہ رہی ہو۔

جاتے وقت غزل پھر سرور کے پاس گئی اور اسے دھکا دے کر بولی۔

"کنجوس مکھی چوس ــــ اجاڑ صورت گدھے۔ سور۔ الو۔" پھر اس نے مارنے کو ٹانگ اٹھائی تھی کہ اوپر سے لنگڑی پھوپو کی ٹوٹی ٹانگ کے دھموکے اور دھکے برسنا شروع ہوگئے۔

"اجی تکو مارو خالہ بے ماں کی بچی ہے۔" دلہن کی ماں کو ترس آگیا۔ وہ سارے چہرے پر ناک اور آنسو لیپ کر روں روں کر رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ سرور کی ناک سے خون نکل رہا تھا اور وہ بڑے صبر کے ساتھ نل کے نیچے بیٹھا غزل کو دیکھ رہا تھا۔

کار اسٹارٹ ہونے لگی تو وہ دوڑتا ہوا آیا اور خوشامد بھرے لہجے میں غزل سے پوچھنے لگا۔

"اب تو کبھی میرے کو نہیں ماریں گے نا ــ؟"

جواب میں غزل نے اس کا منہ چڑا دیا۔

جب کار آگے بڑھی تو لنگڑی پھوپو نے کہا۔

"ان کی ذمہ داری کوئی نکو لو۔ یہ لوگ تو پانچ سو دینے والے بھی نظر نہیں آتے ــ"

مگر آتے ہی رضیہ نے حامد بھائی کو خط لکھا۔

"آپ کی سسرال والے بہت بڑے لوگ ہیں۔

وہ تین ہزار ضرور دیں گے۔ اس کی ذمہ داری میں لیتی ہوں۔

اتنی چکا چوند اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔

اسٹیج کے بیچ میں ایک روشنی کے دائرے میں محصور وہ ممانی بیگم کی چوتھی کا دوپٹہ اوڑھے بال کھولے، ایک خاص پوز بنائے ساکت بیٹھی تھی۔ چاند آپا نے جتا دیا تھا کہ پلک بھی جھپکائے تو سارا کام چوپٹ ہو جائے گا۔ حالاں کہ لپ اسٹک لگانے سے اس کے ہونٹوں میں سخت بے چینی سی تھی۔ بڑی بڑی مونچھوں والے ایک مرد نے اس کے چہرے پر جانے کتنے رنگ تھوپ دیئے تھے۔ دوپٹہ کی ٹھنڈی ٹھنڈی کرن لگنے سے اسے ہنسی سی آرہی تھی ـــــ اچانک اسٹیج کی روشنیاں بجھ گئیں اور سامنے والا پردہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ اسٹیج کے ایک کونے میں مائک کے سامنے کھڑی چاند آپا بڑی سریلی آواز میں گا رہی تھیں۔

تیرے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

وہ انگڑائی لینے کے انداز میں جانے ساکت ہو چکی تھی یا ہوا میں مل گئی تھی۔ وہ آنکھوں میں پانی لانے والی تیز روشنی اوپر سے آرہی تھی یا پیچھے سے۔ اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا نیچے ہال میں بھرے ہوئے ہجوم سے وہ ناواقف تھی، جو اسے دیکھ کر مبہوت ہو گیا تھا ـــــ صرف دھند کا ایک بادل تھا یا دل پر لکیر ڈالتی ہوئی چاند آپا کی آواز ـــــ

اسٹیج کا پردہ گر گیا ـــــ روشنیاں بجھ گئیں۔ چاند آپا کے قہقہے اتنے شور میں

صاف پہچانے جا رہے تھے۔ وہ جانے کس کس کی خوشبودار گودوں میں اچھالی جا رہی تھی۔

"آپ تو واقعی قیامت کے فتنے کو آج جانے کہاں سے لے آئیں۔"

"کمال ہو گیا صاحب ـــــ چاند کو آج مان گئے۔"

"تھینک یو ـــــ تھینک یو ـــــ چاند پھولوں کے گل دستے لیتے لیتے تھکی جا رہی تھی۔

ممانی بیگم کے زیور اتارتے وقت اس کا جی دکھ رہا تھا۔ اتنے لوگوں نے اسے پیار کیا۔ مگر چاند آپا نے نہیں ـــــ پھر اس وقت اللہ میاں نے چاند آپا کو حکم دیا کہ وہ غزل سے آکر لپٹ جائیں اور اسے خوب پیار کریں۔ اس وقت غزل کو خوب اکڑنا چاہیئے۔ مگر چاند آپا کے پیار نے اس کی پیاسی روح کو مدہوش سا کر دیا۔

دور اسٹیج کے اندھیرے کونے میں بیٹھے ہوئے ہمایوں نے آج پہلی بار غور کیا کہ غزل کافی خوب صورت ہے۔

باہر نکلنے کے بعد جب غزل ایک ایک سے تعریف اور شاباشی وصول کر رہی تھی تو اچانک کسی نے اوپر اٹھا لیا اور اس کے گال پر زور سے پیار کر کے کہا۔

"تم نے سنا سنجیو ـــــ اس لڑکی کا نام غزل ہے غزل۔"

"اب خدا رحم کرے حیدرآباد کے شاعروں پر۔"

چاند ہنسی کے مارے دوہری ہو گئی۔

"مجھے چھوڑیے ـــــ" اسے جانے کیوں اس آدمی کی گود سے وحشت ہو رہی تھی۔"

"نہیں اب تمہیں نہیں چھوڑیں گے" اس نے اپنے گالوں کے سخت بال پھر غزل کے چہرے سے رگڑے۔

"چھوڑ دیجئے بھائی صاحب اسے" چاند نے سچ مچ برا مان کر کہا۔

"بڑی حسین ہے تمہاری بہن۔ تم تو اس کے سامنے ایک مطلع ہو۔" آرٹسٹ سعادت نے چاند سے کہا۔

"نہیں مقطع ـــــ" کسی نے کہا اور سب ہنس پڑے۔

"اچھا تو خواتین و حضرات۔ آپ سب پر سبز چلئے۔ ایک نئی آرٹسٹ کے آنر میں

دہاں ڈنر ہے

"آپ لوگ جائیے۔ میں ذرا سنجیوا کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

چاند سنجیوا کا ہاتھ پکڑے اسے ڈھکیلتی ہوئی کسی طرف لیے جا رہی تھی۔

اتنی دیر میں بھان صاحب کچھ اور خوب صورت خواتین کو اپنی باہوں میں سمیٹ چکے تھے۔

"آپ چلئے۔" بھان صاحب نے جھک کر بڑے ادب کے ساتھ غزل سے کہا۔

"یہ رات میں کہاں جائے گی۔ سو جائے گی۔" راشد نے کسی قدر ترش رو ہو کر کہا۔

کار میں راشد اور رضیہ بے حد غصے میں بھرے ہوئے تھے۔

کئی بار راشد نے راہ گیروں کو ٹکر دینا چاہی۔ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھی غزل کو وہ دونوں یوں بھولے بیٹھے تھے جیسے غزل آج انھیں اسٹیج پر نظر آئی تھی۔ نہ اب ان کے پاس کار میں ہے۔ کسی کے منہ سے تعریف کا ایک لفظ نہیں نکلا۔ راشد ماموں تو بہت غصے میں بڑبڑاتے جا رہے تھے۔

"سب کے سامنے میں کیسے روک لیتا۔ مگر تم تو سمجھا سکتی تھیں!"

میں کیسے روک لیتی۔ جب سے سنجیوا کو دیکھا تھا وہ تو بے قرار ہوئی جا رہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی دلہن ممانی پلیز اس وقت مجھے مت روکیے۔

"بس تم نے جانے دیا۔ یہ سب تمہارا ہی دلار ہے۔"

"اوئی میرا دلار کیوں ہوتا۔ اللہ اس کے ماموں اور نانا کو سلامت رکھے" رضیہ نے تنک کر کہا۔

"وہ تو دیکھ لینا اسی دھمیر سے شادی کرے گی۔ آخر ہے کس باپ کی بیٹی۔ باپ نے بھی تو ایک ہندو عورت کو ڈال لیا ہے۔ جانے رضیہ کی بات میں کتنا زہر تھا کہ راشد نے جواب تک نہ دیا۔ صرف کار کی اسپیڈ بڑھا دی۔ جیسے کسی دیوار سے ٹکرا کے مرجانا چاہتا ہے۔

"چاند آپا سنجیوا چاچا کے ساتھ گئی ہیں۔" غزل اب سمجھ گئی تھی کہ وہ دونوں چاند سے خفا ہیں۔

"تجھ سے کس نے کہا؟" ماموں نے پلٹ کر پوچھا۔

"ہمیں سنجیوا چاچا روٹھے تھے نا کہ چاند آپا اسٹیج پر کیوں آتی ہیں۔ جبھی تو چاند آپا دوپہر کو رو رہی تھیں۔"

"کیا سنجیوا روز سوسائٹی کے آفس میں آتا ہے؟" ممانی بیگم نے پوچھا۔ اچانک غزل کو احساس ہوا کہ وہ بڑی اہم ہستی بن گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار ماموں اور ممانی اس کی بات سن رہے تھے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ سنجیوا چاچا اور چاند آپا کی سب باتیں انھیں سنا دے تاکہ ماموں چاند آپا کی شادی سنجیوا چاچا سے کر دیں ورنہ وہ۔ ہار کھا کے مرجائیں گی اور یہ بھی سنا دے کہ ایک دن وائلن بجانے والے لوئیس نے چاند آپا سے کچھ کہہ دیا تھا تو سنجیوا سے مار کٹائی ہوئی تھی اس کی۔ اور ایک دن بہت دنوں بعد سنجیوا آیا تو چاند آپا میک اپ روم میں تھیں۔ اور ڈراما شروع ہونے والا تھا۔ مگر وہ سب چھوڑ کر سنجیوا کے ساتھ چلی گئیں۔ پھر بھان صاحب بہت خفا ہوئے۔ انھوں نے چاند کا اسکریٹ اٹھا کر غزل پر پھینک دیا تو غزل کے ساتھ وہاں بیٹھے ہوئے تمام آرٹسٹوں کو ہنسی آگئی تھی۔ غصے میں بھان صاحب ناچے ناچے پھر رہے تھے اور ان کے چکنے سر پر پسینہ موتیوں کی طرح چمک رہا تھا۔

اس نے یہ سب باتیں ممانی بیگم کو بتا دیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ چاند آپا کی ہیرے والی انگوٹھی کہیں گری تھوڑی ہے! انھوں نے زبردستی قسم دے کر وہ انگوٹھی سنجیوا چاچا کو دے دی ہے۔"

صبح ہمایوں نے دیکھا کہ غزل وہی اسٹیج والی کالی شامو کی فراک پہنے اچک اچک کر آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔

"اب یہ فراک واپس کر دے۔ میں تجھے نئی فراک بنوا دوں گا۔"

ہمایوں نے زندگی میں پہلی بار اپنی آواز میں انتہائی حلاوت گھول کر غزل سے کہا۔

"بھان صاحب نے یہ فراک مجھے دے دیا ہے۔" اس نے دلی مسرت سے مژدہ سنایا اور بڑے پیار سے فراک کی چکنی سطح پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"آج تو میں یہی فراک پہن کر اسکول جاؤں گی۔"

اس فراک کو جی بھر کے میلا کرنے کے لیے بے قرار تھی۔ اس لیے کمرے میں جا کر اس نے میلے فرش پر خوب لوٹیں لگائیں تاکہ فراک پر اپنی ملکیت کا احساس مستحکم ہو جائے۔ پھر دانتوں میں دبا کر خوب کھینچا تانی کی۔ اس کے بعد نل کے پاس جا کر فراک پر گرنے والے پانی کے قطروں کا تماشہ دیکھنے لگی۔

اب ہمایوں کو احساس ہوا کہ وہ اپنی سالی کی اس تعلیم یافتہ خوبصورت بیٹی سے خواہ مخواہ بدظن تھا۔ چلو مان لیا کہ وہ خالو پاشا کو کوئی لفٹ ہی نہیں دیتی اور کالج کے لفنگے لونڈوں کے پیچھے گھومتی ہے۔ مگر دل کی اتنی بری نہیں ہے اب یہی دیکھو کہ غزل سے تھوڑا سا کام کروا لیا تو مفت میں ایک فراک مل گئی۔

چنانچہ ایک بار پھر وہ ایوانِ غزل جانے لگا اور گھنٹوں چاند کے پاس بیٹھا

غزل کو اداکاری سکھانے کے مسئلے پر بات چیت کرتا تھا۔

"خالو پاشا غزل میں اداکاری کے بہترین (TALENT) ہیں۔ ہمارے ڈراما کلب کے پریسیڈنٹ بھان صاحب تو کہہ رہے تھے کہ غزل اسٹیج ہی کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اب آپ غزل کو مجھے دے دیجیے۔ میں اسے خوب پرفیکٹ کر دوں گی۔"

"مگر ہمارے مرشدوں میں بچیوں کو اسٹیج پر ــــ"

"بس بس۔ رہنے دیجیے یہ پرانے ہاتاں۔ آپ بھی نانا حضت سے کچھ کم نہیں ہیں۔"

غصہ کے مارے چاند نے اپنے بالوں کی لٹیں کھسوٹ ڈالیں۔" اور ڈر کے مارے ہمایوں سہم گیا۔ واقعی وہ کیا جانے کہ تعلیم یافتہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔

صبح بھان صاحب کی کار میں چاند غزل کو لینے آئی تو ہمایوں کا تاریک گھر اس کے وجود سے منور ہو گیا۔ ہمایوں بدحواسی میں ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ اس نے اپنے کرتے سے کرسیاں صاف کیں۔ بھان صاحب کی کار کا دروازہ کھول کر انھیں اندر لایا اور ایاز کو دو چار گالیاں دے کر دوڑایا کہ ہوٹل سے دو کپ چائے لے آئے۔ مگر دونوں پیالیوں پر رکھے رکھے پپڑی جمتی رہی اور مکھیاں بھنکتی رہیں۔ کیوں کہ چاند اتنی گندی پیالیوں میں بازاری چائے نہیں پیتی تھی اور بھان صاحب کی چائے کا وقت نہ تھا۔ وہ کھڑے رہے اور بار بار گھڑی دیکھے جا رہے تھے۔ اس لیے اندر آ کر سستی سے کپڑے بدلنے پر ہمایوں نے ایک لات غزل کی پیٹھ پر جمائی اور ہاتھ پکڑ کے کار میں لا ٹپکا۔ چوٹ لگنے سے غزل دیر تک روتی رہی۔ اور بار بار ناک سڑ سڑ کرنے پر چاند نے اسے پلٹ کر ڈانٹ دیا

شام کو وہ سب واپس آئے تو چاند نے اکٹھے پچیس روپے ہمایوں کو دیئے۔

"یہ غزل کے آنے جانے کا کرایہ ہے۔"

آج ۲۹ تاریخ تھی اور رجب ٹھنڈا چولہا سلگانے کے لیے بار بار سایا نے اصرار کیا تو ہمایوں نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔ ہمایوں نے آنکھیں پھاڑ کر کبھی روپوں کو دیکھا اور کبھی چاند کو۔

اچھی کاپی کرتا تھا۔ مگر اسے کوئی بھی نہ پوچھتا غزل شان کے مارے اکڑتی پھرتی۔

"رات کہیں چاند آپا نے ایک ہوٹل میں لال لیمن پلایا تھا۔"

"پرسوں میڈیکل کالج میں یہ بڑی پیسٹری میں نے کھائی۔"

"بھائی جان نے کہا ہے کہ وہ میرے لیے ساری لائیں گے۔"

"ساری — ایاز نے تعجب سے پوچھا۔ وہ غزل کی باتوں میں بیٹھا تھوک نگلا کرتا تھا۔ جب سے ابا کی توجہ غزل پر گئی تھی وہ دونوں بھائی ادھر ادھر آوارہ گردی کرتے پھرتے۔

"ہاں — چاند آپا نے ان سے ساری کی فرمائش کی۔ میں نے بھی کی۔ اب میں بھی ناڈیا کی طرح سچ مچ کے گھوڑے پر بیٹھ کر لڑوں گی۔

"پھر تو بھی ناڈیا کی طرح دوزخ میں جلے گی۔ ایاز نے جل کر کہا۔

"کیا — ؟ وہ دھک سے رہ گئی۔ پلاسٹک کی گڑیا اس کے ہاتھ سے چھٹ کر گر پڑی اور وہ پلنگ کے پاند کھسوٹنے لگی۔

اماں کہتی تھیں ناڈیا دوزخ میں جلے گی۔ خوف کے مارے اس کے بدن میں کپکپی سی آگئی مگر ایاز کی وجہ سے ضبط کئے بیٹھی رہی ایک دم ایسا لگا جیسے چاند آپا کی محبت چیل جھپٹ کر لے گئی ہے اور وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ اب دوزخ کا داروغہ ابا کی طرح باہیں پکڑ کے اسے آگ میں ڈھکیلنے آئے گا اور سانپ اپنی زبان کھولے اس کی طرف لپکیں گے۔ وہ اٹھ کر بھاگنے لگی۔ مگر کوئی راستہ نہ ملا۔ پھر ایک سانپ پھن کھول کر آگے بڑھا اور وہ اچھل پڑی۔ ابا نے ایک روپیہ اس کی گود میں پھینکا تھا جو انگارے کی طرح اس کی پنڈلی کو جھلس گیا — پھر ایک اور — پھر ایک اور ابا بڑے موڈ میں روپیہ پر روپیہ اچھال رہے تھے اور وہ چرکوں کی جلن سے رو پڑی

"کیا ہوا — ؟" اس نے پہلی بار ابا کے لہجے میں اتنی مٹھاس محسوس کی۔ ان کے مہربان ہاتھوں میں کتنی گرمی تھی۔ اپنے سینے سے لگا کر انھوں نے اتنی محبت سے پوچھا کہ اگر غزل پہلے سے نہ رو رہی ہوتی تو اب ابا کی اس عنایت پر رو پڑتی۔

یہ واقعی روپے تھے۔

اب آفس سے واپس آنے کے بعد سایا کے نخرے سہنے کے بجائے ہمایوں کا سارا وقت "ایوان غزل" میں گزرنے لگا۔ جب ڈرامے میں چانس کام کرتی تھی اس کے سارے انتظامات وہ سنبھال لیتا۔ آرٹسٹوں کے گھر دوڑا جا رہا ہے۔ ان کے لیے چائے کا انتظام کر رہا ہے۔ غزل کو بار بار کے ڈائیلاگ یاد کروا رہا ہے — ہمایوں نے زندگی میں اتنی کڑواہٹ پی تھی کہ اس کے پاس اپنی بات منوانے کا ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا — مار — یہ نسخہ اس نے ہر اس شخص پر آزمایا جسے مارنے کی قدرت اللہ میاں نے اسے عطا کی تھی۔

بہر حال غزل کے تو نصیب جاگ اٹھے تھے۔ اس کے پاس دو تین نئی فراکیں آگئی تھیں۔ بالکل فوزیہ کی فراکوں کی طرح چمکتی ہوئی۔ اماں کے مرتے ہی اسے ہر طرف سے دھکے ملے تھے۔ مگر اب تو یہ حال تھا کہ رضیہ اپنی سہیلیوں کو غزل کا گانا سنواتی تھی۔ چاند کے سارے دوست اسے اٹھائے اٹھائے پھرتے۔ وہ چاند آپا کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر سوسائٹی کے آفس جایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی لوگ چاہتے تھے کہ غزل ان کے ڈراموں میں کام کرے کیوں کہ اتنی ننھی سی لڑکی اسٹیج کے لیے کہیں نہیں ملتی تھی۔

صرف ایک حسد کی ماری فوزیہ تھی جو ابھی تک اسے وہی ناک ٹپکاتی ندیدی غزل سمجھتی تھی۔ رضیہ، فوزیہ کے سامنے سے بچا ہوا انڈے کا ٹکڑا اور روٹی کا نوالہ دے دیا کرتی تھی۔ اس روٹی کے انتظار میں وہ فوزیہ کو کھاتے دیکھ کر اس کے پاس جا بیٹھتی اور کسی طرح نہیں ہٹتی تھی۔

اب تو اس نے مارے تہذیب کے نانا سے لے کر شاہین تک کو آپ سے مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بڑی فیاضی کے ساتھ شاہین کو اپنے چاکلیٹ کھلاتی تھی۔ تحفوں کا کوئی شمار تھوڑی تھا۔ ٹافی کے ڈبے — کھلونے — فراکیں اور گڑیاں۔

ایاز اور شہزاد حسد کے مارے مرے جاتے تھے۔ ایاز بھی نکمی گانوں کی بڑی

ابا کے بار بار پوچھنے پر بھی وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"تو پھر کیوں موت آ رہی ہے ___؟" وہ چلانے لگے۔

"میں ڈراموں میں کام نہیں کروں گی۔ فرشتے مجھے دوزخ میں ڈال دیں گے۔"

"کیا ___؟" ابا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"اماں کہتی تھیں کہ ناٹک یا دوزخ میں جائے گی۔"

"تمہاری اور تمہاری اماں کی ___" ابا نے ایک عام سی گالی دی۔

"تم دونوں نے ہمیشہ وہی کام کیا جس سے مجھے تکلیف پہنچے۔ بیچاری چاند نے چار پیسے کی صورت پیدا کر دی ہے تو اب تیرے نخرے بڑھنے لگے ___ سالی فاقے کرا دوں گا۔ اگر کچھ چیں میں کی تو ___" دوسرے دن رضیہ نے یہ بات سنی تو خوب ہنسی۔

"اری تو نے اور کون سے اچھے کام کئے ہیں جو دوزخ سے بچ جائے گی! ایک دن اس نے چاند آپا سے بھی یہ بات کہنا چاہی مگر وہ اپنے آپے ہی میں نہ تھیں۔ نہ جانے کس بات پر اس دن ہمایوں اور چاند کے درمیان چل گئی تھی۔

"وہ حقے کی صورت بڈھا کھوسٹ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے!"

چاند کا غصے کے مارے برا حال تھا اور وہ خواہ مخواہ الماری میں سے کپڑے نکال نکال کر چاروں طرف پھینک رہی تھی۔

"ہونہہ مجھ سے اظہار عشق کرنے چلا ہے پہلے مرکی نالے میں منہ دھو آئے۔"

رضیہ بڑی شرمندہ سی ہو کر اسے چپ کرانے میں لگی ہوئی تھی۔

"اب چپ بیٹھو جی۔ تمہارے ماموں سن لیں گے۔"

دالان میں کھڑی ہوئی غزل آنکھیں پھاڑے چاند آپا کو تک رہی تھی۔ اس وقت ان کے کٹے ہوئے بال سارے چہرے پر بکھر گئے تھے اور منہ چولھے میں دہے ہوئے لوہے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

"چاند آپا ہم آ گئے ___" غزل نے بڑے ناز سے اٹھلا کر اپنی آمد کی خوش خبری سنائی تاکہ وہ غصہ بھول کر مسکرانے لگیں۔ مگر غزل کو دیکھ کر تو چاند کو پھر کسی نے انگاروں

میں ڈھکیل دیا۔

"اسی چھوکری کو گل پر لگا کے آگے بڑھ رہا تھا۔ چل نکل۔ جا اپنے باپ کے پاس" انھوں نے باہیں پکڑ کے غزل کو باہر ڈھکیل دیا۔

"خبردار ___ پھر میرے کمرے میں پاؤں رکھا تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

غزل کا کلیجہ پھٹ گیا۔ اس سے بھی زیادہ کڑے بول وہ ہنس ہنس کر سہہ جاتی تھی۔ کمرے سے ڈھکیلنا بھی کوئی ایسی بری بات نہ تھی۔ مگر اس وقت غزل کو یوں لگا جیسے چاند آپا کا غصہ وہ بالکل برداشت نہیں کر سکے گی۔ جیسے پہلی بار اس کی ذلت ہوئی ہو۔ پھپھوزاد شاہین اور چغل خور فوزیہ دونوں کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اور کبھی کبھی ہنس رہے تھے۔ دالان کا ستون تھامے وہ یوں رو رہی تھی کہ اماں کی موت پر بھی نہ روئی ہو گی۔

"جب سے ابا جان نے اس پھٹیچر آرٹسٹ سے ملنے کو منع کیا ہے نا اس کی یہی حالت ہو گئی ہے۔" اپنے کمرے میں رضیہ لنگڑی پھوپو سے کہہ رہی تھی۔ بیس برس کی ہو گئی اب اس کی شادی کہیں نہ کہیں کر دو۔ نہیں تو ایسے ہی دھیڑوں چاروں میں جا ملے گی لنگڑی پھوپو اپنی پھٹے ڈھول جیسی آواز کو دبا کر کہہ رہی تھیں۔

"میں بھی تو یہی کہتی ہوں۔ مگر زبردستی کوئی کیسے کرے گا۔؟"

"اللہ میاں" چاند آپا کو مر جانے دو۔ اماں کی طرح ان کی بھی قبر بنے۔ اللہ میاں کوئی بھی چاند آپا سے شادی نکو کرو۔"

بہت دنوں بعد غزل کو آج کوسنے کا موقع ملا تھا۔

"چپ چپ ___ اجاڑ صورت دونوں وقت ملتے کیوں کالی زبان نکال رہی ہے؟" بی بی نے نماز کی چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد غزل یتیموں کی سی صورت لیے سب کا منہ تکتی پھرتی کہ کوئی اس پر ترس کھائے۔ مگر اپنے اپنے کاموں میں کسے فرصت تھی کہ اس کی تنہائی پر غور کرتا۔ فوزیہ تو اپنے آپ کو بے حد سگھڑ اور اچھی بچی سمجھتی تھی۔ اس لیے الگ تھلگ اپنی سہیلیوں

کے ساتھ کھیلتی اور غزل کو کسی بھی کھیل میں شریک نہیں کرتی تھی۔ شاہین کو تو اس کے گندے کپڑے اور گندی عادتوں سے بے حد نفرت تھی۔ وہ کبھی شاہین کا گلاس اٹھا لیتی تو شاہین اسے صابن سے دھوتا تھا۔ ایک دن شاہین سفید قمیص، سفید نیکر اور سفید جوتے پہن کر ٹینس کھیلنے جا رہا تھا تو غزل نے اس کی قمیص کو ہاتھ لگا دیا۔ بس غصے کے مارے وہ سارے گھر میں ناچتا پھرا اور وہ قمیص بدل کر باہر گیا۔ ایسے نک چڑھے لڑکے سے کون بات کرتا!

ہمایوں کو اس کی صورت ہی سے نفرت ہو گئی تھی۔ سایا کو بھی اس سے جنم جنم کا بیر تھا۔ جب تک بتول زندہ رہی غزل خوب من مانی شرارتیں کر کے سایا کو ستاتی تھی۔ مگر جب سے ہمایوں نے سایا کو گھر کی نائب صدارت سونپی تھی وہ سایا کے سینے پر مونگ دلتی تھی۔ گھر کی اس بدانتظامی نے ایاز اور شہزاد کو اور شیر کر دیا تھا۔ کئی بار شہزاد گھر سے کوئی چیز لے کر بھاگا اور ہمایوں اسے ڈھونڈ ڈھانڈ کر واپس لے آیا۔ پھر ایک بار وہ ہمایوں کی جیب سے پوری تنخواہ لے کر بھاگا اور کئی مہینے کے بعد اس کا بمبئی کے کسی پولیس اسٹیشن سے خط آیا کہ اگر سو روپے فوراً نہ بھیجے تو وہ پانچ مہینے تک جیل میں سڑے گا۔

"سڑنے دو سالے کو۔ وہ اسی طرح ٹھیک ہوگا۔ دماغ کے سب کیڑے جھڑ جائیں گے۔" ہمایوں نے لاپروائی سے کہا۔

شہزاد کے ٹھیک ہونے کی امید سے غزل بھی خوش ہو گئی۔ کیوں کہ لوگوں کو اس کے بھائیوں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ نانا حشمت اور راشد ماموں اکثر یہی کہتے تھے کہ ایاز اور شہزاد آخر کیسے ٹھیک ہوں گے۔!

اب صرف ایاز رہ گیا تھا۔ وہ بھی صرف کھانے کے وقت گھر آتا تھا اور پھر اپنے کسی دوست کے ہاں پڑھنے چلا جاتا تھا۔ کئی بار بی بی نے اسے اپنے پاس رکھنے کو بلایا مگر وہ راضی نہیں ہوا۔ میں کیوں کسی کے گھر رہوں۔ میں تو خوب پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں گا۔ تو جا۔ ایوانِ غزل" کے جھوٹے ٹکڑے کھانے۔ وہ غزل سے کہتا تھا۔

اب اس نے غزل کی رکابی میں سے بوٹیاں چھیننا اور اسے مارنا بھی چھوڑ دیا تھا بلکہ وہ تو اس کی ہر بات کا خیال رکھتا تھا۔ ابا کی ہر زیادتی خاموشی سے سہہ لیتا تھا۔ یہاں تک کہ سایا کی گالیوں پر اس سے لڑنا بھی ایاز نے چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن ایاز نے ہمایوں سے اسکول کی فیس مانگی۔ لیکن ہمایوں کا موڈ اس دن ٹھیک نہ تھا۔ وہ صبح سے اپنی سسرال کے ہر ہر فرد کو گالیاں دے رہا تھا لیکن ایاز کو غزل کی طرح وقت اور مصلحت کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمایوں نے اس کی سب کتابیں پھاڑ کر پھینک دیں اور ایاز کو مارتے مارتے خود نڈھال ہو کر پڑ گیا۔ اس دن غزل کو بڑی ہنسی آئی۔ ابا آفس چلے گئے تو اس نے ایاز کو خوب چڑایا۔

"اجو بھائی، اور مانگو اسکول کی فیس۔"

"اگر اس وقت اماں ہوتیں تو تجھے مزہ چکھاتا۔"

"اجو بھائی! بی اے پاس کرو گے ___ ؟"

"ابے سالی تجھے کر کے تیار دوں گا۔ اس نے جان کاؤس کے انداز میں ہاتھ ہلا کے کہا اور پھٹی ہوئی کتابوں کے ورق جوڑنے لگا۔ اب غزل بارھویں سال میں آگئی تھی۔ اور اس قابل ہو گئی تھی کہ اپنے بالوں میں خود کنگھی کر لے۔ سوئی میں دھاگہ پرو کے ابا کا پھٹا ہوا پاجامہ سی دے۔ سایا کی مدد کے بغیر چائے بنا لے۔ چولھا سلگا لے۔ بلکہ اس کا تو یہ بھی جی چاہتا تھا کہ سایا سے آٹا چھین کر خود روٹی پکانے بیٹھ جائے۔ اور فوزیہ کی نقل میں فریم پر کپڑا چڑھا کر پھول بنائے۔ فوزیہ تو آفت کی پرکالہ نکلی۔ ایک سے ایک خوب صورت پھول کاڑھ کے راشد اور شاہین کے غلافوں پر دیتی تھی۔ لنگڑی پھوپو کی سوئی میں دھاگہ پرو دیتی۔ کوئی مہمان آجاتا تھا تو رضیہ اسی سے چائے بنواتی تھیں۔ ادھر اسکول کی رپورٹ آتی تو ہمیشہ شاہین پڑھ کر سناتا کہ فوزیہ اپنی کلاس میں فرسٹ آئی ہے۔ جوں جوں فوزیہ کا قد بڑھتا گیا۔ رضیہ کا احتساب بھی اس کے اوپر بڑھ رہا تھا۔ اب وہ ٹانگیں کھلی فراکیں پہننے کی بجائے، تنگ پاجامہ، کار چوبی، واسکٹ اور اس کے اوپر کامدانی کی ٹوپی اوڑھتی تھی۔ کبھی ٹوپی کی بجائے کھڑا دوپٹہ پہن

لیتی۔ رضیہ کہتی تھی کہ میں اپنی بیٹی کو آج کل کے رنگ میں نہیں رنگوں گی ـــ اس کا مطلب صاف صاف یہ ہوتا کہ وہ اپنی نندوں کی بیٹیوں جیسی آزادی اپنی بیٹی کو دینا نہیں چاہتی۔ رضیہ کی بات پر بی بی سوچتیں۔ چاند کو یہ آزادی کس لئے دی گئی! تاکہ راشد اپنے دوستوں کا حلقہ وسیع کر سکے۔ اگر راشد سختی کرتا تو کیا چاند اتنی جرأت کر سکتی تھی۔ اور اب جب گھر میں چاند کی بدولت دولت کی ریل پیل تھی۔ رضیہ اپنی بیٹی کو اس آزادی سے بچانا چاہتی ہے۔

فوزیہ کی دوستی اب غزل سے برائے نام تھی۔ کیوں کہ فوزیہ بڑی مغرور تھی۔ اسے اپنی صورت شکل اور دولت کے علاوہ اپنے کردار کی بلندی کا بھی ابھی سے احساس تھا اگر اسے مذاق میں بھی کوئی گندی بچی کہہ دیتا تو وہ گھنٹوں روتی۔ رضیہ نے چاند اور غزل کی مثالیں دے کر اسے سمجھا دیا تھا کہ بے پردگی اور ناچنا گانا لڑکیوں کے لیے کتنی بری بات ہے۔ اس لیے وہ بات بات پر ناک سکوڑ کے اپنی ماں کی طرح بڑے طنز کے ساتھ بات کرتی تھی۔

"اوئی تم ابھی تک چھٹی کلاس میں ہو! میں تو اب ناتھ میں آجاؤں گی۔ میں تو مسز ریڈی کے ہاں جا کر کپڑوں کی کٹنگ سیکھ رہی ہوں۔

ہائے اللہ، تمہیں ابھی تک چائے بنانی نہیں آتی! میں نے تو پرسوں پڈنگ بنائی تھی۔ ڈیڈی نے مجھے دس روپے انعام دیا تھا"

"مجھے تو بچپن کے دن بھلا نہ دینا" والا گیت پورا یاد ہو گیا ہے۔ غزل اترا کے کہتی:

امی تو مجھے گانے نہیں دیتیں۔ امی کہتی ہیں جو لڑکیاں گانا گاتی ہیں۔ وہ آوارہ ہو جاتی ہیں۔

"آوارہ کیا ـــ؟ غزل تعجب سے پوچھتی۔

"میں کیا جانوں ـــ بس امی کہتی ہیں۔

"چل جھوٹی تجھے گانا نہیں آتا بول کر مجھ سے جلتی ہے تو ـــ"

"اچھا چل امی سے پوچھیں گے؟"

نکو میں نہیں جاتی ـــ" غزل اپنا ہاتھ چھڑا لیتی۔ کیوں کہ ممانی بیگم کے پاس جب بھی جاتی وہ ضرور جلی کٹی نصیحتوں کا ایک پلندہ اسے تھما دیتی تھیں۔

اس لیے وہ چاند آپا کے کمرے میں جا کر ریڈیو سنا کرتی۔ اس کمرے میں آکر اسے بڑا سکون ملتا تھا۔ لوگوں کی بے مروتی کی تلوار اس کے دل سے محو ہو جاتی تھی۔ حالاں کہ اب تو چاند آپا بھی اس پر کوئی خاص توجہ نہ دیتی تھیں۔ بی بی بھی یہی چاہتیں کہ وہ کم سے کم یہاں آئے کیوں کہ انھیں رضیہ کا نفرت بھرا برتاؤ غزل کے ساتھ پسند نہ تھا۔ اس لیے غزل آتی تو وہ کسی نہ کسی بہانے اسے پھر گھر لوٹا دیتی تھیں۔ یوں بھی آج کل گھر کا ماحول درہم برہم تھا۔ راشد کو ایک منٹ کے لیے گھر میں ٹکنا محال تھا ـــ واحد حسین بھی دن رات دوستوں میں گھرے بیٹھے سیاسی حالات پر تبصرہ کیے جاتے تھے۔

سنا تھا کہ انگریز اپنا بستر بوریا سمیٹ رہے تھے۔ ایسے وقت ریاستوں میں بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی کیوں کہ اتحاد المسلمین حیدر آباد کے الحاق کے حق میں نہ تھی اور نظام کو اپنی گدی نیچے سے کھسکتی نظر آرہی تھی۔ ادھر نہرو سوشلزم کے حامی تھے۔ اس لیے کانگریس راج میں کیا زمین داری اور جاگیر داری باقی رہ سکتی تھی؟ سب یہی سوچ رہے تھے ـــ

ماؤنٹ بیٹن دہلی میں تھا۔ اس کے باوجود اس نے واحد حسین، راشد اور تمام ہندوستان کے نوابوں جاگیرداروں کا چین و سکون جناح اور نہرو کو بانٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"ایوانِ غزل" کے وسیع ہال میں آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے واحد حسین لیٹے تھے ـــ ان کے سامنے بیچ والے دروازے کے اوپر قلی قطب شاہ کا بڑا سا رنگین فوٹو ٹنگا ہوا تھا ـــ کمرے میں اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ مگر سب گم سم تھے اور ریڈیو پر اچاریہ کرپلانی، لیاقت علی خاں، پنڈت نہرو اور جناح کی وہ تقریریں سن رہے تھے جو ہندوستان کے چالیس کروڑ عوام کی قسمت کا فیصلہ کر رہی تھیں۔

واحد حسین نے آنکھیں کھول کر اوپر لگے ہوئے قلی قطب شاہ کے فوٹو کو دیکھا اور اس کے مقابل سنہرے فریم میں لگا ہوا قدِ آدم فوٹو عثمان علی خاں کا تھا وہ سلطنت آصفیہ کو ایک کتاب کی طرح سینے سے لگائے کھڑے تھے واحد حسین نے دیکھا قلی قطب شاہ کی آنکھوں میں بڑا سکون تھا۔ جیسے اقلیم سخن کا یہ شہنشاہ بڑے اطمینان سے بیٹھا کسی غزل کی تلاش میں ہو۔ یا ممکن ہے وہ کہہ رہے ہوں کہ کس طرح اس نے گول کنڈے کے اوپر کھڑے ہو کر چاروں طرف پھیلے ہوئے جنگل میں ایک حسین شہر کے خواب دیکھے اور پھر موسی ندی کے آس پاس اس نے اپنے اس خواب کے جال بننا شروع کر دیئے اس نے ایک باغ کی طرح بھاگ متی کے رہنے کے لیے ایک شہر بسایا۔ اس میں کنول کے پھولوں کی طرح جگہ جگہ خوب صورت عمارتیں بنوائیں۔ جن میں تہذیب و ثقافت کے چراغ جل رہے تھے ـــ اردو کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اور دیئے سے دیئے روشن ہوتے جاتے تھے ـــ یا ممکن ہے وہ اپنی کسی محبوبہ سے کہہ رہا ہو کہ جلدی سے

اٹھ کر جشن طرب منعقد کرو کیوں کہ وقت کم ہے۔ ـــ ادھر ـــ چند صدیوں کی پہاڑیوں کے پیچھے سے وقت کے قافلے بڑھتے چلے آرہے ہیں ـــ کچھ دیر بعد لٹیرے یہاں ٹوٹ پڑیں گے۔ اور پھر گول کنڈے کے ملبے تلے لوگ ہماری کہانیاں ڈھونڈنے آئیں گے اور ہماری عظمت کے گرے پڑے ذروں کو نایاب ہیرا سمجھ کر لے جائیں گے ـــ پھر یہ ہیرا کسی ملکہ کے تاج پر جگمگا کر ہمیشہ وہاں سورج کی روشنی قائم رکھے گا ـــ

یہ سوچ کر واحد حسین کو بڑا اطمینان ہوا کہ اس کمرے میں اب عثمان علی خاں پورے جاہ و جلال کے ساتھ موجود ہیں ـــ قلی قطب شاہ خواہ مخواہ اندیشوں میں مبتلا ہیں ـــ لٹیروں کا قافلہ اب یہاں سے بہت دور چلا گیا ہے ـ سیکڑوں میل دور ـــ دہلی پھر ایک بار اپنا چولا بدل رہی تھی ـــ

اور اس کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ریڈیو ہر طرف پھیلا رہا تھا۔ صوفے پر نیم دراز آنکھیں بند کیے کیے واحد حسین نے سوچا کہ اب وقت آگیا ہے جب ہمارے اوپر کسی ریذیڈنٹ کی مرضی نہیں چلے گی۔ اب سلطنت آصفیہ اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرے گی ـــ جانے دہلی کا شہنشاہ اب کون ہو گا۔ نہرو یا گاندھی ـــ اور شہنشاہ کا لباس تو یقیناً وہی رام اور کرشن والا ہو گا ہی۔ تخت طاؤس آگرے سے اٹھا لائیں گے۔ شاید نہرو بھی اکبر اعظم کے نقش قدم پر چلیں ـــ لیکن سردار پٹیل تو رام راجیہ کے قائل تھے ـــ اللہ کی شان ـــ پورے ایک ہزار سال بعد پھر آریاؤں کا زمانہ لوٹ رہا تھا ـــ کوروں اور پانڈوں میں قسمت آزمائی تھی ـــ جانے کس کی جیت ہو گی ـــ

واحد حسین تو چاہتے تھے کہ کسی طرح اعلیٰ حضرت اس وقت دہلی پر چڑھائی کر کے پورے ہندوستان کی باگ ڈور سنبھال لیں۔ اور ہر جگہ خاندان آصفیہ کا بول بالا ہو جائے ـــ ۔

بس یہی ایک راستہ تھا جس میں واجد علی شاہ کے ورثہ دولت آصف جاہی کے خاندان کا وقار محفوظ ہو سکتا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ جب بھی اس بات کا ذکر کرتے راشد جھنجھلا جاتا۔

"آپ چپ بیٹھ کر تماشا دیکھو ابا جان!"

"تو اس طرح ہم سب کا خاتمہ بالخیر ہوگا"

"ایوانِ غزل" میں بیٹھا راشد کسی سے بحث میں مصروف تھا۔

"اجی راجہ! آپ کا کیا ہے۔ چت بھی اپنی پٹ بھی اپنی۔ جاگیریں گئیں تو حکومت کوئی بڑا عہدہ دیدے گی۔ اب آپ دلی فوراً جائیں۔ سنا ہے وہاں خوب منسٹریاں بٹ رہی ہیں۔"

"کیا لگاتے راشد نواب" علیشم نے بیزاری سے کہا۔

"اجی حضرت آپ بڑے آدمیوں کا کیا ہے۔ جاگیریں جائیں گی تو بڑے عہدے مل جائیں گے۔ مصیبت تو ہم نیچ ذات کے ہندوؤں کی ہے۔ سنا ہے دلی میں تو رام راجیہ قائم ہوگا۔" علیشم بڑی اُداسی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

"اجی نہیں، اب تو آپ ہی کا راج ہوگا" راشد نے بڑے طنز کے ساتھ کہا۔

"نہرو تو سوشلزم کے قائل ہیں۔ مذہب وزہب سب ختم۔ مہتر، چمار، مسلمان، برہمن سب ایک ذات کہلائیں گے"

اندر دالان میں کرسی پر لیٹے ہوئے واجد حسین ارشد کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کے کانوں میں دل دھڑک رہا تھا، اور بلڈ پریشر اچانک ہائی ہو چکا تھا۔

"جائیے جناب!۔ اب آپ سب دہلی تشریف لے جائیے" راشد علیشم سے کہہ رہا تھا۔ "آپ کے ساتھ سلطنت آصفیہ میں انصاف نہیں ہوا۔ اب آپ دہلی کے دربار میں نورتنوں میں شمار ہوں گے۔ اب ہم بھی اپنی ایک خود مختار حکومت بنائیں گے جس میں دخل دینے کا حق کسی انگریز کے بچے کو نہیں ہوگا۔"

واجد حسین مسکرا پڑے۔ جیسے سچ مچ ان کے بیٹے نے سلطنت آصفیہ کا تاج اٹھا کر اپنے سر پہ رکھ لیا ہو۔

اب دیکھنا کہ یہ سارے "ہندوستانیاں" جو حیدرآباد کو اشرفیوں

کا پیڑ سمجھ کے ہلانے آجاتے تھے۔ رفتہ رفتہ غائب ہو جائیں گے۔ کیوں کہ اب ان کے ہاں بھی کوئی اکبر اعظم دہلی کے تخت پر بیٹھ کر ہندو اور مسلمان کو ایک گھاٹ پانی پلائے گا۔ اب وہاں آئے دن ہوتے والے ہندو مسلم فساد ختم ہو جائیں گے۔

ہندوستانیوں کے اس ٹھاٹ کے تصور ہی سے واجد حسین کے منہ میں پانی بھر آیا۔ چلتے چلتے انگریز سے ایک تگڑا اثر ڈلوایا جائے کہ راشد کو کہیں کوئی بڑا سا عہدہ مل جائے۔

بھئی اپن کو تو آم کھانے سے مطلب ہے ——

ہاں ٹھیک ہے —— وقت کا انتظار کرنا چاہیئے ——

اندر کمرے میں راشد اور علیشم اچانک چپ ہو گئے تھے۔ جانے انہیں کون سا خطرہ سامنے نظر آرہا تھا —— اور اندر کمرے میں چاند آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی۔

جھٹپٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا
صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

کیا شام ہو گئی ——؟

واجد حسین نے چونک کر سوچا۔ ہاں —— ڈھلتے سورج کا پیلا پن ان کے بالوں پر بکھر چکا ہے۔ جوانی کی وہ گرمی ختم ہو چکی ہے جس کی حدت میں تپ کر انہوں نے چودہ بیاضیں سیاہ کر ڈالی ہیں۔ چاند، غزل اور شاہین —— ننھے ننھے ستاروں کی طرح نہیں نہے ہیں اور ان سے کہہ رہے ہیں —— رات آرہی ہے —— رات آرہی ہے۔

صبح ہوئی تو راشد جانے کس ضروری کام سے ورنگل چلا گیا تھا —— حامد کی شادی ہو چکی تھی اس لیے رضیہ بڑی مصروف تھی۔ بی بی کے سامنے چمکیلے روپہلے رنگین کپڑے بکھرے ہوئے تھے —— ناشتے سے فارغ ہو کر سردیوں کی دھوپ کھانے واجد حسین آنگن میں کرسیاں تلے کرسی گھسیٹ لائے تو پاس ہی لنگڑی پھوپھو بھی آبیٹھیں۔ لنگڑی پھوپھو کا ایک زمانے سے اصرار تھا کہ گھر میں کچھ لونڈیاں چھوکریاں ہونی چاہئیں تاکہ گھر والوں کی امارت کا احساس ہو۔ اور

پھر ان پھر لنگڑی پھوپو گالیاں دیں، حکم چلائیں۔ اب تو اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ تھا۔ راشد نے بھان صاحب کے ساتھ بیڑی اور سگریٹ کا کارخانہ کیا کھولا کہ ایوانِ غزل کے ہلتے ہوئے در و بام سنبھل گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بنجارہ ہلز پر ایک بنگلہ بنوا کے کرایہ پر اٹھا دیا، نئی کار خرید لی۔ فوزیہ کی شادی کے لیے پچاس ہزار بینک میں ڈلوا دیے۔

"تو بھابی میرے کو چھوکریاں ہونا۔ اللہ سلامت رکھے میرا شاہین پاشا بڑا ہو رہا ہے اسے تو میں راشد نواب کی طرح خشک مزاج نہیں بنواؤں گی۔ جیسا آپ نے اپنی طرح اپنے بیٹے کو کر دیا ہے کہ بس جورو کا غلام بن کر رہ جائے۔ آپ آج احمد نواب کو خط لکھ دو نا!"

"اے احمد نواب کے پاس کیا لونڈیوں کی کھیتی ہوتی ہے! اب زمانہ گیا گوہر بیگم جب تم لونڈیاں پالتے تھے۔" واحد حسین اکتاہٹ سے خلال کرتے میں بولے۔

"آپ لکھو تو۔۔۔ اجالا بھابی دس لونڈیاں بھجوا دیں گی۔ نہیں تو اس قیصر مُردار ہی کو بھیج دیں۔ میں چپل کے نیچے دبا کر اسے ٹھیک کر لوں گی۔

اسی وقت احمد نواب کا خط لیے شاہین اندر آیا۔ اور جلدی سے خط دادا حضرت پر پھینک کر باہر بھاگا۔ کیونکہ انگریزی اسکول میں پڑھنے کی وجہ سے احمد نواب کا شکستہ خط شاہین کبھی ٹھیک طور سے نہیں پڑھ پاتا تھا۔ اس لیے واحد حسین اسے ہر سطر پہ جاہل اور گدھا ٹھیراتے جاتے تھے۔

"اجی دلہن بھابی جلدی آؤ احمد بھائی کا خط آیا ہے۔" لنگڑی پھوپو نے سر پر یوں ساری لپیٹی جیسے نماز پڑھنے والی ہوں۔

"اللہ فضل کرے۔ چھوٹے نواب تو ہمیشہ کسی ضرورت کے لیے ہی خط لکھتے ہیں۔" بی بی پان کی گلوری ہاتھ میں تھامے واحد حسین کے پیچھے آ کھڑی ہوئیں۔

مگر واحد حسین جانے کیوں خط کھولتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ اس لیے خط گود میں ڈالے پہلے تو وہ خلال کرکے دانتوں کا کوڑا کرکٹ صاف کرتے رہے۔ پھر جیب میں سے رومال نکال کر چہرے کا پسینہ پونچھا اور رومال کو اسی طرح تہہ کرکے جیب میں رکھا۔ اس کے بعد عینک لگا کر انہوں نے لفافے پر لکھا ہوا پتہ اچھی طرح پڑھا۔

بملاحظہ گرامی برادر معظم دام بالاحترام حضرت قبلہ نواب واحد حسین صاحب مدظلہ تعالیٰ دام ملکم

"لاحول ولا۔۔۔ کتنا بدخط ہو گیا ہے یہ آدمی۔"

انہوں نے عینک کو ٹھیک زاویے پر جما کر کہا۔

"اللہ توبہ۔۔۔ اب پڑھیے نا جلدی سے۔" بی بی بے صبری سے بولیں۔

انہوں نے احتیاط سے لفافہ چاک کرکے خط نکالا اور پڑھنے لگے۔

"حضرت قبلہ و کعبہ۔ بعد سلام و قدم بوسی کے عرضِ خدمت ہے کہ یہاں جمیع ارکان خاندان کی خیریت رہ کر وہاں جملہ تمام کی خیریت نیک مطلوب۔۔۔ اس وقت یہ عریضہ خدمتِ عالی میں انتہائی پریشانی کے عالم میں گزرانا جا رہا ہے کہ۔۔۔ رفتہ رفتہ واحد حسین کی آواز کم ہوتی ہوئی گم ہو گئی، صرف ان کے ہونٹ لرز رہے تھے اور احمد حسین کی تحریر کو ان کی آنکھیں نگل رہی تھیں۔

"چپ کیوں ہو گئے۔۔۔ زور زور سے پڑھیے نا۔" بی بی نے جھنجھلا کر کہا۔

"ہونہہ۔۔۔" واحد حسین کے چہرے کی سلوٹیں گہری ہو گئیں۔ کئی بار انہوں نے عینک کا زاویہ بدل کر کچھ اور پڑھنا چاہا۔ چھوٹے نواب کافی بدخط تھے۔ مگر آج انہوں نے ایک بھی لفظ مشکوک نہیں لکھا تھا۔

"اللہ میاں رحم کرو۔۔۔ کیا بات ہے جی۔۔۔!" بی بی کا دل دھڑکنے لگا۔ اور لنگڑی پھوپو کے دل میں ایک امید کی کرن جاگی کہ چھوٹے نواب کی دولت کا وہ حرامی وارث ختم ہو گیا، مگر اللہ کی اتنی بڑی عنایت کا انہیں یقین نہ تھا۔

"اجی کچھ تو بولو بھائی۔ میرا دم رک رہا ہے۔" لنگڑی پھوپو نے گھبرا کے کہا۔

انہوں نے خط تہہ کرکے لفافے میں رکھا اور عینک اتارنے لگے۔ جب گھر میں خاموشی چھا جائے تو پوری کائنات غنودگی کے دھندلکے میں سمٹ جاتی ہے۔ مگر واحد حسین کو اس وقت پورا گھر جاگتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کچھ سوچتا ہوا۔۔۔ کچھ کہتا ہوا۔۔۔

"ہوتا کیا وہی قیصر حرام زادی۔۔۔"

"قیصر۔۔۔؟" سب چونک پڑے۔

"کیا ہوا قیصر کو — بتلائیے، آپ خط مجھے دیدیجیے" بی بی نے خط اٹھانا چاہا تو واحد حسین نے چھین لیا۔

"وہ چھوکری اب کمیونسٹوں میں مل گئی ہے۔ اور وہاں غنڈوں کے ساتھ مل کر خوب اودھم مچا رہی ہے"

بی بی اور لنگڑی پھوپو کا منہ حیرت کے مارے کھلا ہوا تھا۔

"یہ فاطمہ بیگم کو کیا ہو گیا ہے کہ جوان لڑکی کو کمیونسٹوں میں بھیج دیا"۔

"اور اجاڑ صورت ہماری ہی دشمن ہو گئی ہے۔ چھوٹے نواب نے لکھا ہے کہ غلام رسول کو راتوں کہیں لے جا کر اس نے چھپا دیا ہے۔ اتنی غنڈہ گردی بڑھ گئی ہے کہ ہم لوگوں کی راتوں کی نیند حرام ہے دو ہفتے سے میں گاؤں نہیں جا سکا ہوں"۔

بی بی جانے خلا میں کہاں گھور رہی تھیں۔ ان کا منہ تعجب کے مارے کھلا ہوا تھا اور ان کے گلے میں پڑا ہوا کالے موتیوں کا گچھا سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ لرز رہا تھا۔

رضیہ صبح ہی شادی کے انتظام کے سلسلے میں کہیں چلی گئی تھی۔ اس لیے لنگڑی پھوپو ہانپتی کانپتی چولھے کے پاس پہنچیں اور مسالہ پیستی رکّو سے بولیں۔

"دیکھا وہ پوتی ٹکمنٹھان کو رکھ لی گئی۔ اجاڑ صورت اس کے منہ کو آنچ آوے۔ چھوٹے نواب کو تو بے حد غصہ آ رہا ہے۔ انھوں لکھے ہیں کہ اب اسے پکڑوا کے دھیڑوں سے جوتے لگواؤں گا"

"کون — کون بی بی —؟" رکّو نے مسالے سے ہاتھ اٹھا لیے اور ہم ہم کر پوچھا تو پھوپو چونک پڑیں۔

"تیرے کو کیا کرنا ہے ری ان باتوں سے؟ چل جلدی مسالہ آ تھا" اس کے بعد دالان کے تخت پر بیٹھے ہوئے انھوں نے سوچا کہ یہ کمیونسٹ آخر کون ہیں؟ اور راحمد نواب سے کا ہے کا بیر ہے؟ انھوں نے ناحق جلدی کی۔ لکھنؤ سے یہاں آنے میں ابھی تو بڑے بھائی سے مزید اس مسئلہ پر تبادلۂ خیال ہو سکتا تھا۔

اچانک چاند اندر آتی نظر آئی — فیروزی جارجٹ کی ساری میں لپٹی، اُداس صورت، پریشان بال۔ وہ دو تین دن سے گھر نہیں آئی تھی۔ اس لیے آج اسے ڈانٹنے کا نہ صرف لنگڑی پھوپو کو حق تھا بلکہ وہ واحد حسین اور راشد کو بھی اس کے خلاف بھڑکانا چاہتی تھیں۔ اس لیے انھوں نے چاندی کے پاندان کو اپنی جانب گھسیٹ کر بی بی کو مخاطب کیا۔

"آج چار دن کے بعد اس دھیڑ عاشق نے اجازت دے دی آپ کی نواسی کو گھر جانے کی"۔

بی بی نے بڑی بیزاری کے ساتھ لنگڑی پھوپو کی طرف دیکھا۔ پھر چاند کے کمرے کی طرف پھر راشد کی باتیں سننے میں محو ہو گئیں۔

لنگڑی پھوپو گھبرا گئیں۔ یقیناً اس وقت کوئی اہم بات ہے۔ جبھی تو چاند کے آنے کا نوٹس کسی نے نہیں لیا۔ اس لیے وہ پھر لکڑی کے سہارے گھسٹتی ہوئی ان کے قریب آئیں۔

"کیا ہوا — کیا بات ہے —؟"

"کچھ نہیں جی —" راشد نے ان کا میلا ہاتھ شارک سکن کی سفید شیروانی پر سے جھٹک دیا۔

"گوہر بیگم چار کپ اچھی چائے بنوا کر جلدی باہر بھجوا دو"۔

بی بی نے انہیں وہاں سے ٹالنے کے لیے کہا۔

"مگر کون آیا ہے —؟" وہ معلوم کیے بغیر جانے کو تیار نہیں تھیں۔

"بیوپاری لوگ آئے ہیں گوہر بیگم۔ راشد نواب ان سے کپڑا اور دوائیں خرید رہے ہیں" واحد حسین نے رسان سے سمجھایا۔

اچھا اچھا گوہر بیگم چولھے کی طرف جانے لگیں تو انہیں احساس ہو رہا تھا کہ اصلی بات اُن سے چھپائی گئی ہے۔

دو تین دن میں راشد نے بنجارا ملز والا مکان خالی کروا کے پٹرول، دوائیں اور ہتھیاروں سے بھر دیا۔ رات کو جب سب فرصت سے بیٹھے تو رضیہ اخبار اٹھا کر بی بی اور گوہر پھوپو کو ہیبت ناک خبریں سناتی تھی۔ سب کے دل دھڑکنے لگے۔ اتنا دنگا فساد ہر طرف ہو رہا تھا۔

"ارے تو بیچ بچاؤ کرنے والے سب مر گئے کیا" پھوپو نے گھبرا کے پوچھا۔

"سنا ہے گاندھی بہت سمجھا رہے ہیں۔ وہ تو فساد کی جگہ خود جا کر مسلمانوں کو مارنے سے روکتے ہیں" رضیہ نے راشد سے سنی ہوئی باتوں کو دہرانا شروع کیا۔

"اونہہ۔ یہاں تو سب چین ہے۔ کہیں لڑنے والے یہاں نہ آ جائیں" بی بی نے گھبرا کے کہا۔

دن بھر آنکھیں بند کیے واحد حسین آرام کرسی پر لیٹے خبریں سنتے

رہتے تھے ریڈیو بند کرتے تو اخبار اٹھا لیتے۔ سارے ہندوستان میں ہو رہے تھے۔ بہت سے لوگ پناہ لینے حیدرآباد آ گئے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حیدرآباد ہر ایک کو محبت کے ساتھ اپنے دل میں جگہ دیتا ہے۔ یہ دہلی کے معزز خاندانوں کے افراد تھے، جو اپنی وضع داری اور آن بان کے لیے جان کی پرواہ نہ کرتے تھے، مگر آج اُن کی عورتیں اپنے بچوں کی جان بچانے کے لیے دوپٹے سے منہ ڈھانپے ہاتھ پھیلائے سڑکوں پر ماری ماری پھر رہی تھیں۔ شہر میں جگہ جگہ مہاجرین کیمپ کھل گئے تھے۔ لوگ بڑھ چڑھ کر چندے دیتے کپڑے اور اناج تقسیم کرتے۔

رفتہ رفتہ راشد بھی پریشان ہونے لگا، کیوں کہ اِدھر تو کمیونسٹوں نے ضلعوں میں شور اٹھایا تھا، اُدھر انڈین یونین ریاست کے الحاق پر زور دے رہی تھی اور اب یہ مرحلہ بات چیت سے آگے بڑھ کر تشدد کی صورت اختیار کرنے والا تھا۔ قاسم رضوی ہر طرف غضب ناک اور جوشیلی تقریریں کر کے جذبات کو بھڑکا رہے تھے ہر نوجوان کے لیے فوجی پریڈ ضروری کر دی گئی

تیرہ چودہ برس کا شاہین بھی صبح سویرے اٹھ کر رضاکاروں کا ڈریس پہنے این سی سی کی ٹریننگ کے لیے جانے لگا

واحد حسین شاہین کو رضاکاروں کے ڈریس میں دیکھتے تو جانے کیوں ان کا دل دھڑکنے لگتا۔ کیا اپنی ناموس بچانے کا صرف یہی ذریعہ ہے۔۔۔؟ انہوں نے زندگی میں ہر طرح کی جدوجہد کی تھی مگر یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن ان کے بچوں کو کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ وہ جس طرف جائیں گے تلواریں ان کا استقبال کریں گی، موت ان کا راستہ گھیرے گی۔ آخر ہم اس لڑائی میں کیوں شریک ہوں۔۔۔؟ پائپ سلگاتے ہیں وہ سوچتے۔ میرے جیسے عام انسان جو کسی سیاست میں، کسی پارٹی میں شریک نہیں ہیں۔ بس اپنے گھر میں گلزار بجائے کسی پیڑ کی چھاؤں تلے بیٹھے غزلیں لکھتے رہے ہیں، اپنے بیوی بچوں کے مسائل میں کھوئے ہوئے ہیں۔۔۔ ہم اس لڑائی میں کیا رول ادا کریں گے۔ کس طرف سے لڑیں گے۔

اور پھر بڑی مایوسی کے ساتھ راشد سے پوچھتے:۔

"کیا میاں! ابھی بھی سلطنت آصفیہ باقی نہیں رہے گی؟"

راشد جانتا تھا کہ اس کے خاندان کی رگوں میں سلطنت آصفیہ کا وقار خون بن کر دوڑ رہا ہے۔ اس لیے وہ اپنے ابا کو تسلّی دیتا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے ابا جان۔ قاسم رضوی ہرگز اپنی شکست تسلیم نہیں کریں گے۔"

"لیکن میاں یہ کانگریس والے دھمکی دے رہے ہیں کہ فوجی کارروائی کریں گے انہوں نے تو سرحدوں پر فوجیں اکھٹی کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ کل آل انڈیا ریڈیو نے سنایا۔"

"اونہہ، سب ڈرانے کی باتاں ہیں۔" راشد لاپرواہی سے کہتا اور باہر کی طرف بھاگتا کیوں کہ خبر گرم تھی کہ حیدرآباد کا معاشی مقاطعہ ہونے والا ہے۔

"اوئی اجاڑ صورت یہ غنڈے لوگاں تو یزید کی اولاد ہیں۔ آپ ایک روپے کی مٹھائی منگواؤ، بھائی پاشا" میں ایک وظیفہ پڑھوں گی۔" لنگڑی پھوپھو نے سنا تو بی بی سے کہا:

"میرا وظیفہ بڑا جلالی ہے، رات ہی رات ساری پابندیاں برخاست ہو جائیں گی۔"

پھوپھو کی بات سن کر راشد نوالہ ہاتھ میں تھامے دسترخوان سے اٹھا اور پھوپھو کے آگے فرش پر اکڑوں بیٹھ کر کہا۔

"گوہر پھوپو۔۔۔ تمہارے اور شاہین کے لیے بنجارہ ہلز پر ایک بنگلہ اور بنوا دوں۔"

"ہئو، مگر آج میرے سے کیوں پوچھ رہے ہو میاں۔۔۔!" پھوپھو کا دل خوش ہو گیا بھتیجے کی اس سعادت مندی پہ۔"

"اور فوزیہ کے لیے پچاس ہزار روپیہ اور لا دوں۔۔۔؟"

پھوپھو کو ہنسی آ گئی، آج کیسا مسخرہ پن کر رہا تھا راشد۔

"تو اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ فوزیہ جہیز میں بنگلہ اور کار لے کے جائے تو کوئی وظیفہ وغیرہ مت پڑھنا"

"ایو۔ کیوں میاں؟" پھوپو نے تعجب سے کہا۔

"اس لیے کہ اگر پٹرول، دوائیں اور دوسری چیزیں ہندوستان سے آنے لگیں تو اس سامان کا کیا ہوگا جو ہم نے پہلے سے بھر کے رکھا ہے۔" راشد نے نوالہ منہ میں رکھ کر کہا۔

"مگر دواؤں کے بغیر بیماروں کا کیا ہوگا۔"

"اللہ کی مرضی!" راشد نے ہاتھ پھیلا کے بڑی عقیدت کے ساتھ چھت کی طرف دیکھا "آپ کیا سمجھتی ہیں کہ موت کا وقت دواؤں سے ٹل جاتا ہے یہ تو سب دل بہلانے کی باتاں ہیں۔"

"اچھا اچھا میں نہیں پڑھوں گی ذلیفہ ابا تو روٹی کھالے۔"

"میری ایک بات سنو میاں، اگر یونین کی فوجیں آگئیں تو شاہین اور ایاز کو پکڑ لیں گی نا، ان کا رضا کاروں والا ڈریس اتروا دو۔" بی بی نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"ارے چھوڑو امی! یونین کی فوجاں آئیں تو اپنا کیا بگاڑیں گی۔ آپ مجھ پر بھروسہ رکھو میں ہر طرف دیکھ رہا ہوں۔" اور واقعی راشد ہر طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ اتحادالمسلمین کا ممبر تھا۔ ہر طرف جلسے کرواتا، چندے جمع کرتا۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس آفس کمیٹی کا پریسیڈنٹ بھی تھا۔ الحاق کے سلسلے میں جو وفد دہلی بات چیت کرنے گیا تھا۔ راشد بھی اس میں شامل تھا۔ اور جب معاشی مقاطعہ ہوا تو اس نے اور سلیم نے مل کر خوب ہاتھ رنگے، اتحادالمسلمین کے ہاتھوں اس نے شراب کے بھاؤ پٹرول بیچا۔ سونے کے بھاؤ دوائیں نکالی گئیں ـــــ واحد حسین ہر چیز دیکھتے اور ریڈیو کا سوئچ اتنی زور سے آن کر دیتے کہ ہر شور، ہر سوچ اس میں دب کر رہ جائے۔ انھوں نے باہر آنا جانا بالکل بند کر دیا تھا، کیوں کہ فوجی موٹریں، ٹرکس اور گڑبڑ کی فضا سے انھیں وحشت ہوتی تھی۔ ہر طرف لوگوں میں خوف و دہشت تھا، ایسے میں کسی کو مشاعرے کی یاد تھی نہ کلچرل فنکشن کی۔

گھر میں دن بھر ایاز اور شاہین ہو حق مچائے رکھتے، ان دونوں لڑکوں کو تو جیسے ایک کھیل مل گیا تھا، کہیں فائرنگ کی مشق ہو رہی ہے، کہیں تلوار چلائی جاتی، دونوں دن بھر چیخ چیخ کر گاتے: "تا ابد خالق عالم یہ ریاست رکھے۔" اور

غازی ہیں مجاہد ہیں علم والے ہیں ہیں
سالار ہیں بہادر ہیں، کمال ہیں ہیں

دکن ریڈیو سے ابراہیم جاہ میں ایک پروگرام پیش کرتے۔ اور اسے سننے کے لیے سارا گھر واحد حسین کے اردگرد اکٹھا ہو جاتا تھا۔

پھر رات کو جب حیدرآباد کے پناہ گزین اپنے اپنے گھروں کو ریڈیو کے ذریعے پیغام بھجواتے تھے تو بی بی اور لنگڑی پھوپھو اپنے آنسو پونچھنے لگتیں، اللہ کسی پر یہ وقت نہ لائے کہ آدمی اپنوں سے بچھڑ کے اتنی دور جا پڑے اور پھر لنگڑی پھوپھو شاہین اور ایاز کو ڈانٹنے لگتیں کہ یہ لڑائی کا کیا کھیل نکلا ہے! مگر شاہین بھی اب گھر کے دوسرے افراد کی طرح لنگڑی پھوپھو کی بات پر دھیان دینا چھوڑ چکا تھا۔ وہ پندرہ سولہ برس کا بانکا ترچھا گھنگھریالے بالوں والا نہایت عقل مند انسان بن چکا تھا، اب وہ ہائی اسکول کا امتحان دینے والا تھا، اچانک اس کی ساری بیڈ بال اور شیروانیاں چھوٹی ہوگئی تھیں اب وہ اپنی گیند اور دو پہیوں والی چھوٹی سائیکل چھوڑ کر شام کو کرکٹ کا بلا لیے باغ میں سے گزرتا تھا تو جھکی جھکی کیریوں کو ہٹ لگاتا چلتا، آج کل ایاز سے اس کی خوب گھٹ رہی تھی، حالانکہ ایاز کو اس گھر میں شاہین سمیت کبھی کسی نے لفٹ نہیں دی تھی۔ مگر ایاز جہاں رہتا تھا وہاں اتحادالمسلمین کا کیمپ تھا جہاں فوجی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ ایاز رضاکاروں میں شامل ہو چکا تھا اور قاسم رضوی کی تمام جوشیلی تقریریں اسے زبانی یاد تھیں، وہ اپنے محلے کے تمام لڑکوں کا لیڈر تھا، جو سلطنت آصفیہ کے لیے خون کا آخری قطرہ بہانے کو تیار ہو چکے تھے جس وقت ایاز فوجی لباس پہنے اپنے کمرے سے باہر آتا

تھا تو غزل کانپ جاتی تھی، کہیں وہ سچ مچ لڑکے کو نہ چلا جائے۔

کئی ہفتے بعد ایک دن غزل ایوان غزل "گئی تو سارا گھر گم سم تھا، ہر طرف خاموشی لنگڑی پھوپو تک چپ چاپ بیٹھی چھالیہ کترتی رہیں اور کسی نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔

پھر وہ بھی فوزیہ کے ساتھ باغ کے ایک کونے میں جا بیٹھی اور نیچے گری ہوئی رات کی رانی کی کلیاں سوکھے پتوں میں سے چننے لگی۔ بچپن سے وہ دونوں فرصت کے وقت یہ کام انتہائی انہماک سے کرتی تھیں، پھر جب پوری کلیاں اکٹھی ہو جاتیں تو انہیں لاپرواہی سے کسی کونے میں ڈال دیتیں تاکہ لچھما کا ماٹن انہیں جھاڑو میں سمیٹ لے جائے

"چاند آپا تو چلی بھی گئیں۔"

"کہاں --؟" غزل کے ہاتھ سوکھی مٹی پر جم گئے۔

"شادی کر لی۔ انہوں نے ڈیڈی کو خط لکھا تھا کہ وہ سنجیوا سے شادی کر رہی ہیں اور اسی کے ساتھ رہیں گی۔"

"اللہ -- سچی --!" چاند آپا کی شادی کے تصور سے وہ خوشی کے مارے پاگل ہو رہی تھی --!

"ہشت -- یہ کوئی خوش ہونے کی بات ہے؟" فوزیہ نے ناک سکوڑ کر کہا، فوزیہ میں اب نمود نمائی، اس کی ستواں ناک کی طرح ابھر رہی تھی، بات بات پر اس کی بھنویں کھنچ جاتی تھیں۔

"سنجیوا تو دھیڑ ہے۔ اجاڑ صورت -- ڈیڈی اب چاند آپا کو کبھی گھر میں نہیں آنے دیں گے، یاد ہے اس دن ڈیڈی نے چاند آپا کو کیسے ڈانٹا تھا؟"

غزل کو وہ پورا منظر یاد آ گیا کہ کس طرح سنجیوا آ کر بیٹھا تو راشد چاند کا ہاتھ پکڑ کر لایا اور تخت پہ ٹپک دیا۔

"اجاڑ صورت چھوکری، ہم سب کی جانوں کے پیچھے پڑی ہے اس کمیونسٹ چھوکرے کو یہاں لا کر، اچھی طرح سن لے اگر پھر کبھی وہ چھوکرا یہاں آیا تو تجھے بھی اسکے ساتھ نکال دوں گا۔"

غم کے مارے غزل کا کلیجہ پھٹ گیا، چاند آپا سے کیا اس طرح بھی بات کی جاتی ہے، چاند آپا

نہ ہوئیں کہ غزل ہو گئی، آج ماموں کا یہ بدلا ہوا روپ اس کی سمجھ میں نہ آیا، لیکن ایک دن شام کو دسترخوان پر راشد ماموں نے خود سمجھایا۔

"یہ بھی یہ بھان صاحب ہیں یا اندرلال وغیرہ، ان کی دوسری بات ہے، بڑے آدمی ہیں جن سے تعلقات بڑھاؤ سو کام بنتے ہیں مگر یہ کمیونسٹ چھوکرا گھر آنے لگا تو کیا ہوگا۔"

اس دن جب چاند آپا تخت پہ سے اٹھی ہیں تو ان کی وہ ساری اکڑفوں اور تنک فراجی جانے کہاں چلی گئی تھی، وہ بلک بلک کر رو رہی تھیں، چاند آپا کی ایسی بے بسی پہ غزل کو بھی رونا آ گیا تھا، راشد ماموں کیسے بے رحم ہیں، بیچارے سنجیوا انکل تو بڑے اچھے آدمی تھے، چاند کے دوسرے دوستوں کی طرح انہوں نے کبھی چاند کو نوچا کھسوٹا تھا نہ وہ غصہ کرتے تھے۔ غزل نے کئی بار دیکھا تھا کہ وہ کہیں جانا چاہتے اور چاند آپا ان کا ہاتھ پکڑ کے بیٹھ جاتیں، انہوں نے جانے کتنی بار منع کیا تھا کہ میرے ساتھ مت آؤ مگر چاند آپا خود ہی نہ مانتیں، تو پھر سنجیوا کا کیا قصور تھا؟ اور پھر سنجیوا تو قطعی دھیڑ نہیں لگتا تھا، اچھا خاصا تھا، شاندار اونچا پورا، مگر چاند آپا کے عروج ہی کو اب گھر میں گہن لگ چکا تھا، وہ ہر وقت اداس سی بیٹھی جانے کیا لکھتی رہتی تھیں۔ غزل کو تو اب انہوں نے یوں نظرانداز کر دیا تھا جیسے وہ ان کی پرانی چپل ہو اور خود گھر والوں نے بھی انہیں سر سے گرے ہوئے بال کی طرح جھٹک دیا تھا۔

ان کے نام پر نانا حضرت کے منہ میں کوئی کڑوی کسیلی سی چیز آ جاتی تھی جسے وہ کھنکار کے تھوک دیتے تھے، راشد ماموں ان کے کمرے کی طرف کبھی نہیں دیکھتے تھے۔ بی بی چاند آپا کے نام پر ٹھنڈی سانس بھر کے یوں سر پہ پلو سنبھالتیں جیسے اپنی مرحوم بیٹیوں کے ذکر پر کرتیں، رضیہ جان بوجھ کر چاند سے بات نہ کرتی، صرف لنگڑی پھوپو تھیں جو لاٹھی کے بل ان کے کمرے میں گھسٹتی ہوئی جاتیں تو ساری زندگی کے دل میں دبائے ہوئے طنز اور گالیاں الٹ دیتی تھیں، لنگڑی پھوپو کی اتنی بکواس کے جواب میں چاند آپا کی وہ تیز حاضر جواب زبان ذرا بھی نہ ہلتی، وہ منہ چھپا کر بالکل یوں سسکیاں لیتی تھیں جیسے مرنے سے پہلے غزل کی اماں روتی تھیں -- ایسے وقت اکثر یہ ہوتا کہ غزل بھی ان کے کمرے

میں چلی جاتی اور انہیں دیکھ دیکھ کر خود بھی رونے بیٹھ جاتی تھی، وہ دونوں گھنٹوں روئے جاتے، اس کے باوجود نہ تو کبھی اس نے چاند آپا سے پوچھا کہ آخر کیوں روتی ہیں اور نہ کبھی چاند آپا نے اس سے پوچھا کہ وہ کیوں ساتھ دیتی ہے۔

اور جب آج فوزیہ نے سنایا کہ چاند آپا چلی گئیں ہیں تو اسے بڑا سکون ملا۔ وہ پھر اندر آ گئی۔

دالان میں تخت پر بیٹھی لنگڑی پھوپو کیریاں چھیل رہی تھیں اور پاس کرسی پر بیٹھے راشد ماموں سے بک بک کر رہی تھیں۔

"ہم نے دھوپ میں بال تھوڑی سفید کیے ہیں میاں۔ پہلے ہی جاتے تھے کہ چھوکری کو اتنی آزادی مت دو۔" اور پھر انہوں نے کیریوں کو چھری کے ساتھ سوپ میں رکھ کر اپنے ہاتھ دباتے ہوئے کہا:

"دس دن ہو گئے، اب تک تو ستیاناس کر دیا ہوگا اس چھوکرے نے۔"

"بس کرو پھوپو۔" رضیہ تن تن کرتی اپنے کمرے سے نکل کر ان کے پاس آ بیٹھی۔

"جیسے بڑی کنواری سیتا سا وتری تھی تمہاری چاند۔ ایسے تو جانے کتنے وہ روز کرے گی، جب دل بھر جائے گا تو پھر آ جائے گی اپنے ماموں کے پاس۔"

راشد نے کچھ نہ کہا۔ صرف کیریوں کے چھلکوں سے کھیلتا رہا۔

"آپ سنجیوا کو گرفتار کیوں نہیں کرا دیتے؟" رضیہ نے پوچھا۔

"بکو دلہن بیگم۔ ایسا بکو بولو۔" بی بی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اب تو وہ چاند کا شوہر ہو گیا۔ اسی کے ساتھ مرنا جینا ہے، دیکھنا وہ اب کبھی نہیں آئے گی۔ آخر ہے کس نانا کی نواسی۔" بی بی کے زخم جیسے ہرے ہو گئے تھے۔ جیسے وہ آج بھی واجد حسین کی اس مضبوط گرفت میں بڑی کسمسا رہی تھیں۔

"ہاں دونوں نے سول میرج کر لی ہو گی۔" راشد نے لاپرواہی سے کہا۔ "مگر چاند نے بڑا غلط انتخاب کیا۔ ایسی شاہ خرچ فیشن ایبل لڑکی کو تو اپنے لیے کوئی نواب یا جاگیردار ڈھونڈنا چاہیے تھا کہ عیش کرتی، وہ لونڈا تو پہاڑوں جنگلوں میں چھپتا پھر رہا ہے، چاند کو کیا کھلائے گا؟"

"اے یہ بات اس کے خاندان میں کسی نے نہیں سوچی، وہ کیا سوچے گی۔" لنگڑی پھوپو نے بڑی مایوسی کے ساتھ بی بی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"لیکن سارا قصور تو آپ ہی کا ہے۔" رضیہ پھر گھیر کے پھر راشد ہی کے سر الزام تھوپنے لگی تو راشد نے بڑبڑا کر اخبار اٹھا لیا جیسے اخبار میں وہ خبر ڈھونڈ ہی لیں گے جس سے ان کی بے گناہی ثابت ہو گی، حالانکہ انہوں نے کہیں غلطی نہیں کی تھی، وہ چاند کے ساتھ اس وقت تک رہے جب تک چاند ان کے مقاصد پورے کرتی رہی۔ اور ایک راشد ہی پر کیا منحصر تھا، یہ تو اس وقت کا عام رواج تھا، ایک خواجہ نواب تھے، وہ اپنی حسین و جمیل ایرانی نژاد بیوی کو خود اعلیٰ عہدیداروں کے کمرے میں پہنچا آتے تھے اور جب بیوی کمرے سے باہر آتی تو سب سے پہلے اس کے ہاتھ میں سے وہ کاغذ لے کر پڑھتے جس میں ان کی ترقی کی نوید سنائی جاتی تھی، ان دونوں میاں بیوی میں بڑی محبت تھی۔ سبحان صاحب تو اس خوبصورت شاندار جوڑے پر رشک کرتے تھے۔ مگر راشد کی رگوں میں شرافت کا خون تھا۔ اس لیے اس نے کبھی اپنی بیوی کو کسی عہدے دار سے نہیں ملایا، البتہ چاند کو اس کے ساتھ دیکھ کر سبحان صاحب جیسے سرمایہ دار خود ہی کھنچے چلے آئیں تو اس کا کیا قصور، ایک بار چاند کو دیکھ کر کسی شاعر نے کہا تھا:

"یہ ایوانِ غزل کی معشوقہ ہے۔"

راشد یوں انجان بن گیا جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو۔ تھوڑی دیر بعد جب اس شاعر سے کسی نے راشد کا تعارف کرایا تو اس نے صراحت کی۔

"جی ہاں، ہمارے ہاں سو پشتوں سے شاعری ہوتی آئی ہے لیکن میں شاعر نہیں ہوں میں تو صرف ایک بزنس مین ہوں۔" اور اس شاعر نے فوراً اپنے کسی دوست سے کہا:

"یارو، لوگ عورت کو کس کس طرح ایکسپلائٹ کرتے ہیں۔" لیکن کوئی کیا جانے کہ چاند خود کم ظرف تھی۔ ندیدی، جدھر دیکھتی دیکھتی ہی رہ جاتی، پسند بھی آیا تو کون، ایک چھیچھڑ

آرٹسٹ جس نے جانے کیا الٹی سیدھی باتیں اسے سنا دی تھیں۔

اس دن غزل بہت خوش رہی، چاند بھی شہزادی آپا کی طرح دلہن بنی ہوں گی اور باجے والوں نے "چھوڑ بابل کا گھر" بجایا ہوگا، نہ جانے ان کے ہاتھوں پر مہندی کس نے لگائی ہوگی۔ شہزادی آپا کی بہنوں نے تو اپنے ہاتھوں میں بھی خوب مہندی رچالی تھی اور ایک دوسری کے چٹکلے "مل کر خوب گانے گائے تھے۔

ہر طرف سے کٹ کر غزل بھی اسکول کی سرگرمیوں میں کھو گئی، اب وہ آٹھویں کلاس میں تھی اور اپنی کلاس ٹیچر مس ریڈی کی سب سے چہیتی شاگرد کہلاتی تھی، مس ریڈی چاند آپا کی طرح حسین تو نہ تھیں مگر چاند آپا کی طرح بات بات پر قہقہے لگایا کرتی تھیں، وہ ہر روز ایک نئے رنگ کی ساری پہنتیں، اسی رنگ کا بلاؤز ہوتا اور اسی رنگ کے پھولوں کی بینی بالوں میں مہکتی، لیکن ان کے کپڑوں کی خوشبو ہمیشہ ایک ہی ہوتی تھی، غزل کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر کوئی ہزار عورتوں میں چھوڑ دیتا تو سونگھ کر مس ریڈی کو پہچان سکتی تھی۔ مس ریڈی خوبصورت چیزوں پر جان دیتی تھیں اس لیے انہیں غزل کا چمکیلا سا رنگ اور سوئی ہوئی خمار آلود آنکھیں بہت پسند تھیں، لہٰذا مس ریڈی پر نچھاور ہونا غزل کا فرض تھا، اسکول میں مس ریڈی کے بارے میں ہمیشہ سرگوشیاں ہوتی تھیں، دوسری سوکھی چمرخ ٹیچرس ان کے بھرے بھرے بدن سے زچ زچ جلتی تھیں۔ بڑی عمر کی لڑکیاں انہیں آتے دیکھ کر یوں رک جاتی تھیں جیسے بارات گزر رہی ہو۔ وہ چلی جاتی تو دبے دبے قہقہے بلند ہو جاتے۔

"گریبان دیکھا، اسکول کا پھاٹک ہے۔"

"سنا ہے ہر ایک کو اندر جانے کی اجازت ہے۔"

بڑی عمر کی لڑکیاں ان سے بہت جلتی تھیں، لیکن چھوٹی لڑکیوں میں وہ بہت ہی محبوب ٹیچر تھیں، اسکول میں جب بھی اعلیٰحضرت کی سالگرہ پر کلچرل پروگرام ہوتا تھا تو مس ریڈی ہی "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کی دھن بناتیں جسے غزل لیڈ کرتی تھی، وہ غزل کو سب لڑکیوں پر فوقیت دیتی تھیں، وہ ہر

گیت، ہر نظم فوراً یاد کر لیتی تھی۔ مس ریڈی اس کے ذہن کی بہت تعریف کرتی تھیں کہ غزل ہر بات یاد رکھتی ہے، چاہے پہاڑے ہوں یا سبق۔

چاند آپا کا غصہ، پھوپا ابا کی جھڑکیاں ـــ اس کا دل نفرت کی آگ سے اتنا بھر چکا تھا کہ اب کسی محبت، کسی چاہت کے لیے اندر جانے کا راستہ نہ رہا تھا۔

لیکن اب کئی مہینے کی چھٹی کے بعد مس ریڈی اسکول آئیں تو لوگوں نے انہیں شکل سے پہچانا، اب ان کے بالوں میں پھول تھے نہ کپڑوں کا کوئی میچ ـــ گریبان حلق تک بند ایک گھنٹہ میں وہ ایک بار مسکرائی ہوں گی، ٹیچروں نے لڑکیوں کو بتایا کہ وہ اب مسنز پرکاشم بن گئی ہیں، شادی کا یہ عبرت ناک انجام غزل کو بالکل اچھا نہ لگا، اس نے ایک بار پھر انہیں باتوں سے رجھانا چاہا اور گیتوں سے بھی، مگر انہیں بالکل فرصت نہیں تھی کہ لڑکیوں کی صورت پر غور کرتی پھریں۔

ایک برس گزر گیا۔

غزل تنہائی کے اس پل صراط پہ دھکے کھاتی پھری، اس اندھے کی طرح جو سانپ کو رسی سمجھ کر پکڑ لے وہ بھی محبت کی تلاش میں جانے کتنے خطروں میں کود گئی۔

اسکول میں ٹیچرس اُسے لفٹ نہیں دیتی تھیں کیوں کہ وہ گانے ناچنے اور کود پھاند کے علاوہ کوئی اچھی بات نہیں کرتی تھی، اس لیے وہ ٹیچروں کی نظروں میں سمانے کی خاطر کتابوں میں کھوئی رہتی تھی، اس طرح یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ سایہ نے اس کے ساتھ کتنی ناانصافی کی ہے اور سا آپا نے کتنے تھپڑ لگائے۔ اسے تو سب سے بڑا غم اس بات کا تھا کہ بھائی صاحب کی عنایت کردہ فراک اب اس کے بدن پہ نہ چڑھتی تھی۔ اس لیے وہ مستقل طور پر فوزیہ کے پرانے کپڑوں میں زندگی گزارتی تھی، ایک بار سر میں جوئیں دیکھنے پر لنگڑی پھوپھو نے اسے دو پیسے دیئے تو اس نے بھی فوزیہ کی نقل میں گولک خرید لی اور دوسرا پیسہ اس میں ڈال دیا، اس نے سوچا کہ فوزیہ کی طرح ایک آدھ مہینے بعد گولک ٹوٹے گی تو وہ پیسوں سے بھری ہوگی، مگر شاہین نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔

"اری موئی، تو نے اپنے دونوں [illegible] دیے نا۔"

یہ سن کر وہ خوب روئی ۔۔۔ شاید سارا دن روتی رہتی، اگر شاہین گولک توڑ کے اس کا پیسہ نہ نکال دیتا۔

ایک دن شام کو غزل اسکول سے آئی تو ایاز رضا کاروں کا ڈریس اتار کر اس کے پاس آبیٹھا۔

"آج سایا نے کچھ نہیں پکایا ہے۔"

"پھر تم نے کیا کھایا۔" غزل نے بالکل اماں کے اسٹائل سے پوچھا:

"کچھ نہیں" ایاز نے بڑی مسکین صورت بنا کر کہا۔

غزل کا جی بیٹھ گیا، جب سے ایاز رضا کاروں میں شامل ہوا تھا، ان دونوں کی لڑائیاں بہت کم ہوگئی تھیں۔ خصوصاً جب سے ایاز رات کو ایک پینٹر کی دوکان پر کام کر کے اپنی اور غزل کی فیس جمع کرنے لگا تھا، غزل کو یوں لگتا جیسے اس کے سر پر امن و حفاظت کا ایک چھپر آ گیا تھا۔

وہ جلدی سے اٹھ کر بالکل ایک گرہستن کے انداز میں اندر گئی اور سارے کنستر اور ڈبے جھٹک ڈالے، مگر سچ مچ کہیں اناج کا ایک دانا نہیں تھا۔

"جانے دو ابا آ کر لائیں گے۔" ایاز نے بڑی مسکین صورت بنا کر کہا، مگر اتفاقاً ایک لفافے میں تھوڑی سوجی مل گئی، ڈبے میں گھی تو کافی تھا اور شکر کا ڈبہ تو بالکل ہی بھرا ہوا تھا، ایاز کا بھی بہت دنوں سے حلوہ کھانے کو جی چاہ رہا تھا ان تینوں چیزوں کو ملا کر ہی تو اماں حلوہ پکایا کرتی تھیں۔

دھوپ ڈھل رہی تھی، ابا اور سایا، دونوں کے آنے کا وقت ہو رہا تھا، اس لیے غزل نے جلدی جلدی دیگچی میں سوجی، شکر اور گھی ڈالا اور خوب بہت سا پانی ڈال کر بڑی نفاست کے ساتھ، بڑی عورتوں کے انداز میں کفگیر چلانے لگی۔

ایاز اس کے پاس چوکی پر بیٹھا اپنی چھوٹی سی بہن کی سمجھ بوجھ کا قائل ہو چکا تھا، غزل بالکل سایا کے انداز میں چوکی پر بیٹھی تھی اور چولہے میں پھونکیں مار مار کے اس نے اپنے بالوں

پر راکھ کی تہیں جمالی تھیں، ایاز بیچارا دونوں ہاتھوں سے دھوئیں کے بادلوں کو ہٹا رہا تھا،

"دھوئیں دھوئیں بھاگ تیرے بچے کو بچھو نے کاٹا۔"

مگر اس وحشت انگیز خبر نے بھی دھوئیں کو کہیں نہیں بھگایا۔

تھوڑی دیر تک تو غزل بڑی آسانی سے دیگچی میں کفگیر ہلاتی رہی مگر ایک دم حلوے کو جانے کیا سوجھی کہ اینڈھ کر چاند آیا بن گیا اور دیگچی میں بیسیوں چھوٹی چھوٹی گیندیں پھدکنے لگیں، غزل اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور جسم کی پوری قوت لگا کر کفگیر ہلانے لگی، وہ چاہتی تھی کہ ابا کے آنے سے پہلے حلوہ تیار ہو جائے تاکہ آج وہ پہلی بار ایک چیز پکانے کی شاباشی حاصل کر لے، اس گڑبڑ میں ایاز نے اپنا ہاتھ بیچ میں لا کر جلا لیا اور اسے بچانے کی دھن میں غزل نے لکڑی کے بجائے انگارے کو چھو لیا، پھر کفگیر پھینک پھانک روتی چلاتی وہ نل کے پاس بھاگی اور نل کی دھار تلے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اتنی دیر میں ایاز نے حلوہ اتار کے ایک رکابی میں نکالا اور چمچے سے اس میں بڑی ہوئی گیندوں سے بلیرڈ کھیلنے لگا، حلوے کو رکابی میں دیکھ کر غزل کی جلن کچھ کم ہو گئی اور پھر یہ احساس کہ یہ سفید سفید میٹھی میٹھی چیز اس نے خود پکائی ہے، وہ پھونک پھونک کر حلوہ ٹھنڈا کرنے لگی تاکہ سایا کے آنے سے پہلے اسے کھا پی کر قصہ پاک کر دیں، ایاز اس کے لیے بھی ایک چمچہ لے آیا۔ وہ دونوں پھونکیں مار کر حلوہ ٹھنڈا کر رہے تھے کہ سایا اندر آئی اس کے ساتھ اس کی جگری دوست علی بی بھی تھی، سایا کو اس وقت اپنے اقتدار کا مظاہرہ کرنا ضروری تھا اس لیے اس نے حلوے کی رکابی اٹھا کر دیوار پر ٹیکی اور دونوں کے ایک ایک دھپ رسید کیا۔

"ایو، اماں کو کھا لیے دونوں لوٹے مل کر۔ میں کہیں نئیں دیکھا ای سونٹی پلّل، ایسے بچے۔"

وہ چلا چلا کر علی بی کی ہمدردی بٹور رہی تھی، علی بی نے بھی ایسے فتنوں کو دیکھنے

سے صفا انکار کر دیا۔

ایاز تو کتابیں سمیٹ کر باہر چلا گیا اور غزل میلے کپڑوں کے ڈھیر پر بیٹھی سسکیاں لیتی رہی، انگلی کی آگ بھڑک کر سارے بدن کو جھلسائے دے رہی تھی سامنے دیوار پر برکس کے داغوں کی طرح پھیلا ہوا حلوہ اس کے سینے پر چھریاں چلا رہا تھا، اگر وہ بھی ایاز کی طرح گرم گرم حلوے کے دو چار چمچے کھا لیتی تو محرومی کا احساس شاید اسے اتنا شدید نہ ہوتا۔

"ایاز بابو — ایاز علی شاہ" باہر شاہین چلا رہا تھا۔

غزل آنسو پونچھ کر اٹھ بیٹھی، وہ بچپن کا سوکھا دبلا بدھو شاہین اب بڑا فیشن ایبل اور چالاک لڑکا بن گیا تھا، وہ بات بات پر اب غزل کو احمق ثابت کر کے مانتا، اگر غزل کو روتا دیکھ کر حلوے کی کہانی سننا پڑی تو شاہین خوب مذاق بنائے گا، اس لیے غزل آنسو پونچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایاز کہاں ہے" شاہین سائیکل رکھ کر اندر آیا

"کہیں باہر گیا ہے۔" غزل نے سسکیاں روک کر جواب دیا۔

شاہین نے بڑے غور سے غزل کو دیکھا اور بجائے اس کے کہ وہ غزل کے رونے کا مذاق اڑاتا اس نے آہستہ سے کہا۔

"لاحول ولا — جدھر جاؤ آنسو — رونا دھونا۔ آج چاند آپا آئی ہیں، بس وہ بھی روئے جا رہی ہیں۔"

"کیا چاند آپا آ گئیں۔" غزل خوشی کے مارے اچھل پڑی اور شاہین کی خوشامد کرنے لگی کہ وہ اپنی سائیکل کے پیچھے بٹھا کر "ایوان غزل" پہنچا دے، پہلے تو شاہین حسب عادت ٹالتا رہا پھر کہا:

"مگر ایک شرط ہے تم اپنے گندے ہاتھ میری سفید قمیص پر نہیں لگاؤ گی۔"

"اللہ! میں تمہیں پکڑوں گی نہیں تو گر جاؤں گی۔"

"وہ سب ہم نہیں جانتے۔" اس نے لاپرواہی سے کہا۔

"اچھا چلو ایاز صورت، ہمیں بھائی بھی ملے ہیں تو کیسی ڈری صورت والے۔" وہ بڑبڑانے لگی۔

"ابے او پوٹی — ڈری صورت بولی تو راستے میں چھینک دوں گا۔" شاہین نے دھمکی دی۔

"ہاں تو پٹک کر تو دیکھ تیری ساری سفید قمیص کو ہاتھوں سے میلا کر دوں گی،" وہ راستے بھر شاہین سے لڑتی رہی، اور "ایوان غزل" پہنچتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ شاہین اسے زبردستی لایا ہے، تاکہ کھانے کے وقت لنگڑی پھوپو سالن کی کمی اور مہنگائی کا رونا شروع کر دیں۔ چاند آپا چپ چاپ رضیہ خالہ کے کمرے میں بیٹھی کچھ لکھ لکھ کر پڑھ رہی تھیں پہلے تو غزل کو جھجک سی ہوئی کہ انہیں چاند آپا سمجھے یا کوئی ٹمٹماتا ہوا تارہ، ان کے چہرے پر جھلکتی ہوئی رنگوں کی لہریں جانے کس نے پونچھ ڈالی تھیں — وہ لہریے دار چمکیلے بالوں کے گھونگھر و اب مرے ہوئے سانپوں کی طرح سیدھے سیدھے لٹک رہے تھے، دہکتے ہوئے گالوں پر سیاہ دھبے ابھر آئے تھے، ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے چاند آپا کو سندور رنگ میں غوطہ دے کر چھوڑ دیا ہو — وہ ڈری ڈری سی تنگ چاند آپا کے سامنے بیٹھی جمائیاں لیتی رہی اور ہاتھ پاؤں ٹیکتی رہی مگر وہ تو جیسے اپنی جھکی ہوئی گردن کو اٹھانا ہی بھول چکی تھیں، وسالے میں تخت پر بیٹھی فوزیہ بڑی شان بے نیازی سے بی بی کی ساری کاٹ رہی تھی۔ بی بی، رضیہ اور لنگڑی پھوپو اپنے اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھے تھے — غزل بھی فوزیہ کے پاس جا بیٹھی۔

"چاند آپا کے دولہا کہاں ہیں —!" اس نے آہستہ سے کہا

"دولہا" فوزیہ نے بالکل لنگڑی پھوپو کے انداز میں ناک پر انگلی رکھ کر کہا

"چاند آپا کی شادی کب ہوئی۔"

"اچھا — کیوں —؟" غزل دل ہی دل میں خوش ہوئی کہ چاند آپا کی شادی میں چکسا لگانے، ڈھولک بجانے اور دولہا کا جوتا چرانے کا ارمان پورا ہو سکتا ہے۔"

"واہ حضت اب ان کی شادی کسی موچی سے کریں گے۔" فوزیہ کی بات پر غزل کو ہنسی آ گئی۔

"تو پھر اتنے دنوں سے چاند آپا کہاں تھیں، ان کی خوب صورتی کہاں کھو گئی! وہ گردن جھکائے کیوں بیٹھی ہیں۔۔!" غزل سوچے جا رہی تھی۔

"چاند آپا جانے کہاں کہاں سنجیوا کو ڈھونڈتی پھریں، چاند آپا نے اس سے کہا کہ پارٹی کا کام چھوڑ دو۔ وہ بھائی صاحب سے کہہ کر سنجیوا کو نوکری دلوا دیں گی، مگر سنجیوا نہیں مانا، بعد میں اس نے چاند آپا کو خط لکھ دیا کہ کسی اچھے آدمی سے شادی کر کے مزے میں رہو، یہ سن کر چاند آپا بیمار پڑ گئیں، انہیں ٹی۔ بی ہو گئی ہے، ڈیڈی انہیں بمبئی کے ایک ہاسپٹل سے لائے ہیں، ڈیڈی کے کسی دوست نے آ کر بتایا تو بی بی نے زبردستی ڈیڈی کو بھیجا تھا۔"

فوزیہ آہستہ آہستہ کہے جا رہی تھی، اس کے لہجے میں چاند آپا کے لیے سخت نفرت اور حقارت تھی، فوزیہ کی کھسر پھسر سننے کے لیے غزل اس پر جھک گئی تھی، اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور نہ جانے کیوں خوب رونے کو جی چاہ رہا تھا۔۔ "اگر چاند آپا کی شادی ہوئی تو میں ہرے مخمل کا سوٹ سلواؤں گی۔"

فوزیہ نے یوں دوپٹہ سینے پر پھیلا کے کہا جیسے بہت کچھ چھپائے بیٹھی ہو۔ غزل بھی اس کی تائید کرنے والی تھی، مگر ہرے مخمل کا سوٹ اسے سو بار مرنے کے بعد بھی نہ ملتا، اس لیے وہ بڑے چاؤ سے بولی۔

"اور اپن لوگ خوب مہندی لگا کر گانے گائیں گے نا۔۔؟"

آج جانے کیسے فوزیہ اس بات پر متفق ہو گئی اور ساری کے اوپر سوئی دھاگہ پھینک پھانک وہ دونوں بھاگیں باغ میں رات کی رانی کی کلیاں چننے، مگر آج جانے کیوں وہ دونوں اس کام سے بور ہو گئیں اور چھت کی طرف بھاگیں، تیرہ چودہ برس کی فوزیہ جب سیڑھیاں چڑھتی تھی تو چوبی تختے اس کے بوجھ سے ہلنے لگتے تھے، غزل بھی اس سے کچھ کم نہ تھی، دونوں کسی غیر مرئی تار کی طرح کھنچتی چلی جا رہی تھی۔۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دھن میں چھت پر پہنچیں تو خیال آیا کہ یہاں کیوں آئے، فوزیہ منڈیر پر بیٹھ کر نیچے نوکروں کے کوارٹروں کا معائنہ کرنے لگی اور غزل نے منڈیر پر سے وہاں چڑیا اور کوؤں کی بیٹ صاف کرنے کا عزم کر ڈالا۔۔ "جانے کب ہو گی چاند آپا کی شادی؟" غزل نے پھیلے ہوئے آسمان کو دور دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔۔ "ہشت۔۔ کون اجاڑ صورت مجھے گھور گھور کے دیکھ رہا ہے۔" فوزیہ نے برا سا منہ بنا کر سینے پر دوپٹہ سنبھالا اور غزل کے پاس آ بیٹھی۔۔ "یہ لکڑی بھوبوئیں نا بڑی خراب ہیں ماں۔"

"کیوں کیا کیے انوں۔" غزل آج فوزیہ کی ہر بات پر چونک پڑتی تھی۔

"انوں بولتے کتے اب چاند آپا سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔" فوزیہ نے رکتے رکتے کہا۔۔ "ادنہہ، ان کے بولنے سے کیا ہوتا! اللہ میاں ان کی شادی بھی کبھی نکو ہو۔" غزل نے یہ کوسنے خود لکڑی بھوبو سے ہی سیکھے تھے۔۔ 'اس دن ڈیڈی سے بولی تھیں کہ اب فوزیہ کی شادی جلدی سے کر دو۔" یہ بات کہتے وقت فوزیہ کا چہرہ سرخ مخمل بن گیا۔۔ "ہاہاہا۔۔" غزل جان بوجھ کر خوب زور سے ہنسی۔

"دادا حضرت بھی بڑے وہ ہیں۔۔" فوزیہ شر کے بغیر کہے گئی۔۔ "کہنے لگے کہ بیگم ٹھیک ہی کہی ہیں، لڑکیاں تو سانی پانی سے نکلی مچھلیاں ہیں۔۔ ایک دن بھی اٹھا کر رکھو تو بدبو کے مارے سارا گھر گندہ ہو جائے۔" ۔۔ فوزیہ کی بات سن کر اچانک غزل کو چاند آپا کا سڑی مچھلی کی صورت چہرہ یاد آیا اور وہ چپ ہو گئی۔

پھر فوزیہ غزل کے اور پاس سرک آئی اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ٹھنڈے ہاتھوں میں تھام کر اپنے ہونے والے دولہا کی خوبیاں اور خامیاں گنانے لگی، اس وقت اپنے دل کی بھڑاس نکلنے سے فوزیہ کے سر کا منوں بوجھ غزل کے دل پر جا پڑا تھا۔ فوزیہ غزل سے صرف دو مہینے بڑی تھی، اس کے باوجود غزل نے اس دنیا کے بارے میں کچھ نہ سوچا تھا جہاں فوزیہ جانے کب سے سیر کر رہی تھی، فوزیہ نے تو اپنے گھر شوہر کی محبت اور بچوں کی تعداد کے بارے میں بھی فیصلہ کر لیا تھا، کیا میری بھی شادی ہو گی! غزل نے پہلے کبھی یہ بات نہیں سوچی تھی، ابا بھی یہ بات تو اچھی طرح جانتے ہی ہوں گے کہ زیادہ سینت کر رکھنے سے لڑکیاں مچھلیوں کی طرح سڑ جاتی ہیں۔

وہ دونوں نیچے اتر آئیں تو غزل کی آنکھوں میں نئے نئے رنگ بھرنے لگے، چاند آپا

کی اداس صورت وہ بھول چکی تھی۔ آنگن میں اناج صاف کرتی ہوئی، کا ٹین کھاتی ہوئی لنگڑی پھوپو اور ساری دنیا سے بے خبر چپ چاپ تخت پہ بیٹھی ہوئی بی بی ـــــ ہر چیز گھوم رہی تھی۔ اپنے مرکز سے سرک چکی تھی ـ جیسے در و دیوار نے شراب پی لی ہو۔

"گجو یہاں آنا ـــ" چاند آپا اسے نہایت کمزور آواز میں بلا رہی تھیں۔

"ہشت، اس کے پاس مت جانا۔ ٹی بی ہے" لنگڑی پھوپو نے آہستہ سے کہا ـــــ مگر غزل کتیا کی طرح دانت نکوسے دوڑتی ہوئی ان کے پاس گئی۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ چاند آپا کے اداس چہرے پر اس کے تجسس سے کوئی خراش نہ پڑ جائے۔

"تم کبھی کلب جاتی ہو ـ ؟"

"اونہوں" غزل نے سر کے اشارے سے منع کیا۔

"بس آپ ہی کے ساتھ ایک دو بار گئی تھی۔"

"خیر، آج چلی جاؤ۔ مگر اکیلی جانا۔ یہ خط بھجان صاحب کو دے آؤ۔ کہنا آج ہی بابا کو بھجوادیں۔" انھوں نے ادھر ادھر دیکھ کر خط غزل کی مٹھی میں تھما دیا۔ پھر ایک روپے کا نوٹ بھی اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ چاند آپا کا حکم ماننا غزل کی سرشت میں داخل تھا۔ مگر اکیلی کلب جانا کوئی معمولی بات تھوڑی تھی۔ اور پھر اس راز میں شاہین یا ایاز کو بھی شریک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر یہ بات رضیہ ممانی تک پہونچ گئی تو وہ چاند آپا کو اور رلائیں گی۔ غزل سمجھ چکی تھی کہ اب اس گھر میں کسی کو چاند آپا سے محبت نہیں رہی تھی۔

آخر بڑی ہمت کے بعد گھر جانے کے بہانے غزل نے تانگہ منگوایا اور کلب پہنچ کر صرف پانچ منٹ کے لئے رکوایا۔

جانے کتنے چپراسیوں اور کلرکوں کے مرحلوں سے نبٹ کر وہ اندر پہنچی تو بھجان صاحب اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ بار بار اپنے گنجے سر پہ بال تلاش کر کے مسکراتے جا رہے تھے۔

"آپ تو اب بڑی ہوگئیں بی بی ـــ سچ مچ غزل بن گئیں، ایں ـــ؟"

وہ ہنس رہے تھے تو غزل کو بھی ہنسی آگئی۔ حالاں کہ بھجان صاحب کی نظروں سے وہ گھبرائی جا رہی تھی۔

پھر انھوں نے آئس کریم منگوائی۔ سینڈوچ منگوائے۔ بسکٹ اور دو پیسٹری آئی ـــ اور پانچ منٹ کی بجائے ایک گھنٹہ ہوگیا۔ چاند آپا کا وہ خط انھوں نے بغیر کھولے میز پر ڈال دیا اور غزل کو ایک مشکل شعر کی طرح مسکرا مسکرا کے پڑھتے رہے۔ بڑی دیر کی کوشش کے بعد جاتے وقت اس نے جواب مانگا تو بھجان صاحب نے پائپ سلگا کر کہا۔

"چاندنی سے کہنا کہ سنجیو اجیل میں ہوتا تو اس کا خط پہنچوانے کی کوشش کرتا ـــــ وہ تو انڈر گراؤنڈ ہے۔"

وہ گھر آئی تو ابا اور اماں کمرہ بند کر کے سو چکے تھے۔ ایاز لالٹین سامنے رکھے اونگھ رہا تھا ـــــ غزل نے آتے ہی وضو کر کے چار رکعت نماز پڑھی کہ اس کا راز افشا نہ ہو اور پھر دھڑکتے دل کو لیے پلنگ پر جا لیٹی ـــــ بھجان ماما کا گنجا چمکدار سر بار بار اس کے سامنے جگمگا رہا تھا۔ اور آئس کریم کی ڈکاریں ابھی تک آرہی تھیں۔ آج وہ یاد کر رہی تھی کہ جانے ابا نے چاند آپا کی کون سی کل چھولی تھی جو اس دن سے چاند آپا اسے بھی بھول بیٹھیں۔ ورنہ آج وہ بھی چاند آپا کی طرح سیکڑوں ڈراموں میں کام کر چکی ہوتی۔

دوسرے دن وہ کیچڑ میں سنی ہوئی گڑیا کی چوٹی باندھ رہی تھی کہ دروازے پر کار رکنے کی آواز آئی۔

"آج بی بی کیوں آئی ہیں ـــ؟" وہ باہر جاتے جاتے رک گئی۔ اور پھر جھری میں سے اماں کی طرح باہر جھانکنے لگی۔

بھجان صاحب ابا سے کہہ رہے تھے کہ بھارت کلا منڈل والے ایک بار پھر غزل کو اپنے ڈراموں میں لینا چاہتے ہیں۔ وہ ابا کو یقین دلا رہے تھے کہ غزل

ان کی نگرانی میں رہے گی۔

ایک دم وہ جیسے سلاخوں کو توڑ کے بھاگی۔ جی چاہا بھان ماما سے لپٹ جائے۔ مگر ابا کی موجودگی میں وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں ـــ ابا بھی اپنی مسرت کو دبائے مسکرائے جا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ یہ عذر بھی پیش کرتے کہ محض آپ کے حکم پر راضی ہو رہا ہوں ورنہ ہم مرشدزادوں میں لڑکیوں کو سخت پردے میں رکھا جاتا ہے۔

بھان صاحب نے اپنے کپڑوں میں جانے کون سا عطر لگایا تھا کہ سارا کمرہ گلزار بن گیا۔ بھان صاحب بیٹھے ہوئے تھے تو کمرے کی سیاہ چھت غزل کو ان کی شفاف چندیا میں نظر آ رہی تھی۔

چاند آپا بھان صاحب کے گنجے سر کا بہت مذاق اڑایا کرتی تھیں۔ چاند آپا بڑی بے رحم تھیں۔ ریاض تمنائی جب ان کے حسن کی تعریف میں نظم لکھ کر سناتا تھا تو اس کا اتنا مذاق بناتیں کہ وہ بیچارا رونے لگتا تھا۔ جو آنکھ انھیں دیکھتی وہ اسے کچل کر ہنسے جاتی تھیں۔ اور پھر کلب کے وہ دن بھی غزل کو یاد تھے جب سنجیوا اپنے سیاہ چہرے پر سیاہ بال بکھیرے، لاپرواہی سے کسی کونے میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ سلگائے جاتا تھا۔ اور چاند آپا تتلی کی طرح اس کے آس پاس منڈلائے جاتی تھیں۔ ایک بار پیچھے سے آ کر انھوں نے سنجیوا کے کاندھے پر ٹھوڑی ٹکا دی تھی تو اس نے ہاتھ سے ہٹا کر کہا تھا۔

"چاند پہلے سوچ لو۔ تم ایسے کب تک میرے ساتھ چلو گی؟"

اور چاند نے غزل کی موجودگی نظر انداز کر کے سنجیوا کے بالوں کو پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تم سامنے ہو تو میں کچھ نہیں سوچتی۔ جو ہونا ہے ہو جائے۔"

جانے چاند آپا کو وہ اجاڑ صورت کالا کلوٹا کیا پسند آ گیا تھا جس نے ان

کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ ایک بھان ماما ہیں کہ ابھی تک کتنے ہینڈسم ہیں۔ کتنے گریس فل ـــ

ان کی بڑائی سے تو غزل اور ہمایوں بعد میں واقف ہوئے، جب انھوں نے غزل کو اپنے کلب کا ممبر بنا کر چاند کو انگاروں پر لوٹنے کا سامان کر دیا۔ اس کے علاوہ بھان صاحب نے مکان کا کرایہ ادا نہ کرانے کی ترقی رکوا دی۔ ہمایوں کو آفس میں ترقی دلوانے کا وعدہ کیا۔ اور پھر اس بات کا بھی اقرار کیا کہ وہ "الف لیلہ میں" ہمایوں کا حصہ اس کے سوتیلے بھائیوں سے دلوا دیں گے۔

غزل کے تو ٹھاٹ ہو گئے۔ وہ ہر جگہ بھان ماما کے ساتھ کار میں گھومنے لگی۔ کلب کے سارے ممبر غزل کی طرف دیکھنے لگے۔

بلگرامی تک اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ حالاں کہ بلگرامی کا ایرانی حسن اسے خواتین میں بیحد مقبول بنائے رکھتا تھا اور ہر خاتون کا خیال تھا کہ بلگرامی پر جیسے ہی کسی فلم ڈائرکٹر کی نظر پڑے گی وہ بمبئی اڑ جائے گا۔ اس لیے سب کی کوشش ہوتی کہ مستقبل کے اس اشوک کمار کے ساتھ اپنے تعلقات کو جہاں تک ہو سکے آگے بڑھائیں۔ ویسے بھی بلگرامی کے سنہرے بال، گورا رنگ اور خوب صورت بدن کو دیکھ کر عورتیں بے قرار ہو جاتی تھیں، مگر غزل کبھی اس کی طرف نہ دیکھتی۔ کیوں کہ بھان ماما نے ایک بار اسے بتایا تھا کہ بلگرامی سے بچ کر رہنا۔ وہ بڑا بدمعاش ہے۔ اور وہ بلگرامی کے سائے سے بھی بچنے لگی۔ یوں بھی بھان ماما کا حکم ماننا اس پر فرض تھا۔ کیوں کہ وہ نہ صرف اس کے ابا پر احسان کئے جا رہے تھے۔ بلکہ انھوں نے غزل کو بھی تحفے دینا شروع کر دیئے تھے۔ شرٹس کے پیس، دوپٹے، سونے کا لاکٹ اور نئی نئی قسم کی چپلیں ـــ

پھر ایک بار بھان ماما نے اسے ساری پہننے کا مشورہ دیا۔ اور پھر خود ہی اس کے لئے اکٹھی پانچ ساریاں لے آئے۔ ایسی قیمتی اور خوبصورت ساریاں کہ چاند آپا کی الماری میں بھی نہ ہوں گی: اس کے ساتھ لپ اسٹک، پاؤڈر

اور جانے کیا کیا میک اپ کا سامان تھا۔ غزل کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان چیزوں کو کہاں اور کیسے استعمال کرے؟

جب کبھی شام کے وقت بھان ماما اسے پکچر لے جانے کے لیے آتے تھے تو ابا ڈرتے ڈرتے منع کرتے اور پھر خود ہی غزل کو جلدی سے تیار کر دا دیتے تھے۔ ایک دن بھان ماما اسے اپنے گھر لے گئے۔

ان کا بنگلہ تھا کہ کسی بادشاہ کا محل۔ غزل نے زندگی میں کبھی اتنا خوب صورت مکان نہ دیکھا تھا۔ مگر اس گھر میں نوکروں کے سوا اور کوئی نہ رہتا تھا۔ ایک بار چاند آپا نے بتایا تھا کہ بھان صاحب کی اپنی بیوی سے نہیں بنتی۔ اس لیے وہ دو تین مکان بیچ کر ایک چھوٹے سے گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ علیحدہ رہتی تھیں اور چاند آپا کے کالج میں پڑھاتی تھیں۔ ایک لڑکی تھی جو چاند آپا کے ساتھ ہی میڈیکل کالج میں پڑھتی تھی اور ایک لڑکا تھا جو اب شاہین کا بڑا دوست بن گیا تھا۔ روز شام کو وہ ایوانِ غزل آتا تھا۔ شاہین کے ساتھ کرکٹ کھیلنے۔ غزل نے چاند آپا سے ان کے بہت سے قصے سنے تھے کہ اتنے اچھے بھان صاحب سے ان کے بیوی بچوں کو سخت نفرت تھی۔ شاہین نے ایک بار کہا کہ بھان صاحب چاند آپا کے ساتھ کہیں جا رہے تھے تو ان کی بیوی نے غصہ سے کہا:

"بوڑھے بندر کو کچی کیریاں کھانے کا بڑا شوق ہے۔"

غزل کا جی چاہتا تھا کہ کبھی بھان ماما کی بیوی سے جا کر خوب لڑے کہ انھوں نے اتنے اچھے آدمی کو کیوں چھوڑ دیا ہے۔ ایسا سخی انسان، اتنا اچھا بنگلہ اور کیا چاہیے انھیں — بلکہ ایک دن تو اس نے وہاں جانے کا پکا ارادہ کر لیا لیکن بھان ماما نے روک دیا کہ نہیں میری طرف داری کرتے دیکھ کر وہ اور جلے گی۔

اب غزل کا زیادہ وقت بھان ماما کے ہاں گزرتا تھا۔ شام کی چائے وہیں پیتی۔ آفس سے ہمایوں بھی وہیں چلا جاتا تھا اور بیٹھا بھان صاحب کو روغن

قاز ملا کرتا۔ ہمایوں کے باپ کے آگے لوگ سجدہ کرتے تھے۔ اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے ملتے اور ان کی آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔ ہمایوں جانتا تھا کہ کسی چڑیل نے اس سحر کو توڑ دیا ہے اور وہ الف لیلہ کے عیش و آرام سے اٹھا کر اسے بھوتوں کے مسکن میں چھوڑ گئی ہے اب یہاں کبھی ایک خدا کی حکمرانی تھی۔ جس کے آگے سجدہ کرتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کے اعجاز سے چودہ طبق روشن ہو سکتے ہیں۔

غزل اب بڑی سگھڑ ہو گئی تھی۔ وہ بھان ماما کے لیے چائے بناتی ان کے نہایت چھچھورے اور بڈھے دوستوں کی خاطر تواضع کرتی۔ ایک بار ان کے کسی دوست نے غزل کو گھر میں دیکھ کر بھان سے کہا۔

"تو کیا نئی کار آ گئی آپ کے ہاں؟"

"ابھی نہیں" انھوں نے اطمینان سے سگریٹ سلگا کر کہا۔ "اس معاملے میں جلدی نہیں کرنا ہے۔"

"کون سی کار ماما —؟" غزل نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"اور وہ پہلے والی —؟" ان کے دوست نے غزل کی موجودگی نظر انداز کر کے کہا۔

"ارے وہ تو اب بہت پرانی ہو گئی ہے"

"سنا ہے بیمار ہے —؟"

"ہاں ایک کمیونسٹ چھوکرے کے عشق میں۔"

بھان ماما نے کسی کام سے غزل کو اندر بھیج دیا تو وہ پلنگ کے کونے پر جا بیٹھی۔ یہ سب چاند آپا کی باتیں ہو رہی تھیں — وہ کیا اتنی نا سمجھ ہے — یہ بھان صاحب کیسے بے درد ہیں۔ سامنے تو چاند آپا کی کتنی تعریفیں کرتے تھے اور آج انھیں پرانی موٹر بنا دیا جانے اب کون سی نئی موٹر خریدنے والے ہیں؟"

ایک غیر محسوس سا خوف اسے چاروں طرف سے گھیرنے لگا۔ بی بی ٹھیک

کبھی تو کہتی ہیں یہ غیر لوگ ہمارے کون ہیں۔ میں کیوں یہاں آئی ہوں۔ لوگ سمجھتے ہوں گے۔ غریب لڑکی ہے۔ یہاں خوب اچھی اچھی چیزیں کھانے کو ملتی ہیں۔ اس لیے ندیدے پن میں آجاتی ہے۔ اب بیچارے بھان ماما اتنے خلوص سے بلاتے ہیں تو انکار کیسے کیا جائے۔ انھوں نے اتنے ابا کے بگڑے کام بنا دیئے۔ جانے کتنے سو روپے تو انھوں نے ابا کو ابھی تک قرض دیئے تھے۔ جبھی تو وہ ضرورت سے زیادہ ان پر مہربان ہوئی جاتی تھی۔ بھان ماما کا ہر حکم سر آنکھوں پر لینا پڑتا۔ ان کی نہایت بے تکی باتوں پر وہ زبردستی ہنستی۔ جس وقت وہ لڑکھڑاتے ہوئے جانے کیا اول فول بکنا شروع کرتے تھے۔ تب بھی غزل ان کے ساتھ ہنسی مذاق کیے جاتی۔ حالاں کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح یہاں سے بھاگ جائے۔ مگر وہ بار بار غزل کو ستاتے۔ کھاتے کھاتے اس کی پلیٹ چھین لیتے۔ پیچھے سے اچانک آکر آنکھیں بند کر دیتے۔ اور پھر ایک بار انھوں نے کھیل میں غزل کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا تو وہ بہت گھبرا گئی۔ اس نے جانے کیسے ماما کو ڈھکیل دیا اور ایک انجانے خوف سے وہ کمرے سے باہر جو بھاگی تو گیٹ سے باہر تھی۔

جانے کیوں اس دن بھان ماما سے بہت ڈر لگ رہا تھا جیسے وہ اتنے اچھے خلوص والے انسان نہیں کوئی اور آدمی بن گئے ہوں۔ ایک اجنبی۔ خوفناک صورت والے اور پھر کئی دن تک وہ بھان صاحب کے گھر نہیں گئی تو ایک دن انھوں نے آکر خوب شکایت کی۔

"غزل ہم سے خفا ہے۔ اس لئے اب ہم بھی کھانا نہیں کھائیں گے۔"

"نہیں ماما میں کیوں خفا ہوتی آپ سے" دل ہی دل میں وہ بے حد شرمندہ تھی کیسے اچھے ماما تو ہیں۔ اس کا اتنا خیال کرنے والے۔ غزل اجاڑ صورت۔ تجھے کبھی کسی نے اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔ !کوئی تیرے خفا ہونے سے کھانا چھوڑ سکتا ہے۔ اور تو ہے کہ اترائی جا رہی ہے۔ دیکھ لے چاند آپا کا حشر۔ اتنا غرور نکو کہہ

منحوس صورت پوتی۔

وہ بڑی دیر تک اپنے آپ کو خود ہی گالیاں دیتی رہی۔ اس نے کئی بار دل کی دوسری اور خواہ مخواہ کے اندیشے ظاہر کرنے پر اپنے آپ کو خیال ہی خیال میں گی لاتیں ماریں۔ کس کس کر۔۔ اور بس پھر وہ ہلکی پھلکی ہو گئی۔۔ جیسے ابا کے جوتے کھانے کے بعد ہو جایا کرتی تھی۔

اس نے تصور میں اپنے آپ کو بہت بڑا دیکھا۔ چاند آپا کی طرح اونچی پوری تنی بنی۔ اہم شخصیت کی مالک۔۔ لوگ اس کے وجود کو اہمیت دیتے ہیں۔۔ اس کی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔ یہ کیسا عظیم واقعہ تھا۔ دنیا کا سب سے ناقابل یقین حادثہ۔ اور ان بھان ماما کو وہ کیا کرے! کیسے ان کی قدر کرے۔ ایسے انسان کی جو غزل جیسی حقیر اور غیر اہم ہستی کو اتنی اہمیت دے رہے تھے۔

اب اسے بھی چاند آپا کی طرح سوسائٹی میں بیٹھنے کے طور طریقے آ گئے تھے۔ پھونکیں مار مار کے چائے پینا اب اس نے چھوڑ دی تھی۔ سامنے چاہے کتنی ہی مزیدار چیزیں رکھی ہوں۔ مگر جب تک ایک چیز ختم نہ ہو جائے دوسری ہرگز نہ اٹھائے۔ جیسے ہی سب کھانا ختم کر کے اٹھتے تھے وہ بھی گودے کی ہڈی توڑنے کی کوشش چھوڑ کر اٹھ جاتی تھی۔

اب کئی ڈراموں میں اسے ساری باندھنا پڑی۔ مگر ساری پہننا بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ کتنے ہی چکروں میں لپیٹو مگر پھر بھی ڈھیروں کپڑا بچ جاتا تھا۔ یہاں بھی بھان صاحب کام آئے۔ کیوں کہ وہ صرف ایک بزنس مین ہی نہیں تھے۔ بلکہ بھارت کلا منڈل کے پریسیڈنٹ بھی تھے۔ اس کے علاوہ ڈرامے لکھنے کے فن سے لے کر میک اپ کے جدید فن سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ غزل کو نئی طرح سے بدن کے ساتھ لپٹی ہوئی ساری پہننا بھی انھوں نے ہی سکھایا۔ مرنے سے پہلے اکثر اماں کہا کرتی تھیں۔ اللہ جانے کہاں ہے۔ میری کیوں نہیں سنتا۔۔؟

اور اماں کے بعد ہر مصیبت کے وقت ہمیشہ ٹپتے وقت وہ بھی آسمان کی وسعتوں میں

اللہ میاں کو ڈھونڈتی۔ مگر کبھی اللہ میاں اسے نظر نہیں آئے۔ جانے وہ کتنی دور ہیں کبھی کسی کی فریاد نہیں سنتے — مگر اب اللہ نے اس کی سن لی تھی۔ وہ جو ہر نماز کے بعد سچ مچ سجدے میں گر کر جانماز بھگو دیتی تھی — جانے اللہ میاں سے کیا مانگتی۔ صرف اس کے ہونٹ لرزتے رہتے۔ ہاتھ پھیلے ہوئے۔ اور اس کا چہرہ آنسوؤں میں ڈوب جاتا — کیا اللہ میاں سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ باقاعدہ اپنی خواہشوں کی لسٹ انھیں سنائی جائے —؟ پھر بھی اکثر غزل نے سوچا کہ وہ کیا چاہتی ہے تو وہ خود بھی اپنی کسی خواہش کا تجزیہ نہ کر سکی — مگر ایک بار جب ابا کی باتوں سے دکھتا ہوا بدن لیے وہ اپنی پلنگ پر کروٹیں بدل رہی تھی تو اسے اس بات پر رونا آیا تھا کہ اپنا دکھ وہ کیسے سنائے —؟ اس دنیا میں اس کا کون تھا؟ اور پھر جانے کس خوف سے وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گئی — اندھیرے میں اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ابا اور سایا دوسرے کمرے میں تھے۔ اس کے پاس دوسرے پلنگ پر ایاز کسی گہری نیند میں مست تھے اس کی طرف سے کروٹ لیے — سب ہی اس کی طرف سے منہ پھیرے ہوئے ہیں — اس اندھیرے کے جنگل میں — خاموشی کے ناپیدا کنار سمندر میں، میں اکیلی ہوں —— اس کے دل پر جیسے کوئی بھاری پتھر گر پڑا —— یوں لگا جیسے اسے اکیلا پاکر سامنے سے بھوتوں کے قافلے آرہے ہیں۔ خوفناک درندے اس کی تاک میں کھڑے ہیں — اور پھر ایک کالا بھجنگ شیطان اس کی طرف بڑھا۔ سرخ سرخ زبان نکالے — اس کی آنکھوں میں شعلے دہک رہے تھے۔ اور ناخن خنجروں کی طرح مڑے ہوئے تھے —— نہیں نہیں —— ابا — ایاز — بھائی مجھے بچاؤ — بچاؤ۔ وہ چیخ مار کے بیہوش ہوگئی — سب اٹھ گئے —— اس دن سے ایک نئی مصیبت نے آگھیرا — دوسرے تیسرے دن اسے چلانے اور ڈرنے کا دورہ پڑنے لگا — جیسے ہی وہ اکیلی ہوتی اور خوفناک آنکھوں والے شیطان اسے چاروں طرف سے گھیر لیتے —

"جمعرات کے دن دونوں وقت ملتے ممیا نہا کر چھت پر ٹہلی ہوگی۔ کوئی سایا

ہے۔ بی بی نے نہایت وثوق سے کہا۔

"میں شاہ صاحب کے پاس لے جاؤں گی۔ ایک تعویذ میں ٹھیک ہو جائے گی" لنگڑی پھوپو نے تسلی دی۔

اس نے جانے کتنے فلیتے گھول کر پی ڈالے۔ لیکن ان بھوتوں کی تعداد بڑھتی ہی گئی اسی لیے وہ بھان ماما کے ہاں زیادہ وقت گذارتی۔ لیکن یہ بات "ایوانِ غزل" میں کسی کو پسند نہیں تھی۔

ایک دن فوزیہ نے اپنی لمبی ناک سکیڑ کر کہا۔

"چھی تم نے اپنے لیے کیا سڑی صورت بڈھا دولہا ڈھونڈا ہے غزل — اتنے تو ڈیڈی سے بھی بڑے ہی لگتے۔"

فوزیہ کی اس غلط فہمی پر وہ بہت ہنسی۔ خفا بھی ہوئی۔ بھان صاحب تو اس کے ماما تھے۔ اب اگر اپنے ماما سے ہنسی مذاق کر دیا ان کے گھر چلے جاؤ تو کیا یہ کوئی بری بات ہوئی ہے؟ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ بھان ماما اس کے کون تھے! وہ اس کے مشکل کشا تھے۔ جنہوں نے اس کے سر پر اپنی مہربانیوں اور احسانوں کا اتنا بوجھ رکھ دیا ہے۔

مگر گھر آنے کے بعد فوزیہ کی بات یاد کر کے وہ بہت روئی۔ اللہ میاں۔ لوگ کتنے جل ککڑے ہوتے ہیں۔ کسی کی کوئی خوشی برداشت نہیں کر سکتے۔ اس دن نماز کے بعد اس نے بھان ماما کی بیوی کے واپس آنے کی دعا مانگی۔ تاکہ سب لوگ ایسی گندی باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ کئی بار اس نے سوچا کہ بھان صاحب کے ہاں جانا چھوڑ دے مگر گھر میں بھی جی لگتا نہ تھا۔ حالاں کہ ایاز کے سوا سب ہی اس پر مہربان ہوگئے تھے۔ ابا تو جیسے زندگی بھر کی بے التفاتی کا کفارہ ادا کر رہے تھے سایا بھی اب بغیر مانگے کھانا دینے لگی تھی۔ مگر ایاز کو فوزیہ اور بی بی نے جانے کیا پٹی پڑھائی تھی کہ اسے غزل کا باہر گھومنا اور بھان کے ہاں جانا قطعی پسند نہیں تھا اس نے کئی بار اسے روکا۔ مارا — تو تو میں میں ہوئی — اور پھر یہ بھی دھمکی دی

کہ اگر پھر کبھی بھان ماما کے ساتھ کہیں گئی تو ایاز گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ شہزاد اسی طرح گھر چھوڑ کر جو گیا تو۔۔۔ پھر نہیں آیا۔ اس لیے ایاز کی اس دھمکی پر وہ سہم گئی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ ایاز کو نوزیہ نے بھڑکایا ہے۔ کیوں کہ وہ غزل سے بہت جلتی تھی۔ سب ہی کو اس پر غصہ آتا تھا۔ خاص طور سے چاند کو بھان کے ہاں غزل کا جانا بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ کئی بار اپنی کمزور آواز میں چاند نے اسے ڈانٹا کہ بھان سے مت ملو۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔

ارے جاؤ چاند آپا۔۔۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

بھان سے اچھا کون آدمی ہے؟ ہمیں بتاؤ نا۔۔۔! تم تو خود ہی جھگڑالو تھیں۔ ہر ایک سے لڑ جھگڑ کر آگئیں۔ اب میں کیا کروں۔۔۔؟ کہاں جاؤں۔۔۔ اگر بھان ماما نہ ہوتے تو اب تک ابا اس کا قیمہ بنا کر چیل کوؤں کو کھلا دیتے۔

پھر ایک دن چاند نے ہمایوں کو خط لکھا کہ وہ غزل کو بھان کے ہاں نہ جانے دے۔ اس نے بھان کے کردار کے نہایت گھناؤنے پہلو دکھائے تھے۔ وہ خط ہمایوں نے بھان کو دکھا دیا۔

پھر ایک بار ہمایوں سے لنگڑی پھوپو کا مچیٹا ہوا۔ بعد میں واحد حسین اور راشد بھی ایک بار سمجھانے آئے۔

ہمایوں کہتا تھا کہ وہ لوگ چاہتے ہیں غزل ہمیشہ نوزیہ کی اترن پہنے۔ فقیر کی طرح ان کی جھوٹن کھانے کو وہاں پڑی رہے۔ یہ باتیں غزل کو بھی سچ لگتی تھیں۔ ہمایوں کہتا تھا کہ سارے سسرالیے اس کے دشمن ہیں۔ بتول کی زندگی میں جب ہمایوں "الف لیلیٰ" سے نکالا گیا تو کبھی نانی کو بچوں کے مستقبل کی فکر نہ ہوئی اب جب غزل اتنی محنت کے بعد اعلیٰ سوسائٹی میں پہنچ گئی ہے تو سب کے سینوں پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔

غزل ایک دن بھارت کلا منڈل کے آفس میں بیٹھی بھان صاحب کا انتظار کر رہی تھی کہ بلگرامی آگئے۔ بلگرامی بھان صاحب کے دوست تھے اور بھارت کلا منڈل کے ہر ڈرامے میں چاند کے ساتھ ہیرو بنتے تھے۔ بہت ہی خوب صورت، صحت مند اور خوش مزاج۔ جب غزل چھوٹی سی تھی اور چاند آپا کے ساتھ یہاں آتی تھی تب بھی وہ بلگرامی کو دیکھے جاتی۔ یوں جیسے ایک خوب صورت گڈے کو دیکھتی تھی۔ سنا ہے بلگرامی کی اداکاری کی دھوم بمبئی تک مچی ہوئی تھی۔ جس وقت وہ اسٹیج پر چاند آپا کے ساتھ آتے تو یوں لگتا جیسے پری چہرہ نسیم اور پریم ادیب کی جوڑی آگئی ہو۔ اسی لیے جس دن سے چاند بھارت کلا منڈل سے نکلی۔ بلگرامی کو کسی لڑکی کے ساتھ کام کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ویسے وہ ہر لڑکی سے خوش مزاجی سے ملتے تھے۔ خصوصاً غزل کو تو چھوٹی بچیوں کی طرح گود میں اٹھا لیتے تھے۔ ایک آدھ بار انھوں نے بھان صاحب سے کہا بھی کہ اب غزل کو اونچی ایڑی کا سینڈل پہنا کر ان کے ساتھ ہیروئن بنا دو۔ لیکن بھان صاحب نے یہ بات نہیں مانی۔ حالاں کہ بھان صاحب نے بھی سنا تھا کہ عورتوں کی طرح بلگرامی پر مرتے تھے۔ اور بلگرامی کے عاشقوں میں خواتین کے علاوہ بہت سے حسن پرست مرد بھی شامل تھے پھر سنا ہے چاند ہی کے سلسلے میں ایک بار بلگرامی سے بھان صاحب کی کچھ تلخ کلامی ہوگئی غزل کو یہ بات ذرا اچھی نہ لگی تھی۔ یوں بھی کلا منڈل میں آئے دن جوتم پیزار ہوا کرتی تھی۔ کل عطیہ کی وجہ سے وائلن بجانے والے روی اور میک اپ مین سعادت میں لڑائی ہوگئی۔ پھر کسی لے

بلگرامی اور بھان صاحب کے رشتے پر ہنسی مذاق کیا اور بلگرامی منہ سجائے بیٹھا ہے۔ کسی دن بلگرامی نے چاند کے بارے میں بھان صاحب سے کچھ کہہ دیا اور بھان صاحب ایک ایک سے نبٹتے پھر رہے ہیں۔ یوں بھی بلگرامی تو سب ہی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتا تھا۔ سب ہی اس کی خوب صورتی اور مقبولیت سے جلتے تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ باپ رائل فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔ ماں ایرانی نژاد تھی اور گرلز کالج میں فارسی پڑھاتی تھی۔ بلگرامی میں ایران کی خوب صورتی تھی اور شاہی خون کی نخوت اور جاہ و جلال بھی۔ ماں کی ذہانت اور باپ کی عیش پسندی بھی اس کے خون میں شامل تھی۔

جاگیردار کالج سے بی۔ اے میں تین بار فیل ہونے کے بعد اس نے پڑھنا چھوڑ دیا اور گانے اور ایکٹنگ کی طرف نکل گیا۔ حیدرآباد کی ہر محفل موسیقی میں وہ ضرور شریک ہوتا۔ پھر جب عثمانیہ کے طالب علموں نے ڈرامے اسٹیج کرنا شروع کیے تو ان ڈراموں کا ہیرو بلگرامی ہی ہوتا تھا۔ اس کی سبز آنکھوں، سنہرے بالوں اور چمکدار ایرانی رنگت کی طرح اس کی آواز میں بھی بڑا جادو تھا، جو کنواری، بیاہی، سب ہی کو اس کے قدموں میں لا ڈالتا تھا۔ اکثر جب وہ غزل کے ساتھ کوئی ڈوئٹ گاتا تھا تو اس کی بال سر سے گرجدار آواز میں غزل کی بے سری باریک آواز چھپنے لگتی تھی۔۔۔ مگر پھر بھی وہ غزل کی بہت تعریف کرتا تھا تو خیر۔۔۔ آج بھی بلگرامی آئے تو انھوں نے تنہا بیٹھی ہوئی غزل کی اداسی پڑھ لی۔

"آج کل آپ مجھے اکثر اداس سی نظر آتی ہیں۔۔؟" بلگرامی پہلا آدمی تھا جو اسے "تم" کی بجائے "آپ" سے مخاطب کرتا تھا اور اس طرح غزل کو فوراً اپنے بڑے پن کا احساس ہوتا۔

"نہیں تو۔" بڑی دیر سے دبی ہوئی آہ اس کے دل سے نکلی اور وہ چونک پڑی۔ کیا اس کی اداسی اتنی اہمیت رکھتی ہے۔ لوگ تو اسے رلا کر مار کر بھول جاتے ہیں۔ بلگرامی نے اسے اتنے غور سے کیوں دیکھا۔۔؟ وہ جیسے کسی گرمی سے موم کی طرح پگھلنے لگی۔

"آپ شاید اپنے مستقبل کے لئے فکرمند ہیں؟ آپ جیسی خوب صورت آرٹسٹ کا مستقبل واقعی شان دار ہونا چاہئے۔"

وہ غزل کے قریب آ بیٹھا۔ اب وہ کیسے کہتی کہ اللہ کے لیے اتنی عنایت مت کرو، اتنے میٹھے لہجے میں بات مت کرو کہ مٹھاس کا زہر میری رگ رگ کو کاٹ دے۔

"ہونا ہی چاہئے۔" وہ غزل کو دیکھے جا رہا تھا۔

یہ سب بھان صاحب کی حماقت ہے۔ آپ جیسی آرٹسٹ اگر میرے ساتھ ہوتی تو جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ بھان صاحب کو برا کہنا اسے اچھا نہ لگا۔ مگر آج جانے منہ کو کیا ہو گیا تھا کہ کوئی بات نہ نکل سکی۔

سچ پوچھیے تو بھان صاحب کو اپنی عشق بازیوں سے فرصت ہی نہیں ہے اس لیے کلامنڈل میں کوئی ڈھنگ کا کام نہیں ہو رہا ہے۔"

"اب مارچ میں شوکت تھانوی کا ڈرامہ۔" بڑی مشکل سے اس کی زبان ہلی۔

"نہیں جی۔ یہ لوگ اب کوئی کام نہیں کریں گے سوائے عشق بازی کے۔" بلگرامی نے غزل کی بات کاٹ کے سگریٹ سلگایا۔ غزل سر جھکائے اپنے پرس کے ستارے نوچے جا رہی تھی۔

"بیچاری چاند کو بھان صاحب نے برباد کر کے چھوڑا۔ اور اب آپ کی باری۔۔۔"

پھر وہ جھٹ بات چھوڑ کے دوسری بات لے بیٹھا۔

"حیدرآباد آرٹ سوسائٹی والے تو اس سال اپنا ڈرامہ لے کر بمبئی جا رہے ہیں۔۔۔"

مگر غزل کے سینے پر تو کسی نے خنجر مار دیا تھا۔ چاند آپا کو بھان نے برباد کیا اور اب میری باری ہے۔۔! تو کیا سچ مچ بھان مجھ سے عشق کرتا ہے۔۔۔ ہائے اللہ اب کیا ہوگا!

"ہونہہ جانے دو نہیں کیا۔" اس کا جی چاہ رہا تھا اب اٹھ کر بھاگ جائے۔ بلگرامی اس کی ساری حقیقتوں سے واقف تھا۔

"میں بھی سوچ رہا ہوں کہ اب حیدرآباد آرٹ سوسائٹی میں چلا جاؤں۔ کلامنڈل کو چھوڑ دوں۔" اس نے اپنے چہرے پر اشوک کمار کی اداسی طاری کر کے کہا۔

"کہیں۔۔۔؟" غزل کو جیسے کسی نے دھکا دے دیا۔ اب بھان صاحب سے بھاگ کر وہ کہاں جائے گی۔ کون اسے اتنی عزت دے گا۔

"کیا کریں۔۔۔! یہاں کسے ہماری پروا ہے۔؟"

اس نے غزل کے چہرے کو غور کر کے دیکھا۔

"مگر سب لوگ آپ کی اداکاری کو بہت پسند کرتے ہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے لوگوں کی رائے کی کوئی پرواہ نہیں۔ سچ پوچھیے تو میں صرف آپ کی خاطر یہاں پڑا ہوا ہوں۔"

میری خاطر۔ میری خاطر۔ میری خاطر۔ میرے لیے۔ یہ اتنا خوبصورت آدمی۔ اتنا بڑا آدمی ۔ اتنا مشہور۔ اس کی ہر ہر ادا پر چاند سے لے کر رضیہ ہمانی تک مرتی تھیں۔ اس کے پیچھے عورتیں آٹوگراف بک لیے پھرتیں۔ یہ خوب صورت شہزادوں کی صورت ہیرو میرے لیے ۔۔ یا اللہ آج کیا ہو رہا ہے۔ کہیں میں مر نہ جاؤں ۔۔ بلگرامی کا وہ جملہ جانے کتنے رنگوں میں ڈوبا۔ کتنے چاند بن کر چمکا۔ بارش بن کر آسمان سے آیا اور غزل کے سارے وجود کو سرشار کر گیا۔ اب کیا رکھا تھا اس میں جو وہ سینت کر رکھتی۔ اس نے کئی بار زکام کے بہانے اپنے کمبخت خود بخود ٹپکنے والے آنسوؤں کو پونچھا۔ مگر بلگرامی نہایت اطمینان سے اس کا ہاتھ دیکھنے اور اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں گنوانے میں وقت ضائع کرتا رہا۔ آج کلا منڈل کے تمام بے شمار بدنصیب فن کار جانے کہاں اجڑے تھے جو نگاہوں سے اُڑتی چڑیوں کے پر گن لیتے تھے ۔ مگر آج غزل کا ہاتھ بلگرامی کے ہاتھ میں تھا اور وہ احمق بالکل نہیں جانتا تھا کہ نفرت کے ریگستان میں بھٹکنے والی پیاسی چڑیا نے محبت کے ایک قطرے کی خاطر اس پر سب کچھ نچھاور کر ڈالا ہے۔ بلگرامی اس کے ہاتھ کی لکیریں پڑھنے کے بہانے اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔ اور وہ انتہائی گرمی میں بھی یوں کانپ رہی تھی جیسے جاڑا لگ رہا ہو۔ اس کے ہاتھ پسینے میں بھیگ گئے تھے اور وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی۔ بلگرامی اپنی پامسٹری کے بہت سے حیرت انگیز قصے سناتا رہا۔

آپ کا ہاتھ بڑا typical ہے۔" وہ کچھ پریشان سا ہو کر سنبھل بیٹھا اور غور سے اس کے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر جب غزل نے بہت اصرار کیا تو کچھ باتیں رک رک کر بتائیں۔

آپ جن سے اچھائی کی آس لگائے بیٹھی ہیں وہ دراصل بڑا خود غرض ہے۔ آپ کو بچپن سے کوئی خوشی نہیں ملی۔ البتہ چند دن بعد آپ کا مستقبل بڑا شاندار ہے۔"

غزل نے بڑی جرأت کے بعد پہلی بار بلگرامی کی طرف دیکھا اور سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ جانے بلگرامی کو خبر بھی ہوئی یا نہیں کہ اسے کیا کیا مل گیا۔

"آپ کا دولہا بڑا خوب صورت ہوگا۔"

یہ سن کر ہاتھ چھڑا لیا اس نے اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔

لیکن آپ کے دل میں اس کی کوئی قدر نہ ہوگی۔" بلگرامی نے اداسی سے کہا۔ اور پھر اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔

"لائیے میری فیس جلدی نکالیے۔"

عین اسی وقت چنچل خورزوی اندر آیا اور ان دونوں کو بڑے تجسس بھرے انداز میں دیکھنے لگا۔

"کوئی حد ہے۔ ایک گھنٹہ سے مجھے اور غزالہ سلطانہ کو بلا کر جان صاحب جانے کہاں رنگ رلیوں میں گم ہیں۔"

بلگرامی نے بگڑا کے زردی سے کہا اور پھر لپک کر جانے والی غزل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میری فیس نکالیے جلدی۔"

"میرے پاس نہیں ہے۔" اس نے بڑی بے بسی سے کہا۔ سچ مچ وہ پرس تو فیشن کے لیے اٹھائے اٹھائے پھرتی تھی۔ اماں نے اسے آج تک کبھی ایک روپیہ بھی نہیں دیا تھا کہ وہ اپنے پاس رکھتی۔

"اچھا تو بعد میں وصول کر لوں گا۔" وہ اپنا سگریٹ کیس اٹھا کر گنگنانے لگا۔

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے ...... سیکھے ہیں .... اردے سیکھے ہیں....

تقریب........ اچھا چل دیتے ٹاٹا.........

اس رات غزل کو بالکل نیند نہ آئی۔

یوں لگتا جیسے وہ بہت بڑے میلے میں پہنچ گئی ہے۔ چاروں طرف ہوائی جہاز کا شور تھا۔ چرخوں کی گھوں گھوں ۔ کہیں زور کا منہ بج رہا تھا۔ پھر کسی موٹر کا ٹائر پھٹا۔۔۔

اور اچانک سناٹے میں بلگرامی کی گنگناہٹ ابھری۔۔۔

دیکھ دل کی زمین لرزتی ہے
یاد جاناں قدم سنبھال اپنا

اس نے کتنے بار بلگرامی سے یہ خوب صورت غزل اس کی کیف آور آواز میں سنی تھی۔ لوگ اس غزل پر بے ہوش ہو جاتے تھے۔ ہر محفل میں۔ ہر پارٹی میں اس غزل کی فرمائش ہوتی مگر کبھی [illegible] نہیں ہو جاتا تھا۔ اتنا مقبول، اتنا مشہور گانے والا اس کے لئے ۔۔

اس کے دل میں جانے گھبراہٹ کا طوفان تھا یا خوشی کا۔ اور جب اس نے اپنے آنسو پونچھے تو اسے بھان صاحب کی آوارہ گردی پر غصہ آ رہا تھا۔ انھوں نے چاند آپا کو تباہ کیا ——— چاند آپا بچاری بلدی کی گردن اکیلے کمرے میں پڑی رہتی ہیں اور بھائی صاحب کبھی انھیں پوچھنے نہیں آئے ——— پھر اسے اپنے دولہا کی ناقدری کرنے پر غصہ آیا ——— جانے وہ کون ہوگا ——— کہاں ہوگا۔ ہر کم سن لڑکی کی طرح اس نے کبھی اپنے دولہا کی شبیہ میں رنگ نہیں بھرے تھے۔ وہ ایک موہوم سا سایا تھا۔ ایک دھندلی سی تصویر کی طرح ہمیشہ اس کے سامنے بھی رہتا اور کبھی نظر بھی نہیں آتا تھا۔ جب بھی وہ کسی مرد میں کوئی اہم بات دیکھتی تھی تو اسے اپنے دولہا کے تصور میں ٹانک دیتی۔

آخر میں اتنے اچھے آدمی کی قدر کیوں نہیں کروں گی۔——— ؟

اس نے پریشان ہو کر سوچا ——— اجاڑ صورت! ابا ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ میں ہمیشہ حماقتیں کرتی ہوں ——— تو کیا ان حماقتوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا ؟

جی چاہ رہا تھا اپنے یہ سارے اندیشے سارے دکھ کسی اور کے وجود میں انڈیل دے۔ مگر اس کی کوئی سہیلی ہی نہیں تھی جس کے ساتھ وہ گڑیوں کا بیاہ اور "سینڈ کلیا" کے کھیل کھیل چکی ہو۔ اسے وقت ہی کہاں ملا ان چونچلوں کا۔

ہوش سنبھالتے ہی چاروں طرف سے لعنت اور جوتے پڑتے رہے۔ بچاری چاند آپا اگر اسے اسٹیج پر نہ لاتیں تو آج بلگرامی یہ کہتا۔

میں تو صرف آپ کی خاطر——————

لے دے کے ایک فوزیہ تھی۔ مگر اب رضیہ ممانی اسے غزل کے سائے سے بھی بچاتی تھیں۔ وہ خود بھی بڑی تک چڑھی مغرور لڑکی بن گئی تھی۔ کالج کے تقریری مقابلوں میں حصہ لیتی اور پیر دے لگی موٹر میں کالج جاتی تھی۔ کیا مجال کہ شاہین کے کسی دوست کے سامنے نکل آئے۔ سارے رشتے ناطوں کے بھائیوں سے بھی

اس کا سخت پردہ تھا۔ کیونکہ چاند کے انجام نے رضیہ ممانی کو بڑا محتاط بنا دیا تھا شاہین اب ڈاکٹری پڑھنے علی گڑھ چلا گیا تھا ——— اور ایاز کو تو اس سے نفرت ہوتی چلی تھی۔ وہ پڑھنا چھوڑ کر اب اتحاد المسلمین کا بڑا سرگرم رکن بن گیا تھا۔ دن رات ان ہی جھمیلوں میں مصروف رہتا۔ ہمایوں اور غزل دونوں میں سے کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ ایاز کے بارے میں سوچیں۔

پھر اس نے طے کیا کہ صبح بھائی صاحب آئیں گے تو ان سے کہے گی اب کے کسی ڈرامے میں وہ بلگرامی کے ساتھ ہیروئن بنے گی۔ مگر بھان صاحب دورے پر گئے ہوئے تھے۔

یہ بات شام کو بلگرامی گھر آیا تو اس نے بتائی۔ وہ اپنی کار میں آیا تھا ——— اپنے چیتھڑے کمرے میں میلی دری پر بلگرامی کو بٹھاتے ہوئے اسے بڑی شرم آئی۔

اب وہ ضرور سوچے گا کہ غزل کتنی معمولی سی لڑکی ہے۔ کتنی غریب ہے۔ وہ جو اتنی شاندار کار میں گھومتا ہے۔ اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اتنی قابل ماں کا پوت۔

اللہ وہ کیوں گھر آیا ہے ——— !

جب تک ہمایوں لنگی اتار کے ڈھلا کرتا پاجامہ پہن کر باہر آتا۔ بلگرامی غزل کو کار میں بٹھا کر کار اسٹارٹ کر چکا تھا۔

ہمایوں کو بڑا غصہ آیا ——— یہی تو فرق ہے بھان صاحب اور ان چھچھورے لونڈوں میں ——— بھان صاحب نے کبھی ہمایوں سے اجازت لئے بغیر غزل کو اپنے ساتھ لے جانے کی جرأت نہیں کی۔ لیکن ہمایوں کو معلوم تھا کہ آج نئے ڈرامے کے اداکاروں کی میٹنگ تھی اور اب تک انھیں وہاں پہنچ جانا تھا۔ شاید اسی لئے جلدی کے مارے بلگرامی نہیں اُترا کار سے۔ اسی لئے جلدی جلدی کپڑے بدل کر ہمایوں نے اپنی پرانی سائیکل اٹھائی اور پہنچا سوسائٹی کے آفس۔

لیکن وہاں بھائی صاحب تنہا بیٹھے کچھ کاغذوں پر دستخط کر رہے تھے۔ ابھی چار نہیں بجے تھے، اس لئے کوئی آرٹسٹ نہیں آیا تھا۔ البتہ ڈرگیا ہارمونیم لئے ایک کونے میں بیٹھا ریں ریں کر رہا تھا۔

دل کو بڑھتی ہوئی اداسی نے
کیا اکیلا سمجھ کر گھیرا ہے
کیا اکیلا —— سمجھ ——
اداسی نے ——

"غزل کہاں ہے —— !" ہمایوں نے مودبانہ سلام پیش کرنے کے بعد پوچھا۔"

"غزل —— ؟"

"ہاں ابھی بلگرامی صاحب اپنی کار میں لے کر غزل کو آئے ہیں۔"

"بلگرامی —— ؟ اپنی کار میں —— ؟" بھائی صاحب کھڑے ہوئے اور پھر تیورا کر یوں بیٹھ گئے جیسے انھیں ہارٹ اٹیک ہوا ہو —— پھر وہ بے چینی سے ہاتھ پاؤں پٹکنے لگے۔ ان کی خاموشی اور پریشانی دیکھ کر ہمایوں بھی گھبرا گیا۔

"بس اب آتے ہی ہوں گے۔" اس نے بھائی صاحب کو تسلی دینا چاہی۔

"نہیں —— آپ گھر جائیے —— وہ وہیں آئیں گے۔"

بھائی صاحب کی آواز کسی شدید دکھ سے بیٹھی جا رہی تھی

"سالی —— حرام زادی۔ مجھ سے کہے بغیر چلی گئی۔ آج اسے مار ڈالوں گا"

ضبط کے باوجود ہمایوں اپنی زبان پر قابو نہ پا سکا۔

"اسے بلگرامی مارے گا ——" بھائی صاحب نے شدت غم سے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"ابا مجھے مار ڈالیں گے۔ ان سے اجازت تو لینے دیجئے۔"

غزل کا ہاتھ پکڑ کے بلگرامی نے اندر کھینچا تو وہ گھبرا گئی —— پھر جب کار اسٹارٹ ہو گئی تو بلگرامی نے اسے بڑے غور سے مسکرا کے دیکھا۔

"آج ہم بھی آپ کو بہت ماریں گے"

"کیوں ——" وہ اپنے میلے کچیلے کپڑوں کو دوپٹے سے ڈھانپنے لگی اور سچ مچ گھبرا گئی۔

"آپ مجھے چھ مہینے سے ستا رہی ہیں۔"

"میں —— ؟" سچ مچ وہ تعجب کے مارے چونک پڑی۔

"اور نہیں تو کون ——" بلگرامی اسے تکے جا رہا تھا۔ بار بار سامنے کسی دوسری سواری کو آتے دیکھ کر اسے بریک دبانا پڑتا۔

"اتنی بے رخی —— اتنی لاپرواہی —— آپ کو اپنے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آتا —— ؟"

غزل کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے۔ جیسے کسی نے اسے بے ہوشی کا انجکشن دے دیا ہو —— میں کون ہوں۔ میں نے تو اپنے وجود کی اہمیت کبھی محسوس نہیں کی۔ کیا میری نگاہوں کی بھی کوئی نگرانی کر سکتا ہے۔

"اچھا اور میری طبیس کہاں ہے —— ؟" اس نے غزل کو گم سم دیکھ کر دوسرا سوال کیا۔

پھر جانے کہاں کی دبی ہوئی ہنسی غزل کے پاس آگئی۔ وہ ہنسے جا رہی تھی۔ چار مینار گزر گیا —— پھر معظم جاہی مارکیٹ آیا۔ پان کی ایک دکان پر بہت سے شاعر اور ادیب کھڑے تھے۔ غزل کی ہنسی سے انھوں نے چونک کر ادھر دیکھا تو بلگرامی نے ہاتھ ہلا کر سب کو وِش کیا۔

پھر عابد روڈ آگئی ـــــــ ؛

"بھارت کلا منڈل تو ادھر ہے ـــــ" اس نے ہنستے ہنستے کہا اور جھک کر ایک بارات دیکھنے لگی۔ بڑی دھوم دھام کی بارات تھی۔ دنیا بھر کا جہیز۔ اللہ اتنا جہیز کہاں سے آئے گا ـــ؟ غزل نے گھبرا کے سوچا ـــ بھیڑ کی وجہ سے بلگرامی کو کار کی رفتار دھیمی کرنی پڑی۔ دولہا گھوڑے پر سوار تھا۔ منہ سہرے سے ڈھانپے۔ اس کے ہاتھ میں سرخ رومال بندھا ہوا چاقو تھا۔ جس سے وہ بار بار ہجوم کو سلام کر رہا تھا۔

"جی چاہتا ہے اس سالے کی دلہن چھین لاؤں۔" بلگرامی کو سچ مچ غصہ آ رہا تھا۔ اسے ہر دولہا پر غصہ آتا۔ اس کی دلہن لے بھاگنے کی ترکیبیں سوچا کرتا تھا۔

غزل کو اور ہنسی آئی۔ پھر جب وہ شہر کی آبادی کو کاٹتے ہوئے گول کنڈہ روڈ کی طرف سنسان سڑک پر جا رہے تھے تو غزل نے ادھر ادھر دیکھا ـــ ـــ شام کی خنک ہوائیں اس کے بالوں کو چھو رہی تھیں۔ بارکس کے فوجی، ہاکی اور کرکٹ لئے گراؤنڈ کی طرف جا رہے تھے۔ دور کہیں بھاگ متی کا محل نظر آ رہا تھا۔ قلعے کے مقابل بنا ہوا پہاڑی محل۔ یہاں بیٹھ کر وہ گاتی تو قلعے میں سوتا ہوا قلی قطب شاہ اٹھ جاتا تھا۔

"غزل میں اگر قلعے پہ جا کر تمہیں پکاروں تو تم سنو گی ـــ؟" بلگرامی نے بالکل اس پر جھک کر پوچھا۔

"ہٹو ـــ" اور پھر غزل نے دل میں کہا تم نہ پکارو گے تب بھی میں تمہاری آواز سنتی رہوں گی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں کسی فلم میں کام کر رہے ہیں۔ بالکل فلمی منظر تھا کہ ہیرو اور ہیروئن کار میں بیٹھے جنگلوں میں سے چلے جا رہے ہیں کہ اچانک پٹرول ختم ہو جائے۔ یا پھر ٹائر پھٹ جائے یا پھر ہیرو کو راستہ

یاد نہ رہے ـــ مگر بلگرامی ان سارے راستوں پر کئی بار جا چکا تھا۔ اس لئے اس نے عثمان ساگر کے ایک سنسان سے کونے پر کار روک دی ـــ اور پھر بالکل اشوک کمار کے انداز میں اسے پکڑ کر نیچے اتارا

اللہ ـــ کتنا پانی ـــ غزل کو یوں لگ رہا تھا یہ پانی بھی اس کے دل میں ہنسی کی طرح بند تھا اور آج نکل نکل کر چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ ـــ اچھل رہا تھا ـــ جھلملا رہا تھا ـــ تہہ بہ تہہ ـــ کبھی پانی اتنا چمکتا ہے ـــ کہیں سنہرا، کہیں روپہلا ـــ بہتی ہوئی موجوں کو دیکھنے سے اسے چکر سا آگیا ـــ کہیں یہ خواب نہ ہو ـــ اس نے گھبرا کے بلگرامی کو تھام لیا اور اس بات پر اسے پھر ہنسی آ رہی تھی کہ یہ خواب ہے یا حقیقت ـــ

"اللہ کتنی اچھی جگہ ہے یہ ـــــ!" اس نے آسمان کی وسعتوں کو پہلی بار محسوس کیا۔

پہلے تو کچھ بھی اچھی نہیں تھی۔ آج تمہارے آنے سے اتنی اچھی ہوگئی ہے۔"

بلگرامی اس کے قریب آیا تو اس کے منہ سے ویسی ہی پٹرول جیسی بدبو آئی جو بھائی صاحب کے منہ سے آتی تھی۔ غزل کا اس بدبو سے جی متلاتا تھا اس لئے وہ دور ہٹ گئی۔ بلگرامی کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔

"بھائی صاحب ٹھیک کہتے ہیں کہ آپ کو مجھ سے نفرت ہے۔"

وہ بڑی اداسی کے ساتھ سگریٹ سلگاتے سلگاتے ایک پتھر پر بیٹھ گیا

"نفرت ـــ؟" ہنستے ہنستے وہ اچانک رک گئی ـــ "مجھے آپ سے نفرت کیوں ہوتی ـــ؟" زندگی بھر نفرت کا زہر پینے والی غزل لرز کر رہ گئی۔ نہیں۔ اتنا بڑا عذاب میں کسی کو نہیں دوں گی۔ اپنے کسی دشمن کو بھی نہیں۔

"اچھا نفرت نہیں ہے تو پھر نکالئے میری فیس ـــ" وہ پھر لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ لو —" اس نے بلگرامی کے خالی ہاتھ پر تھپڑ مارا اور بھاگی پتھروں کی طرف — بالکل چھوٹے بچوں کی طرح وہ بے تحاشہ ہنس رہی تھی — بلگرامی اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا — اور وہ اونچے نیچے پتھروں پر، ناہموار زمین پر بھاگتی پھر رہی تھی۔ پھر اس نے گھبرا کے پانی میں ڈوبے ہوئے کائی لگے پتھروں پر پاؤں ٹیک دیئے اور چلوؤں میں پانی بھر بھر کے بلگرامی پر پھینکنے لگی — بس اس کے آگے اور کوئی بچاؤ نہ تھا۔ کیونکہ آگے پانی ہی پانی تھا — شام کے دھندلے سرمئی آسمان کی سرحد، اس پانی سے جا ملی تھی — دور تالاب کے آخری سرے پر مچھیرے کا لڑکا پانی میں جال ڈالے بیٹھا تھا۔ اتنے وسیع و عریض منظر میں وہ بالکل ننھا سا دھبہ لگ رہا تھا — اس نے سرخی آمیز سیاہ ہوتی ہوئی شام کی روشنی میں بہت دور دو انسانی سایوں کو ایک دوسرے کا تعاقب کرتے دیکھا — اور پھر وہ دونوں جو ایک پتھر کی آڑ میں چھپے تو نکلتے ہی نہ تھے۔ — رات آ رہی ہے وہ دونوں سامنے آئیں تو میں جال سمیٹوں — مچھیرے کے لڑکے کو یوں لگ رہا تھا جیسے آج اس کے جال میں یہی دونوں سائے پھنسے ہیں —۔

رات کو ابا نے اس کے دکھتے ہوئے بدن پر اور چار لاتیں رسید کیں تب بھی وہ ہنسے جا رہی تھی۔ جیسے آج ابا کی لاتیں پھول بن کر اسے لگ رہی ہوں — آج وہ بہت ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ جیسے اس نے بلگرامی کے سارے احسانوں کا بدلہ چکا دیا ہو۔ اس نے اپنے دولہا کی قدر کرنے کا پہلا ثبوت دے دیا — کل بھان صاحب سے کہوں گی کہ وہ پوری بات ابا کو بتا دیں۔ اس بات پر تو ابا بھی بہت خوش ہوں گے کہ انھیں اتنا مشہور امیر داماد مل گیا۔

بس بہت سہہ لیئے سب کے جوتے — اب میں یہاں نہیں رہوں گی۔ کل بھان صاحب سے کہوں گی وہ شادی کا انتظام جلدی کروا دیں۔ مگر بھان صاحب دوسرے دن بھی نہیں آئے۔ لیکن غزل کو اپنی خوشی میں ان کا انتظار کرنا بھی یاد نہ رہا۔ البتہ بھان صاحب کے ہاں اس کی دو بھاری ساریاں پڑی تھیں اور پاؤڈر کا ڈبہ — ممکن ہے بلگرامی آج پھر

چوتھے دن بھی بھان صاحب نہ آئے تو وہ ڈر گئی۔ کہیں روحی نے کچھ لگائی بجھائی نہ کی ہو کہ اس دن بلگرامی بھان صاحب کو غزل کے سامنے برا بھلا کہہ رہا تھا اور وہ چپکی بیٹھی سنتی رہی۔ ایک ہفتے بعد بھان صاحب کا ڈرائیور ایک بند لفافہ ہمالیوں کو دے گیا جس میں دس دس کے دس نوٹ تھے جو انھیں

غزل کو ادا کرنا تھے اور ایک پرچہ تھا کہ مصروفیت کے سبب وہ اب غزل اور ہمایوں کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے وہ خود اب ان کے یہاں آنے کی زحمت نہ کریں۔

غزل کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ ہمایوں تو خیر صرف گھبرا گیا۔ مگر وہ رونے لگی۔ بھان صاحب کی عنایتیں یاد آنے لگیں ـــــ اب ہمایوں کی ترقی کا کیا ہوگا؟ "الف لیلہ" کا حصہ کیسے ملے گا؟ قرض کیسے ادا ہوگا؟ اس کا ذلت کے مارے وہی حال ہوا جیسے آج پھر چاند آپا نے ہاتھ پکڑ کے اسے کمرے سے باہر پٹک دیا ہو۔ اگر بھان صاحب سامنے ہوتے تو وہ کسی دیوار سے سر ٹکرا کے مر جاتی۔ اسے شدید اذیت سے تو چھٹکارا مل جاتا۔

پھر وہ انتظار کرنے لگی کہ بلگرامی آئے تو اس کے ساتھ جا کر بھان ماما سے معافی مانگ لے گی۔

ہمایوں نے بھی بھان صاحب کے خط کو لاپرواہی سے پلنگ پر پھینک دیا کیوں کہ اونچی سوسائٹی کو دیکھنے کے بعد یہ حقیقت اس پر عیاں ہو چکی تھی کہ غزل جیسی خوبصورت لڑکیوں کا بھاؤ بہت بڑھا ہوا تھا اور بھان صاحب جیسے احمق گلی گلی مل جاتے ہیں اب وہ لوگوں کے سامنے اپنا بہت اونچا معیار پیش کرتا تھا۔ سکین علی شاہ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس نے صرف دس پانچ ہندوستانی فلمیں دیکھی تھیں۔ اس نے کبھی اخبار کی خبروں کو اہمیت دی اور نہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات پر غور کیا تھا۔ "الف لیلہ" سے نکلنے کے بعد دن بھر وہ آفس کی فائلوں میں سر کھپاتا تھا۔ اس لئے جب پارٹیوں میں لوگ ہندوستان کے تشویشناک سیاسی حالات پر بحث کر لیتے، مارلن منرو کی ٹانگوں اور پکاسو کے آرٹ پر باتیں ہوتیں تو ہمایوں کرسی پیچھے کی طرف سرکا کے سگریٹ کے ٹوٹے پر سوٹے لگائے جاتا۔ پہلے پہل تو یہ ہوا کہ ہمایوں کو کوئی گھاس ہی نہ ڈالتا۔ غزل چاند اور بھان صاحب کے ساتھ پارٹی میں چلی جاتی اور وہ چپراسیوں اور بیرا لوگوں کے ساتھ باہر لان میں ٹہلتا تھا۔ کیوں کہ وہ غزل کو کہیں تنہا بھیجنے پر تیار نہ ہوتا تھا اور اندر کے لوگوں میں فٹ نہ ہوتا۔ پھر کبھی

بھان صاحب کی نظر اس پر پڑ گئی تو وہ کسی سے تعارف کرا دیتے۔

"آپ غزل بی بی کے فادر ہیں ہمایوں علی شاہ صاحب"۔

اور فادر ـــــ ایک آرٹسٹ کے والد ہونے کے ناطے فوراً اپنی معلومات کا اظہار شروع کر دیتے تھے۔ اچھے آرٹسٹوں کی کیابی کا رونا ـــــ ایکٹنگ کی خصوصیات اور اسٹیج کی ضروریات کے بارے میں وہ تمام سنی سنائی باتیں جو ان کے کانوں میں پڑی رہتی تھیں۔ اس وقت یوں لگتا تھا جیسے سکین علی شاہ کے خاندان میں پیری مریدی کی بجائے اسٹیج ڈرامے کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔

لہٰذا ہمایوں نے سوچا کہ اس گنجے بڈھے کے چنگل سے غزل کو نکال لینا چاہیے۔ بلگرامی بھی برا نہیں ہے۔ بنجارہ ہلز کے اونچے لوگوں میں تو اسی کی پہنچ ہے۔ غزل کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔ بس پھر کیا تھا ـــ دھوپ ابھی آنگن سے اوپر بھی نہ جاتی تھی کہ بلگرامی کا ہارن دروازے پر اسی کی طرح بے قراری سے پکارنے لگتا ـــ غزل گرم چائے کی پیالی پٹک دیتی۔ کبھی دوپٹہ اوڑھنا بھول جاتی کبھی چوٹی باندھنا ـــــ مچھیرے کا چھوٹا سا لڑکا پانی میں جال پھیلائے روز دور ادھر آخری سرے پر دو سایوں کو دیکھتا جو پتھروں کے پیچھے جانے کہاں گم ہو جاتے ہیں۔

وہ روز ان کا انتظار کرتا کرتے تھکا جا رہا تھا ـــــ بلگرامی کی طرح جو روز ایک ہی راستے پر چلتے چلتے اب بور ہونے لگا ـــــ مگر غزل تو اسے ہوا کی طرح چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ اتنی معصوم لڑکی ـــــ اتنی خوبصورت کہ بلگرامی یہ سوچتے ہوئے بھی ڈرنے لگا تھا کہ اس لڑکی کو کوئی کیسے دھوکہ دے گا۔

ان ہی دنوں مسٹر چڈھا حیدرآباد آئے۔ وہ یہاں فلموں کے لیے نئے چہرے تلاش کرنے آئے تھے۔ ان کے لیٹر پیڈ پر "ملی بھگت پروڈکشن" کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کمپنی کے پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور اسٹوری رائٹر وہ خود تھے۔ صرف میوزک ڈائرکٹر کا نام پیڈ پر نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے حیدرآباد کی مختلف موسیقی کی محفلوں میں اپنی موسیقی کا وہ رعب جمایا کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ پھر انھوں نے

اپنی اہمیت کے حیرت انگیز واقعات ۔۔۔ ۔۔۔ مثلاً معمولی سے "بیجو ماسٹر" نوشاد کی
ساری مقبول دھنیں دراصل ان ہی کی بنائی ہوئی تھیں ۔ برمن ان ہی کا شاگرد ہے
اور لتا نئے کنٹریکٹس حاصل کرنے کے لئے ان کے گھر کے چکر لگایا کرتی ہے ۔
اپنی بزنس کے سلسلے میں ہر گھڑی وہ کہیں نہ کہیں ٹرنک کال کرتے تھے ۔
ان کی نوٹ بک میں دن رات کے ایک ایک منٹ کا پروگرام لکھا ہوا تھا
تو ان مسٹر چڈھا کو اپنی نئی فلم کے لئے ہیرو اور ہیروئن کی ضرورت تھی ۔ مدراس
دہلی اور کلکتے میں وہ ہزاروں لڑکیوں کو ریجیکٹ کر آئے تھے ۔
لیکن بلگرامی نے انھیں آتے ہی یوں ہاتھوں ہاتھ لیا کہ سب منہ دیکھتے رہ
گئے ۔ بھان صاحب تو بہت ہی جلے ۔ سنا تھا کہ اب بھان صاحب نے بھارت کلا منڈل
آنا جانا چھوڑ دیا تھا اور ایک انجینئر کی لڑکی کو کھانا پکانے کا آرٹ سکھانے میں مشغول
تھے ۔

بلگرامی کی دیکھا دیکھی شہر کے اور بھی بہت سے معزز حضرات کلچرل انجمنوں اور
آرٹسٹوں نے مسٹر چڈھا کو دعوتیں دیں ، انھیں ایک سے ایک پری جمال چہرے دکھلائے
گئے ۔ اس طرح چڈھا کے لئے ہیروئن کا انتخاب اور بھی مشکل ہو گیا ۔ آئے تو تھے دو
دن کے لئے مگر دو ہفتے گزر گئے اور لوگ انھیں ہلنے ہی نہ دیتے تھے ۔
آخر انھوں نے بلگرامی کو ہیرو کے لئے انتخاب کر لیا ۔ معاہدے کی بنا پر اس کی
گیارہ سو روپیہ مہینہ تنخواہ مقرر ہو گئی ۔ اس کے علاوہ اس کی اداکاری کے جملہ
حقوق "ملی بھگت پروڈکشن" کے لئے محفوظ ہو گئے اور اس خوشی میں جب بلگرامی
نے سکندرآباد کے ایک ہوٹل میں پارٹی دی تو غزل گھر میں پڑی زار زار رو رہی تھی
اس نے چڈھا کی نظروں میں چڑھنے کی ہزار کوشش کی مگر وہ تو بلگرامی کی ایک
سابقہ ایرانی نژاد محبوبہ جمال پر ریجھا ہوا تھا اور بلگرامی کو اپنے ساتھ لئے جا رہا
تھا ۔ بلگرامی تو جو نٹیوں بھرا کباب نکلا ۔ ہر خوبصورت عورت اس کی طرف یوں
بڑھتی تھی جیسے اپنے قابو میں نہ رہی ہو ۔ ایک بار روی نے غزل کو بتایا کہ بیچارہ

ہلز پر جتنے شوہر اپنی بیویوں کو طلاق دیتے ہیں ان میں نوّے فی صد عورتیں بلگرامی
کی محبوبائیں ہیں ۔ کتنی بار غزل اس کے ساتھ ہوتی اور وہ کسی خوبصورت عورت
کو دیکھ کر بیقرار ہو اٹھتا ۔ بعد میں وہ غزل کے سامنے صفائی پیش کرتا کہ خوبصورت
عورتوں کو دیکھنا اچھا لگتا ہے ۔ ویسے اس کی نیت بخیر ہے ۔ غزل صبر کرتی ، صبر
کیا کرتی ! خود بلگرامی نے ہی جو پیشن گوئی کی تھی کہ اس کا خوبصورت دولہا اس کی
قدر نہ کر سکے گا ۔ سو وہ قسمت کا لکھا بھگت رہی تھی ۔ کہ ایک آدھ مہینے میں شادی
ہو جائے تب وہ ممانی بیگم کی طرح اس پر دھونس جمایا کرے گی ـــــــ اور
آج بلگرامی بمبئی جا رہا تھا ۔ یوں بھی شادی کی بات پر وہ کوئی دھیان نہ دیتا تھا ۔
کبھی کہتا میری ممی بڑی سخت مزاج ہیں انھیں منانے میں دیر لگے گی ، کبھی سناتا کہ مجھے
اکیلا چلنے دو ورنہ بابا خرچ دینا بند کر دیں گے تو کیا ہو گا ۔ ؟
دوسرے دن بلگرامی دوڑا ہوا آیا اور یہ خبر سنائی کہ چڈھا نے غزل کو
ہیروئن کے لئے منتخب کر لیا ہے ۔ یہ فیصلہ دراصل اس نے اسی وقت کیا تھا
جب پہلی بار اس ہرنی کی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھا تھا ۔
ہمایوں کی باچھیں کھل اٹھیں اور غزل خوشی کے مارے ہنسنا بھی بھول گئی
لیکن بلگرامی کو یہ بات زیادہ اچھی نہیں لگی ۔ کیوں کہ چڈھا ہر لڑکی سے یہی کہہ
رہا تھا کہ اسی کا انتخاب ہو گا اور سب کو اپنے ساتھ بمبئی لیے جا رہا تھا ۔
وہ کہتا تھا کہ ان میں سے ہر لڑکی کو وہ کسی نہ کسی ڈائرکٹر کے سپرد کر دے
گا ـــ

اس لئے بلگرامی کہتا تھا کہ چڈھا کے ساتھ وہ فی الحال اکیلا جائے گا اور
غزل کو بعد میں بلوائے گا ـــــ اس دن پہلی بار غزل بلگرامی سے خوب لڑی
بالکل بیویوں کے انداز میں ۔ جیسے ابھی گھوڑی بھر بعد من جائے گی ۔ اور اس
نے بلگرامی کی پروا کیے بغیر معاہدے پر دستخط کر دیے جس کے لئے ایک ہزار
روپیے کی ضرورت پڑی ۔ کیوں کہ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے والوں کے

لئے یہ ڈپازٹ رکھوانا ضروری تھا۔ ممکن ہے ہمایوں یہاں پر ہمت ہار جاتا لیکن اس نے بتول سے چھین کر جو زیور سایا کو پہنا دیئے تھے وہ آج کام آ گئے۔

چڈھا اتنا دلچسپ آدمی تھا کہ جتنی دیر بیٹھتا، سب اسی کی باتیں سنتے، اسی کے دماغ سے سوچتے تھے۔ اتنا با اخلاق کہ اس نے چند ملاقاتوں میں ہمایوں کو بھی اپنی قابلیت اور اہمیت کا قائل کر دیا۔ اس نے بڑی تفصیل سے غزل کی صلاحیتوں پر بحث کی۔ کیوں کہ وہ ابھی بہت کم عمر ہے اس لئے چڈھا کو کئی مہینے اسے ٹریننگ دینا ہو گی۔

لیکن عین روانگی کے دن بلگرامی سے چڈھا کا کسی بات پر سخت جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا اور بلگرامی نے اس کے ساتھ بمبئی نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ادھر لاکھ دوڑ دھوپ کرنے کے باوجود غزل اور ہمایوں کے کرایے کا بندوبست نہ ہو سکا۔ اس لئے چڈھا باقی لڑکیوں کو سمیٹ کر روانہ ہوا کہ غزل بھی بہت جلد بمبئی پہنچ جائے گی۔ غزل کے جانے کی خبر سے حیدر آباد آرٹ سوسائٹی اور بھارت کلا منڈل میں صف ماتم بچھ گئی۔ سنا ہے بجان صاحب بھی، جو اب غزل کے ہر معاملے سے دست بردار ہو چکے تھے، اس خبر سے نہایت آزردہ ہوئے۔ اس کے باوجود غزل کے تمام چاہنے والوں کی طرف سے اسے ایک شاندار الوداعی پارٹی دی گئی اور عین اسی وقت کسی نے اخبار میں یہ خبر پڑھ کر سنائی کہ بنگال کا ایک مشہور دعو کے باز حیدر آباد سے بمبئی جاتے وقت پلین میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ لڑکیوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا تھا۔

لیجیے ——— جتنی تیزی سے یہ آندھی اٹھی تھی۔ اتنی ہی تیزی سے بیٹھ گئی ——— ساتھ میں بلگرامی اور حیدر آباد آرٹ سوسائٹی کو بھی لے اڑی۔

بلگرامی نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ غزل نے اس کی مرضی کے خلاف معاہدے پر دستخط کئے تھے ——— لہذا وہ کسی اور طرف مڑ گیا۔

ادھر بلگرامی گیا اور ادھر ہمایوں نے پھر جوتا سنبھال لیا۔ بس پھر کیا تھا

——— اللہ دے اور بندہ لے۔ غزل کی ٹھکائی کرنے کے سوا ہمایوں کی اور کوئی مصروفیت ہی نہ رہی تھی۔ صبر کا ایسا نہ ہر غزل نے پہلے کبھی نہیں پیا تھا اس کا دماغ کسی دھماکے سے پاش پاش ہو چکا تھا۔ ہمایوں کی لعنت و ملامت اب جانے کس پر پڑتی تھی۔ وہ تو چپ چاپ بیٹھی خلا میں گھورے جاتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا کیسا خوبصورت پروگرام بنایا تھا۔ جب وہ بلگرامی کی دلہن بن کر بنجارہ ہلز کی عورتوں کو انگاروں پر سلا دے گی۔ جب وہ بلگرامی کے جیسے سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے بچوں میں گھر کے ڈرامے اور اداکاری سب کچھ بھول جائے گی۔ دن بھر ممانی بیگم کی طرح مسہری پر بیٹھا کرے گی۔ بچوں کی خاطر بلگرامی سے لڑائیاں ہوا کریں گی۔ کیوں کہ وہ ابا کی طرح بات بات پر بچوں کو پیٹا کرے گا ——— غزل کانپ اٹھتی۔ اپنی روح کے سارے گھاؤ یاد آ جاتے اور وہ گھبرا کے بلگرامی کو پکارنے لگتی۔ بچوں پر کبھی ہاتھ نہ اٹھانے کا پکا وعدہ لیتی اس نے جب بھی اپنے آپ کو ایک شادی شدہ عورت کے روپ میں دیکھا تو رضیہ ممانی سامنے آ جاتی تھیں ——— ساس کی آنکھوں کا تارہ ——— خسر کی راج دلاری بہو ——— جب دیکھو راشد ماموں سے چہلیں ہو رہی ہیں۔ بچے گھڑی گھڑی آ کر ان سے لپٹ جاتے تھے۔

پھر ایک دن وہ بھی تھک ہار کے بی بی کی طرح قالین بچھے ہوئے تخت پر لیٹ جائے گی اور بلگرامی پنشن لے کر نانا حضرت کی طرح گاجر کا مربہ بنایا کرے گا۔ اس کی بلا سے وہ مربے میں کشمش ڈالے یا کھوپرا ——— وہ تو بی بی کی طرح ہر بات سے بے نیاز پڑی رہے گی۔

اگر اس نے بلگرامی کے ساتھ شادی کے خواب نہ دیکھے ہوتے تو بجان صاحب کی طرح اسے بھی بھول جاتی۔ مگر اب تو باقاعدہ رنڈاپے کا سوگ منانے کے لئے اس نے دنیا تیاگنے کا ارادہ کر لیا تھا ——— کیوں کہ آج ——— صرف چودہ برس کی عمر میں اس کا سہاگ اجڑ گیا تھا۔

آئینے میں بڑے غور سے اس نے اپنی صورت دیکھی ــــــ رونے کی وجہ سے گال سرخ انگارہ بن گئے تھے۔ بال چڑیلوں کی طرح بکھرے ہوئے ــــــ غزل کو ایسا لگا جیسے اس کے دانت بھی ٹوٹ گئے ہیں اور بال سفید ہوچکے ہیں۔ بیواؤں کی صورت تو ایسی ہی ہوتی ہے ــــــ پھر اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں بج اٹھیں ــــــ اس نے پتھر سے اپنی چوڑیاں توڑ ڈالیں اور بڑی دیر تک ڈھونڈنے کے بعد اماں کے صندوق میں ایک سفید ساری اور سیاہ بلاوز مل گیا۔

اس روپ میں جب اس نے آئینہ دیکھا تو رو پڑی ــــــ ہائے اللہ ــــــ کوئی بے درد اسے پرسہ دینے بھی تو نہ آیا ــــــ اس پر ہنسنے والے سب کہاں چلے گئے ــــــ اماں ــــــ اماں ہوتیں تو اس کے غم پر چھاتی پیٹ لیتیں۔ صرف چودہ برس کی عمر میں بیوہ ہوگئی ــــــ۔

نہ جانے اس کے رونے میں کتنا درد تھا کہ سایا اندر آئی اور اسے گلے سے لگاکر سمجھانے لگی۔

"رو رو کر مر جائے گی کیا۔ تیرا ابا تو ہمیشہ ہی مارا کرتا ہے"۔

سایا کے محبت بھرے الفاظ نے اس کے سلگتے ہوئے سینے پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا۔ وہ جانے کب تک سایا کے سینے سے لگی بیٹھی رہی۔ جانے کب اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے اور وہ لاش کی طرح پلنگ سے نیچے لڑھک گئی ــــــ

بی بی کے یہاں خبر پہنچی تو واحد حسین گھبرائے ہوئے آئے۔

انھیں غزل سے شدید نفرت ہوچکی تھی ــــــ مگر اس کو مرتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکے ــــــ ڈاکٹر آیا ــــــ سایا نے دوا پلائی۔ وہ ہوش میں آئی ــــــ تو بی بی اور فوزیہ اسے دیکھنے آئیں۔

دنیا منہ موڑلے مگر بی بی کے تو پیٹ کی آگ تھی۔ مری بیٹی کی نشانی۔

ان کی دونوں بیٹیاں ایک ایک سانپ جن کر ان کے لیے چھوڑ مری تھیں۔ غزل کو انھوں نے یوں دیکھا جیسے پہلی بار قبر پر پھول چڑھانے آئی ہوں۔

فوزیہ جتنی دیر بیٹھی رہی بات بات پر قہقہے لگاتی رہی۔

اس کی خوبصورت آنکھیں، صحت مند جسم اور بے چین ہاتھ ہنسی کے مارے کھلے جارہے تھے۔ جیسے وہ رونا ہی نہ جانتی ہو۔

بی بی اس گھڑی کو کوسنے لگیں جب یہ سبز قدم داماد ان کے گھر میں آیا تھا۔ اللہ جانے کس رنڈی کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا کہ بیٹی کی کمائی کھاتا تھا۔ اس دن بی بی اور ہمایوں میں پھر ایک زبردست معرکہ ہوا۔ بی بی نے اسے بیٹی کی کمائی کھانے کے طعنے دیے اور اس نے بیٹی کے جہیز میں دھوکہ دینے کا الزام لگایا۔ اور پھر بعد حسین اور ساجد حسین کی عیاشیوں کے بکھان کیے کہ "ایوان غزل" میں جتنے شاعر گزرے سب رنڈیوں کی اولاد تھے جنھوں نے سوائے عشق بازی کے دوسرا کوئی کام نہیں کیا۔

اس تو تو میں میں کے بعد غزل کے لیے پھر "ایوان غزل" کے دروازے کھل گئے۔ کیوں کہ اس وقت وہ نانی سے لپٹ کر خوب روئی اور بعد میں لنگڑی پھوپو اور ممانی بیگم کے سامنے رو رو کر اپنی مظلومی کی کہانی سنائی کہ سارا قصور ابا کا ہے جو زبردستی اسے ہر جگہ بھیجا کرتے تھے۔ پھر اس نے بلگرامی کا قصہ سنایا۔ جس پر لنگڑی پھوپو نے اس کے ایک دھموکا رسید کرکے چپ کرایا اور ممانی بیگم نے رو رو کر بی بی سے کہا۔

"بی بی خدا کے لیے غزل کی زبان بند کروائیے۔ ابھی فوزیہ کو اٹھانا ہے"۔

اور اس دن سے بی بی کی ہدایت پر نہ صرف وہ ان قصوں کو زبان پر نہ لائی بلکہ بھول جانے کی بھی کوشش کرتی رہی۔

پھر جب بعد میں فوزیہ نے میٹرک پاس کیا تو بی بی کے ہاں بڑی شاندار دعوت ہوئی۔ غزل تو بلگرامی کے سوگ میں پڑی تھی۔ مگر لوگوں کو یہ بات تھوڑی

بناتا تھی۔

مجبوراً اس نے ایک سادہ ساڑی پہنی۔ اور ٹنڈورے ہاتھ کان لے چلی گئی۔ بہت سی عورتوں کے ہجوم میں اسے وحشت ہوتی تھی۔ چیخ پکار زیبائیاں فضیحتے اور ایک دوسرے سے جلنے کا انداز ______ وہ مردوں کی منڈلی کا خلوص اور خوش دلی یہاں بالکل نہ ملتی۔ وہاں غزل کیسے ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھی ____ لیکن شادی بیاہ کی محفلوں میں عورتیں اسے یوں دیکھتیں جیسے وہ بھی نمائش میں رکھے ہوئے بچے کی طرح دس سر اور بارہ ہاتھ لے کر پیدا ہوئی ہے۔

چاند آپا دو مہینے تک اننت گیری سینی ٹوریم میں رہ کر آئی تھیں۔ مگر انھوں نے ابھی تک سجوا کا انتظار نہیں چھوڑا تھا۔ غزل سوچتی کہ ایسے خوبصورت مردوں کو نظر انداز کر دینے والی چاند آپا نے کیسے سجیوا کے لئے خود کو مٹا دیا۔

یہ کون سا جذبہ ہوتا ہے ____؟

غزل کو بھی بھان ماما اچھے لگتے تھے۔ بلگرامی کو اس نے اپنا سب کچھ سونپ دیا۔ اس کے باوجود بلگرامی کی یاد اس کے سینے میں کبھی دھڑکے نہ لگاتی تھی بلکہ اب تو اس کا جی چاہتا تھا کہ بلگرامی آئے تو اس کے منہ پر تھوک دے۔

ابھی مہمان آنا شروع نہیں ہوئے تھے۔ چاند آپا اپنے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھی کوئی انگریزی ناول پڑھ رہی تھیں۔ ان کی صورت کتنی بدل گئی تھی۔ وہ چھوٹے سے تنگ بلاؤز جن کے اندر سے اس کا سینہ ابھرتا تھا اور گولائی غضب ڈھاتی تھی، اب ان کی سوکھی باہوں میں لٹک رہا تھا۔ وہ اپنے حسن کا ایک واہمہ سا بن کر رہ گئی تھیں۔ سوکھے خشک بالوں کی ایک مری چوہیا جیسی چوٹی لٹک رہی تھی۔ گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے

اور سنہری سیب جیسی رنگت زرد ہو چکی تھی۔

آنے والی بیبیاں سخت تعجب سے کبھی چاند کا بے میک اپ والا بد رونق چہرا دیکھتیں۔ کبھی رنگ اور شادابی میں ڈوبی ہوئی غزل کو دیکھ کر ساتھ والی کے کان میں جھک جاتیں۔

"اجی یاں کا تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔"

"ایوان غزل" میں ہمیشہ ایسے ہی کھیل کھیلے گئے۔"

"اتنی کمائی آتی ہے۔ جبھی تو ایسی شاندار دعوتیں ہوتی ہیں۔"

چاند آپا تو تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئی تھیں۔ اس لئے انھوں نے کچھ نہ سنا۔ مگر غزل کو تو بہت سے کاموں کے لیے ادھر ادھر آنا جانا پڑا۔ بیبیاں بڑے اشتیاق سے اسے پاس بلا کر دیکھتیں۔

"یہی ہے سکینہ علی شاہ کی پوتی۔ غزل ____؟"

"ہاں یہی ہیں مشہور اسٹیج اداکارہ بے بی غزالہ۔"

"اب تو شاید مس غزالہ ہو گئی ہیں۔"

"ممکن ہے مسز غزالہ بھی ہوں ____" پھر سب ہنسنے لگے

"اجی بی بی یہ ہاتھ کان ننگے کر کے کیوں آئے ہیں آپ۔ یہ بھی کوئی فیشن نکلا ہے کیا ____؟"

"تو کیا شریف بیبیوں میں بھی منہ پر چونا لگا کر مٹکنے کا ارادہ ہے۔؟"

غزل کا جی چاہا کہ وہ بھی چاند آپا کی طرح ٹی۔ بی کے سارے اسٹیج ایک جست میں پار کر جائے۔ چھت گر پڑے یا قیامت آجائے۔ مگر کچھ نہ ہوا

اکتا کر وہ خود بھاگی چاند آپا کی پناہ میں ____ جی چاہا ان سے لپٹ کر خوب روئے۔ جیسے سارے خاندان کے جنازے سامنے رکھے ہوں۔

آج بہت دنوں بعد پہلی بار چاند آپا نے اس سے باتیں کیں۔ بھارت کلا منڈلی کا حال پوچھتی رہیں ____ غزل نے ان سے کچھ نہ چھپایا۔ بھان صاحب

کی دست درازیوں سے لے کر بلگرامی کی بے وفائی تک سب حال سنا ڈالا۔

"جی چاہتا ہے چاند آپا بلگرامی مل جائے تو اس کی بوٹیاں کر ڈالوں" یہ اس نے بے حد غصہ میں کہا۔

"ہوں ——" چاند آپا نے کسی گہری سوچ میں ڈوب کر کہا۔ "یہ اچھا ہوا کہ تم نے بلگرامی کے حوالے صرف اپنا بدن ہی کیا تھا —— اور کچھ نہ دیا ——"

غزل کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

"ورنہ میری طرح دوہری آگ میں جلتیں ——" وہ کہے گئیں۔ "میں نے کتنی بار التجائیں کیں۔ مگر اس نے مجھے کبھی نہ چھوا —— اور پھر بھی وہ میرا سب کچھ لے گیا ——"

"کیا سچ مچ ——؟" غزل سخت حیران تھی کہ کوئی ایسا بھی مرد ہو سکتا ہے جو چاند آپا جیسی خوبصورت عورت کو چھوئے بغیر چلا گیا!

"ہاں —— جانے وہ کیسا تھا۔ اسے مجھ پر بھروسہ ہی نہ تھا ——"

آج الٹی بات ہوئی۔ چاند آپا خشک آنکھیں لئے بیٹھی تھیں اور غزل سسک سسک کر رو رہی تھی۔ چاند آپا سمجھیں وہ اپنی محرومیوں پر رو رہی ہے۔

"میں تو صرف چھبیس ۲۶ برس میں موت کے کنارے کھڑی ہوں۔ لیکن غزل تو بھی خود چلنا چھوڑ دے۔ اپنی تقدیر خود بنانے کا حوصلہ ہر عورت میں نہیں ہوتا۔ اس لئے اپنی باگیں بی بی کے ہاتھ میں تھما دے۔ ورنہ راشد ماموں اور خالو پاشا تجھ سے اپنی ناکامیوں کے قفل کھلوا لیں گے۔ اور تجھے پھینک دیں گے۔"

غزل کی سمجھ میں کچھ نہ آیا —— وہ چاند کے کانپتے ہوئے لب دیکھتی رہی —— ان کا چہرا سفید کپڑے کی طرح شکن آلودہ ہو گیا تھا اور بڑی بڑی سنہری آنکھیں سیاہ حلقوں میں یوں جھکتی تھیں جیسے ڈوب رہی ہوں۔

گھر آ کر غزل نے پہلا کلام یہ کیا کہ بلگرامی کا سوگ جھٹک کر رنگین بھڑک دار کپڑے

پہن لیے۔

بی بی کے ہاں بڑا ہنگامہ مچ رہا تھا —— چاند اور غزل کا حشر دیکھنے کے بعد بنیہ اور بی بی کے لیے فوزیہ سینے کا پتھر بن گئی تھی اور وہ کسی طرح جلدی سے اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں —— جب دیکھو رضیہ راشد اور واحد حسین بیٹھے کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ ایک تو فضا بہت خراب ہو رہی تھی۔ سنا ہے رضا کاروں سے انڈین یونین کی فوجوں کی جھڑپیں ہونے لگی تھیں۔

اور قاسم رضوی نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ میدان میں لڑنے کو تیار ہیں۔ اعلیٰ حضرت اتحاد المسلمین کی طاقت سے گھبرا کر کوئی معاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ ادھر تو راشد کو باہر کی ہزار پریشانیاں لگی تھیں اور ادھر لڑکوں کے پیغاموں والے سرخ لفافے ادھر سے ادھر سرکائے جاتے تھے۔ اور پھر ایک دن فوزیہ کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ سنا تھا کہ لڑکا لندن سے ڈاکٹری کی ڈگری لے کر بس ابھی ابھی پلین سے اترا تھا —— اور پھر باپ کی خاندانی جائداد تھی۔ بہت بڑے لوگ تھے۔ صرف پچاس ہزار گھوڑے جوڑے اور ایک مکان اور چالیس تولے سونے پر بات پکی ہو گئی تھی۔

رضیہ اور راشد بیٹھے خود ہی اپنی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔

منگنی کی رسم کے لیے لنگڑی پھوپو نے کوئی سو خط تو رشتے داروں کو لکھوائے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو اس خاندان کی لڑکیوں پر نام دھرتے تھے۔ اب اس خاندان کی ایک سانولی سی کیسی اونچی جگہ بیاہی جا رہی تھی۔ لنگڑی پھوپو یہ اعلان کرنا چاہتی تھیں۔ واحد حسین اپنی شاعری چھوڑ چھاڑ ان خطوں کو لکھتے اور پھر وہ گھر کی پوری مجلس مشاورت میں پڑھ کر سنایا جاتا۔ پھر مجلس خود ہی فیصلہ کرتی کہ کون سا جملہ کس رشتے دار کے لیے غیر ضروری تھا۔ کس طرح خطاب کرنا چاہیے۔ محبت اور دعوت کا اظہار کس انداز میں ہو۔

لنگڑی پھوپو چاہتی تھیں کہ اس موقع پر اجالا بیگم بھی احمد حسین اور نفیر کے ساتھ آ جائیں تاکہ نعیر کی پیدائش سے جو دوری چلی آ رہی ہے وہ اب ختم ہو جائے۔

سنا تھا کہ وہ حرامی لونڈا تو اب بی۔ اے پاس جوان مرد بن چکا تھا۔ لیکن اجالا بیگم نے قسم کھائی تھی کہ وہ "ایوان غزل" کی چوکھٹ نہیں الانگھیں گی کیونکہ وہاں اس کے دشمن بستے تھے۔ یہ بات تیر سے کوا بن کر جب واحد حسین کے کانوں تک آئی تو بس انھوں نے بھی طے کر لیا کہ احمد حسین کے یہاں نہیں جائیں گے۔ اب صرف بیماری اور موت اور کسی خوشی کے موقع پر رسمی خط و کتابت باقی تھی لیکن لگائی بجھو رتی رتی کی خبر رکھتی تھیں کہ احمد حسین نے نصیر کو بھی حکومت کرنے کے سب داؤں پیچ سکھا دیئے ہیں اور اجالا بیگم نے اس کے لیئے بہت سی چھوکریاں پالی تھیں۔ ان چھوکریوں کی فوج کے بیچ وہ سانڈ بنا شعر کہتا تھا۔ اجالا بیگم نے اسے خاص طور پر شاعری کا شوق دلایا تھا تاکہ وہ اپنے خاندان کا فرد لگے اور راشد کی طرح خاندانی روایتوں کو توڑ کر حرامی نہ کہلائے۔

اور جب یہ خط اور رنگ آباد گیا تو اجالا بیگم نے جانے کون سے منصوبہ کے تحت نصیر کو بھیج دیا۔

اب فوزیہ کی رسم میں کوئی اور رشتے دار آئے یا نہ آئے لیکن سارا گھر نصیر کی خاطر تواضع میں لگ گیا۔ کیونکہ وہ پہلی بار تایا ابا سے ملنے اپنے خاندانی گھر میں آیا تھا۔

رضیہ کا بس چلتا تو اس کا گلا گھونٹ کر پھینک دیتیں لیکن ظاہری طور پر بڑی للو پتو کرنا پڑی۔ اسی لیے جب ہمایوں نے غزل کو گھر بلوایا تو بی بی نے منع کروادیا "اتنا کام کاج کیسے ہوگا۔ کم سے کم غزل ہی گھر میں رہے۔"

دماغ میں کوئی روشنی دھک سے کوندگئی اور پھیلنے لگی۔ پھر سرخ رنگ کا ایک دریا سا پھوٹ بہا۔

اس کے خم کھائے ہوئے شاداب ہونٹوں کو ایک جگہ قرار ہی نہ تھا۔ بیک گراونڈ میں پاوڈر لگے ہوئے چہرے کی دل آویزی اور اس کے پیچھے سیاہ بالوں کی پہاڑیاں ــــ جن کے نیچے سنہرے موتیوں کے ٹاپس جھرنوں کی طرح روشنی کی دھاریاں چھکا رہے تھے اور آنکھیں ــــ آنکھیں ــــ وحشی غزالی آنکھیں۔ جادو بھری معصوم ــــ بے رحم اور لاپرواہ آنکھیں۔ صرف آنکھیں ہی نصیر کے تصور میں نہ آتی تھیں ــــ وہ بے حد خوبصورت تو نہ تھی ــــ مگر اس کے بادامی رنگ میں کشش تھی یا تنی ہوئی بھوؤں میں ــــ آنکھیں تو کٹے ہوئے چاند کی طرح نیم وا رہتی تھیں ــــ ابھرے ہوئے پپوٹوں تلے دبی دبی ــــ پہلی نظر میں یوں لگتا جیسے وہ آنسو پونچھ کر آئی ہو۔ مگر اس کے مسکراتے ہوئے لبوں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں کو جھوٹا ٹھہرایا

اندر کمرے میں چینی کے برتن سے ٹوٹ رہے تھے

قالین پر بیٹھی وہ سب جانے کن کن باتوں پر ہنس رہی تھیں۔ غالباً وہی موضوع سخن ہوگا ــــ؟

جس دن وہ یہاں آیا تھا تو شاہین نے خبردار کر دیا تھا کہ شہر کی سڑکوں پر

سائیکل مت چلانا ـــــ اور غزل سے دوستی مت بڑھانا کیونکہ سڑک پر سائیکل چلانے اور غزل سے دوستی بڑھانے کے چند حدود ہیں ـــ اور دونوں کو نہ جاننے کی صورت میں جان کی خیر نہیں ـ

نصیر بھائی تو راشد کا تھا ـ لیکن وہ ایک ہی دن میں نہ صرف شاہین کا بھائی بن گیا بلکہ دونوں میں بے حد دوستی بھی ہوگئی ـــ نوک جھونک ـــــ اور نوجوان لڑکوں کے پُراسرار مذاق ـــــ سب ہی مراحل انھوں نے طے کر ڈالے ـ شاہین نے دو تین دن ہی میں اسے عثمانیہ یونیورسٹی سے لے کر "گنڈی پیٹ" تک دکھا ڈالا تھا اور اب وہ لوگ روزانہ بمبئی ٹاکیز کی "قسمت" میں بڈھی ممتاز شانتی کو دیکھتے دیکھتے عاجز آچکے تھے ـ اس لئے نصیر نے ممنوعہ اشیاء کو چھونے کا فیصلہ کرلیا تھا ـ ویسے بھی اسے یقین تھا کہ ان باتوں میں کوئی اہمیت نہیں ہے ـ شاہین اسے بالکل ہی گاؤں کا گنوار سمجھ کر بنانے کی کوشش کرتا ہے ـ وہ بچارا سمجھا ہوگا کہ نصیر نے کبھی حیدرآباد نہیں دیکھا تو دنیا ہی نہیں دیکھی ـ اب وہ شاہین کو کیا بتا! کہ اس نے دنیا میں کیا کیا دیکھ ڈالا ہے ـ دنیا کا ہر مزہ چکھ چکا ہے ـ وہ تو ہر چھٹی میں بمبئی جاتا تھا موج منانے ـ کیونکہ اباجان یہ چاہتے تھے کہ وہ عیش کرنا سیکھے ـ خود اماں جان بھی اس کی رنگ رلیوں پر خوشی کے مارے ہنس پڑتیں ـ اور پھر بناوٹی غصہ سے بھوئیں سکیڑ کے کہتیں ـ

"اجاڑ صورت آخر گیا نا باپ کی چالوں پر ـ"

مگر اماں جان کو اس کا باہر گھومنا پسند نہیں تھا ـ کیوں کہ انھیں اپنی خاندانی روایتوں سے پیار تھا ـ انھیں مردانہ حصہ ہُوحق، ناچ رنگ کی محفلوں سے آباد بہت اچھا لگتا تھا ـ اس لئے انھوں نے لونڈیوں چھوکریوں کی پلٹنیں ڈیوڑھی میں ہر طرف کھڑی کردی تھیں نصیر کے لئے

یہ ڈیوڑھی اورنگ آباد کے ایک قصبے میں تھی جہاں ریل کا ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا ـ وہاں سے پٹریاں غزل کے شہر تک آتی تھیں مگر نصیر ان پر کبھی

نہیں چلا تھا ـــــ لیکن اب اس نے بی ـ اے پاس کرلیا تھا ـ اپنے ابا کے ساتھ شہر کے مشاعروں میں جاتا تھا ـ اپنی جاگیر کا دورہ کرتا ـ اور گیہوں کے اکوے سے لے کر عورت تک کی اصلیت سے واقف ہو چلا تھا ـــــ یہاں تک کہ آج اماں جان اور اباجان کو قائل معقول کرکے وہ حیدرآباد بھی آگیا تھا ـ مشہور شاعروں کے شعروں میں پیوند لگا لگا کر اس نے اپنے شہر میں کافی شہرت حاصل کرلی تھی ـــ اس کے ابا اس بات پر نہال تھے بلکہ ایک زمانے سے ان کا یہ ڈر کہ نصیران کی بجائے غلام رسول کا بیٹا نہ ہو ـ نصیر کے شاعرانہ ذوق نے دور بھگا دیا تھا ـ کیوں کہ شاعری سے احمد حسین کی نسلوں کا خمیر اٹھا تھا ـــــ اب کیا شک ہے کہ نصیر ان کی اولاد نہیں ہے ـ!

اور آج اس کا شاعرانہ موڈ زوروں پر تھا ـــــ وہ غزل کے خمیدہ، شاداب ہونٹوں کی تعریف کرنا چاہتا تھا ـــــ اس نے پچاسیوں لڑکیاں دیکھی تھیں ـــ مگر یہ لڑکی ان ساری لڑکیوں سے مختلف تھی جو اجالا بیگم گھیر گھار کر اس کے لئے اکٹھی کرتی تھیں ـ نہ جانے کیوں بجلی کی طرح کوندنے والی اس لڑکی سے اسے ڈر سا لگ رہا تھا اور کوئی کشش اس کی جانب کھینچے بھی لیے جارہی تھی ـ

آج راشد اس سے بے تکلفی پیدا کرنے پر تلے ہوئے تھے ـ بڑے بزرگوں کے انداز میں اس سے مستقبل کے بارے میں باتیں کیں ـ پھر کچھ ہنسی مذاق بھی ہوئے اور ایک آدھ بار انھوں نے ہاتھ پکڑ کے اسے دھول بھی رسید کردی ـ بظاہر تو وہ بھی راشد بھائی سے مارکٹائی میں مصروف تھا لیکن اس نے طے کرلیا تھا کہ آج ضرور وہ غزل سے بھی بے تکلفی بڑھائے گا ـ

برانڈے میں بیٹھے ہوئے راشد بھائی اپنی ہانکے جارہے تھے اور وہ مسلسل دو گھنٹے سے بیٹھا انتہائی دلچسپی کے ساتھ کبھی سیمنٹ کے منافع کا حال سن رہا تھا کبھی پیٹرول میں گھاٹے کا ـــــ

اور پھر ایک دم مسکرا پڑا ـــــ جیسے دواؤں کے کاروبار میں اچانک پو بارے

ہو گئے ہوں ۔ سامنے کھڑی غزل کو دیکھ کر اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہاتھ پکڑ کے کہہ دے

" آج تم مجھے بہت اچھی لگ رہی ہو"

اور وہ سچ مچ گھبرا کے کھڑا ہو گیا ۔

" کیا ہوا ______ ؟" دواؤں کے ڈھیر تلے سے ہانپتے ہوئے راشد بھائی نے گھبرا کے پوچھا

" کچھ نہیں ______ " اس طرح اچانک کھڑے ہو جانے پر وہ شرمندہ سا ہو گیا اور خواہ مخواہ کپڑے جھٹکنے لگا ۔

" شاید کسی مکوڑے وکوڑے نے کاٹ لیا ۔"

" کیا ہوا ______ کیا ہوا ______ ؟ ایک دم جانے کہاں سے لوگ نکل پڑے ۔ ہنستی مسکراتی لڑکیوں کا ہجوم، دالان میں اکھٹا ہو گیا ۔ ایک دوسری کو ڈھکیلتی وہ سب کپڑے جھاڑتے ہوئے نصیر کو یوں دیکھ رہی تھیں ۔ جیسے اس کی آستین سے سانپ نکلنے والا ہو ۔ پھر ان سب کے درمیان دو خمیدہ ہونٹ وا ہوئے ۔

" کیا ہوا ______ ؟"

" آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو" مگر وہ یہ بات پھر نہ کہہ سکا ۔

" تو خیر، فرض کرو کہ ہمارا معاشی مقاطعہ نہ ہو، تب بھی ایک سال تک میں سیمنٹ کا گھاٹا برداشت کر سکتا ہوں ۔" راشد بھائی نے نیا سگریٹ سلگا کر پھر سے باتوں کا سلسلہ جوڑا ۔

" لیکن میں اب ایک منٹ کے لیے بھی کوئی گھاٹا برداشت نہیں کر سکتا" (نصیر نے سوچا)

ابھی ابھی جہاں لڑکیاں کھڑی تھیں وہاں رنگین دھبے ناچ رہے تھے اور نیلے پھولوں والے پردے کو قرار ہی نہ تھا ۔ کبھی کبھی جب ہوا کا جھونکا پردے

کو ذرا سا ہلا جاتا تھا تو گورے گورے نرم و نازک پاؤں ادھر ادھر دوڑتے نظر آتے ۔ جیسے دیکھو اسی کمرے میں کھنچا جا رہا ہے ۔ کسی نوکر کے ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکریاں ہیں ۔ کہیں کپڑوں پر استری ہو کر آ رہی ہے ۔ بی بی ایک طرف بیٹھی ناریل، مصری اور پانوں کے بیڑے کشتیوں میں سجا رہی تھیں ۔ لنگڑی پھوپو مردانے کی طرف لاٹھی تھامے باورچیوں کی نگرانی میں مصروف تھیں ۔ ابھی مہمانوں کے آنے میں بہت دیر تھی ۔ اس کے باوجود محلے کے بچے گیٹ پر بجتی ہوئی نوبت کو سننے اکھٹے ہو چکے تھے اور کواڑوں کھڑکیوں میں کھڑے بڑی دلچسپی سے اندر کا تماشہ دیکھ رہے تھے ۔

نصیر کا جی چاہ رہا تھا، بار بار کمرے میں دوڑنے والی اس چھوٹی سی بچی کو گود میں اٹھائے جس کی ناک بہہ رہی تھی اور اس کے گندے کپڑے میل اور کیچڑ میں سنے ہوئے تھے ۔ پھر جب وہ اس ننی سی بچی کو پکڑنے لپکا تو جانے کیسے پردہ اس کے سر میں الجھ گیا اور اس کی نگاہ خود بخود ادھر اٹھ گئی جہاں فرش پر وہ لڑکیوں کے درمیان بیٹھی تھی اور کان کے پاس ایک جھمکا رکھ کر پوچھ رہی تھی

" میں کیسی لگ رہی ہوں ؟"

" آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو ۔" مگر یوں سب کے سامنے کیسے کہہ دیتا

" اجی بی بی ______ فوزیہ کو سرخ کتان کی ساری پہنا دوں ؟"

رضیہ حیران پریشان سی ساس کے پاس کھڑی پوچھ رہی تھی ۔

" غزل کہہ رہی ہے گلابی جارجٹ کی ساری پہناؤ ۔"

فوزیہ کو دیکھنے سمدھنیں آ رہی تھیں ۔ اس لئے اسے سجانے سنوارنے کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا تھا ۔ غزل نے اسے سنوارنے کا ذمہ لیا تھا ۔ وہ ہر ہر زاویہ سے فوزیہ کو سجا رہی تھی ۔ ساتھ ہی لڑکیوں میں قہقہے بھی بانٹتی جاتی ۔ لڑکیوں کو سجانا بھی کتنی حماقت ہے جیسے جلتی ہوئی شمع پر غلاف چڑھا دیا جائے اور پھر فوزیہ اتنے بناؤ سنگار کے باوجود غزل کے سامنے یوں ٹمٹا رہی تھی

جیسے دوپہر کے وقت چراغ جل رہا ہو۔ نہیں وہ لوگ فوزیہ کے بجائے غزل کا انتخاب نہ کرلیں ۔ نصیر نے اس خطرے سے غزل کو آگاہ کرنا چاہا
اس ایک لمحہ میں وہ کتنی زور زور سے چلایا ـــــ ہیلو ـــــ ہیلو ـــــ اور پھر اس نے ساری دنیا کے ٹیلی گراف آفس کھٹکھٹا ڈالے ۔ سب ریڈیو اسٹیشنوں نے یہ خبر براڈ کاسٹ کی ـــــ مگر غزل نے پھر بھی نہ سنی۔

جب لڑکیاں ہنس رہی ہوں تو روشنی کی کیا ضرورت ہے ـــ ! اس کے باوجود رضیہ نے عین ان کے سروں کے اوپر آج وہ فانوس جلایا تھا جو وہ جہیز میں لائی تھی۔ نیچے قالین پر زیوروں کے ڈبے، چوڑیاں اور طرح طرح کی ساریاں کھلی پڑی تھیں۔ ان رنگینوں کے بیچ میں بیٹھی وہ ہنسے جا رہی تھی ـــ کتنے دنوں کے بعد آج غزل کو ہنسنے کا موقع ملا تھا ۔ وہ چاہتی تھی آج اپنے آپ کو بھول جائے۔ بس فوزیہ ہی کو دیکھے جائے ۔

نصیر نے سوچا کہ کس جاہل نے اس کا نام غزل رکھا ہے ۔ ؟ وہ تو خیام کے پورے دیوان میں بھی نہیں سما سکتی ۔ اس کے جسم کا ہر ہر عضو ایک علاحدہ موضوع سخن رکھتا ہے ۔

اور پھر وہ سوچنے لگا کہ آج سے ہزاروں سال پہلے جب کسی شاعر نے پہلا شعر کہا ہوگا تو اس نے غزل ہی کا تصور کیا ہوگا ـــــ "ایوان غزل" کی دیواروں سے لگے سارے بوڑھے شاعر جیسے غزل ہی کا انتظار کرتے کرتے مر گئے تھے۔ آج تک شاعری صرف اسی کی تلاش کا نام ہے ۔ وہ بیٹھے بیٹھے تھک گیا۔ اس طویل سفر کو یاد کر کے اس کے ہاتھ پاؤں دکھنے لگے ۔ بے شمار شاعروں کے دیوان اس کے سامنے کھلے پڑے تھے ۔ اپنی صحرا نوردی پر اسے خود تعجب ہو رہا تھا۔ جیسے وہ خود ہی تھا جس نے قرنوں کی مسافت ان بتوں کی ٹھنڈی چھاؤں کے انتظار ہی میں گزار دی تھی ـــــ غزل کی ایک نگاہ کی خاطر سیکڑوں جون بدلے ۔ امید کا دیا پکڑے نگر نگر اسے ڈھونڈتا

پھرا اور اب صدیوں کا سفر طے کر کے اس کمرے کے سامنے آ بیٹھا ہے، جو غزل سے صرف تین گز کے فاصلے پر تھا۔

چنانچہ اتنی دیر میں ایک زوردار غزل تیار ہوگئی جسے پنسل سے سگریٹ کی ڈبیا پر لکھ کر وہ راشد بھائی کو سنانے پر تل گیا۔ انھوں نے بھی تو اینٹ پتھر کے بیوپار میں اس کی ہمدردیاں بٹوری تھیں ـــــ مگر اس سے کیا ہوتا ! وہ لاکھ چیخ چیخ کر اس کی تعریف کرتا رہا ۔ راشد بھائی نے بھی کڑک کڑک کر داد دی ـــ اس کے باوجود اندر کمرے میں کسی کو فرصت نہ ملی کہ اس کے اشعار پر داد دیتا ۔ وہ تو ایک ایک زیور اپنے چہرے پر رکھ کر دیکھتی اور پھر فوزیہ کے چہرے پر لگاتی۔

لڑکیاں اس لئے خوبصورت ہوتی ہیں کہ وہ ہنستی رہتی ہیں۔ اس کے برعکس مردوں کو ہنسنے کے لیے کتنی جستجو کرنا پڑتی ہے۔ لطیفوں اور تعجب خیز خبروں کا کنواں کھودنا پڑتا ہے۔ تب کہیں کوئی قہقہہ ابلتا ہے۔ ادھر لڑکیاں ہیں کہ ایک انگوٹھی کی ڈبیہ کھول کر اتنی زور زور سے ہنستی ہیں کہ شاعر اپنی غزل سنانا بھول جائے ـــ

راشد بھائی بلیک میں خریدی ہوئی دواؤں کی ویگنیں لیے کھڑے تھے۔ مگر نصیر کو ہوش ہی کہاں تھا کہ ان کے سر سے یہ بوجھ اتارتا۔ خود اس کے اوپر کوئی سیکڑوں من وزنی پتھر اوندھا گیا تھا۔

لڑکیوں کی ہنسی اور بڑھ گئی ـــــ جیسے دھیمے دھیمے برستے برستے موسلا دھار بارش ہونے لگے۔ آدمی چاہے تو ایک انگوٹھی کو دیکھ کر تصور میں ایک بارات لے آئے۔ اس وقت فوزیہ کے آس پاس بیٹھی ہوئی لڑکیاں بھی ان لمحوں میں کھو گئی تھیں۔ جب کوئی انگوٹھی لے کر ان کا ہاتھ تھامے گا اور بچاؤ کے تمام راستے مسدود ہوجائیں گے۔

نصیر نے ایک بار پھر سیمنٹ کے تھیلوں اور دواؤں کی پیٹیوں کو ہٹا کر پردے کے پیچھے دیکھنا چاہا
اب تک وہ یقیناً جھمکے پہن چکی ہوگی۔

اور جب وہ صراحیوں کے پاس کھڑا آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا تو وہ جاتے جاتے رک گئی۔

"آپ کو کیا چاہیے ——— ؟" اس نے نصیر کو اتنا پریشان دیکھ کر پوچھا اور وہ جانے کیوں گھبرا گیا۔ اس کی بدحواسی پر غزل کو اتنے زور کی ہنسی آئی کہ ادھر ادھر جاتے ہوئے لوگ ٹھہر گئے۔ اور وہ گھبرا کے شاہین کا کمرہ ڈھونڈنے لگا۔

آدھی رات کو وہ شاہین کے کمرے سے سوتے سوتے اٹھا اور باغ کی سیڑھیوں پر بیٹھا سگریٹ پینے لگا۔

آدھی رات کا چاند بیچ آسمان پر چمک رہا تھا۔ ہوا بالکل بند تھی — گرمی کے مارے سانس گھٹی جاتی تھی ——— آنگن سونا پڑا تھا۔ بچے سو چکے تھے۔ بریانی اور بھگارے بیگن اور مرغ کے ڈونگے فرش پر سے اٹھا لیے گئے تھے۔ اب سارے گھر کی عورتیں اس کمرے میں گھسی ہوئی تھیں جہاں فوزیہ کی ہونے والی ساس نندیں اس کی رگ رگ ٹٹول کر دیکھ رہی تھیں۔ لین دین پر بھاؤ تاؤ ہو رہا تھا راشد، واحد حسین اور شاہین غالباً سب سو چکے تھے۔

"آپ اٹھ گئے ——— ؟ میں اس وقت سے تین بار کمرے میں آ چکی ہوں۔"

نصیر نے چونک کر دیکھا ——— سامنے غزل کھڑی تھی — بنی سنوری — آنکھوں میں نیند کا خمار لیے۔

"آپ — آپ میرے کمرے میں آئی تھیں — ؟ سچ — ؟"

"ہاں — آپ نے کھانا جو نہیں کھایا — ممانی بیگم نے کہدیا ہے کہ جب تک آپ کھانا نہ کھائیں میں آج نہیں سو سکتی۔"

"تو پھر آئیے — یہاں بیٹھ کر جاگیں گے آج کی رات —؟" اسے ہنسی آ گئی۔

"کیوں — ؟ آپ کھانا نہیں کھائیں گے — ؟" غزل گھبرا گئی۔

"کیوں کھاؤں میں کھانا۔ یہاں کسے پروا ہے میری۔" اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"کیوں — ؟ کیا ہوا — ؟" غزل چونک پڑی — وہ اجالا بیگم اور واحد حسین

کے سارے اختلافات سے واقف تھی۔ نصیر کے آنے سے پہلے گھر میں ایک باقاعدہ میٹنگ ہوئی تھی جس میں طے کیا گیا تھا کہ نصیر کی بے حد خاطر تواضع ہوگی اور بہت عزت و شان و شوکت کے ساتھ رکھا جائے گا۔

"اب یہی دیکھیے کہ مجھے آئے آج چار دن ہو گئے۔ لیکن آپ نے مجھ سے بات تک نہیں کی۔"

"ہاں یہ تو صحیح ہے۔ غزل نے سوچا۔ اس نے جان بوجھ کر نصیر کو نظر انداز کیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی سماجی حیثیت سے واقف ہو چکی تھی۔ اس لیے خاندان والوں کے آگے وہ جتنی کم آئے اتنا ہی اچھا تھا۔ سنا ہے اجالا بیگم تو بات کا بتنگڑ بنانے میں استاد ہیں۔

"میں — ؟" اس نے تعجب سے کہا۔

"میرا کیا ہے — ؟ آپ کی خاطر تواضع کرنے والے تو راشد ماموں ہیں۔ ممانی بیگم ہیں۔ شاہین ہیں — ہم غریب لوگ اپنے گھر آپ کو کیا بلائیں — کیا دکھائیں۔" اس نے بڑی ادا سی کے ساتھ کہا۔

"آپ غریب ہیں — ؟" نصیر نے چونک کر تعجب سے پوچھا۔

"میں نے تو آپ جیسی امیر لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ جس کے پاس اتنا روپ ہو — اتنا حسن — ایسی بے پناہ کشش —" وہ سچ مچ کہتے کہتے سرشار ہو گیا۔ دیوار کو تھامے ہوئے غزل کے ہاتھ خود بخود نیچے گر پڑے۔ اور وہ جیسے کسی سحر سے بے سدھ ہو کر بولی۔

"مجھ سے شاعری مت کیجیے — آج جانے کتنی نیند سی آ رہی ہے۔"

"ایسی کی تیسی شاعری کی ——— !" نصیر نے چڑھ کر کہا۔

"جائیے آپ سو جائیے ——— جب آپ ہوش میں ہوں گی تب میری بات سن لینا ——— !"

اس کے پاؤں پتھر بن چکے تھے۔ مگر وہ جانے کس طرح چل کر ایک اندھیرے کمرے تک آئی جہاں بچے ہوئے کھانے کی دیگیں، میٹھے کی جھوٹی پلیٹیں اور

لقیوں کے ٹوکرے رکھے تھے۔ وہیں جھوٹے دسترخوانوں کے ڈھیر پر وہ گر پڑی اور کلیجہ پھاڑ کے رونے لگی ـــ

جانے کیوں اپنی تعریف سنتے ہی اس پر ایک سحر سا چھا جاتا تھا۔ کہنے والے کی آواز پہلے تو دل میں شہد گھولتی اور پھر ابھی تک تشنہ رہنے والی خواہشوں کا زہر اس کی رگ رگ کو جلانے لگتا ـــ پچھلی حقارتوں اور نفرتوں کی قطار سی سامنے آ کھڑی ہوتی اور اتنی نفرت، اتنی تاریکی کو دیکھ کر وہ رو پڑتی تھی ـــ اب کیا ہوگا ـــ اب وہ مجھ سے کیا کہے گا ـــ ؟

دوسری رات پھر نصیر باغ کی سیڑھیوں پر آ بیٹھا ـــ مگر آج چاند اس کے بہت پاس سرک پر آیا تھا اور اس کے کان میں جھک کر پوچھ رہا تھا ـــ "اب کیا ارادے ہیں نصیر میاں ـــ ؟

ابھی ابھی غزل اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھی۔ اور نصیر کو یقین تھا کہ باغ کی طرف سے آنے والی یہ بھینی بھینی موتیا کی خوشبو دراصل غزل کے تصور سے آرہی تھی ـــ ان تین گھنٹوں میں اس نے غزل سے کتنی باتیں کر ڈالیں ـــ غزل نے اپنی ماں کی بے وقت موت اور باپ کی بے رخی سے لیکر ان مردوں تک کا حال سنایا تھا جو اسے دھوکا دے گئے تھے۔ اس کے باوجود نصیر نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا اور اس کے ساتھ اپنی زندگی کا تمام پروگرام بنا ڈالا۔ اس نے غزل کو ہر ہر روپ میں دیکھا ـــ آپا لا بیگم کی بہو کے روپ میں۔ اپنی محبوبہ کے روپ میں دیکھا ـــ اپنے بچوں کو گود میں لیے ـــ اور پھر اس نے وہ انگوٹھی انگلی سے اتار کے غزل کو پہنا دی جو آپالا

بیگم کے ہاں خاندان کی بہو کے ہاتھ میں پہنائی جاتی تھی۔

یہ ہیرے کی انگوٹھی ان کے ہاں سات پشتوں سے لڑکے رونمائی میں اپنی دلہن کو پہناتے آئے تھے۔ لیکن وہ ایک بار بھی اپنی جلد بازی پر نہ گھبرایا ـــ البتہ جب اس نے انگوٹھی والے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگانا چاہا تو غزل نے گھبرا کے ہاتھ کھینچ لیا۔

"میرے پاس مت آنا۔"

"کیوں ـــ ؟"

اس نے زبردستی ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیونکہ تم آگ ہو آگ ـــ میں جل جاؤں گی۔" اس نے واقعی گھبرا کے کہا۔

"تمہیں اس آگ میں جلنا اچھا نہیں لگتا ـــ ؟" اس نے غزل کی آنکھوں پر جھک کر کہا۔

"تم نے کبھی چرکے کھائے ہوں تو معلوم ہو کہ جلنا کسے کہتے ہیں۔"

اس نے گھبرا کے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح اذان سے پہلے وہ نصیر کے کمرے میں آئی۔ نصیر خوشی کے مارے اٹھ بیٹھا۔ شاید رات کو وہ ہاتھ چھڑا کے چلی جانے پر پچھتائی ہو ساری رات سو نہ سکی ہو۔

"نصیر! ـــ میں نے ساری رات سوچا۔ بہت غور کیا ـــ ایسا لگا کہ یہ انگوٹھی مجھے سچ مچ تمہارا بنا دے گی۔ وہ جیسا کہانیوں میں لکھا ہے نا ـــ !" وہ کچھ یوں لگا جیسے وہ خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔

"کیا لکھا ہے کہانیوں میں ـــ ؟"

"کہ انگوٹھی میں کسی شہزادی کی جان ہوتی تھی ـــ اور وہ انگوٹھی کسی دوسرے کے پاس چلی جاتی تو شہزادی مر جاتی تھی۔"

"تو کیا ہوا ـــ" اس نے غزل کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ "تو کیوں گھبرا رہی ہے پگلی ـــ ؟"

"نہیں یہ انگوٹھی تم واپس لے لو ورنہ بات بہت آگے بڑھ جائے گی"۔ وہ انگوٹھی اتارنے لگی۔

"بات تو آگے بڑھ چکی ہے اس انگوٹھی کی کیا اہمیت ہے۔ میری تو جان پر بن گئی ہے۔"

غزل گھبرا گئی۔ نصیر نے اس کے کاندھے سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے کہا۔

"اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں مر جاؤں گا۔ تم مجھے دھوکا تو نہیں دے گی نا ——؟"

اور غزل جو محبت کی ذرا سی نمی پا کر مصری کی طرح پگھل جاتی تھی۔ پگھلنے لگی۔ معدوم ہونے لگی۔ اس کا اپنا وجود آہستہ آہستہ مٹتا گیا اور وہ نصیر میں سما گئی۔ ——

نصیر کی آنکھ کھلی تو زندگی کی ایک حسین صبح اس کا استقبال کر رہی تھی۔ نہ جانے کب غزل اس کے پاس سے اٹھ کر جا چکی تھی۔ مگر تکیے پر اس کے وجود کی گرمی باقی تھی۔ اس کی خوشبو سے بستر مہک رہا تھا۔ اور اس خوشبو نے نصیر کے انگ انگ میں جانے کیسی مستی بھر دی تھی۔ وہ اس انوکھی سرشاری سے ابھی تک واقف نہ تھا —— اسے اپنے اوپر رشک بھی آ رہا تھا اور رشک بھی ہو رہا تھا ——— چولہے کے پاس دیوار کو تھامے غزل کھڑی تھی —— بے حد تھکی ہوئی۔ کھوئی کھوئی —— اس کے پریشان بال۔ چہرے پر اڑ رہے تھے —— آنکھیں سوجی ہوئی سی تھیں۔ جیسے وہ ساری رات روتی رہی ہو۔ —— وہ ابلتی ہوئی ہانڈی پر نظریں جمائے جانے کیا سوچ رہی تھی —— اف کیسی بے پناہ کشش تھی اس لڑکی میں —— ملگجے بدرنگے کپڑوں میں بھی وہ سونے کی مورت بنی دمکتی تھی ——— اس کی طرف نظر بھر کے دیکھتے ہی جانے نصیر کو کیا ہو جاتا تھا —— وہ چونک کر سنبھل گیا۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ سارے گھر کی موجودگی بھول کر غزل کی سادگی اور اسیاں اپنے ہونٹوں سے سمیٹنے پہنچ جائے۔

آج گھر میں سب ہی چپ چپ تھے۔ رات سے چاند کی طبیعت بہت خراب تھی۔ نوزینہ سے لے کر حامد حسین تک ان کے کمرے میں ڈاکٹر کے ساتھ بیٹھے تھے۔ نصیر بھی تھوڑی دیر وہاں بیٹھا۔ لیکن آج اس کے دل میں خوشیوں کے سوتے سے پھوٹ رہے تھے۔ اس لئے کمرے کے تکلیف دہ ماحول میں وہ زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکا۔

پھر اپنے کمرے میں آ کر اس تکیے کو سینے سے لگا کر لیٹ گیا۔ جس پر رات غزل نے سر رکھا تھا۔ قسمت اس کے لئے کیسا انمول ہیرا لیے بیٹھی تھی۔ اس بات کی خبر کل شام تک خود اسے بھی نہ تھی۔ لیکن اب اس راز کو کیسے چھپایا جائے؟ غزل تو ہیرے کی وہ انگوٹھی اپنی انگلی میں چھپاتی پھر رہی تھی۔ جیسے اسے کسی کا ڈر ہی نہ ہو۔

دوپہر میں ہمایوں نے آ کر کہا کہ آج شام غزل کو ایک ڈرامے کی ریہرسل کے لئے جانا ہے۔ تو غزل نے ہمایوں کے سامنے نصیر سے بھی کہا کہ وہ بھی ریہرسل دیکھنے ضرور آئے۔ شام کو اس نے نصیر کے لئے خود شیروانی پسند کر کے کیس میں سے نکالی۔ اس کے جوتوں پر پالش کی اور بڑا اصرار کیا کہ وہ غزل کا گھر دیکھ لے۔ جہاں وہ کپس اور شیلڈز رکھی تھیں۔ جو اس نے اداکاری پر جیتی تھیں۔

دوسرا دن نصیر نے غزل کے ہاں گزارا۔ وہ دونوں دن بھر جانے کس کس بات پر ہنستے رہے۔ اور دوپہر کو "نجمہ" دیکھنے گئے۔

زمرد محل کی بالکنی میں بیٹھے بیٹھے غزل کو یوں لگا جیسے نصیر کے ساتھ رہتے ہوئے زمانے بیت گئے ہوں۔ نصیر کے پیار کی گرمی اس کے لئے بہت پرانی سی بات ہو چکی تھی۔ وہ بالکل گرہست بیویوں کے انداز میں اپنا آپ اس کے حوالے کر دیتی تھی۔ —— اس بدن میں کیا تھا جسے بچائے بچائے پھرتی ——؟ اس نے تو اپنی روح پہلی بار ایک مرد کو سونپی تھی۔ اور اس کے بعد ہر چیز بھول جانا چاہتی تھی۔

وہ گھر آئے تو نصیر پریشان سا تھا کہ جانے ہمایوں اس پر کتنا شک کرے گا۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ غزل کے ہاتھ میں ایک نئی انگوٹھی سب نے یوں نظر انداز کر دی۔ جیسے یہ کوئی نئی بات نہ ہو۔

دوسرے دن جب وہ صبح اٹھ کر دالان میں آیا تو شاہین نے شیو کرتے کرتے

پلٹ کر اس سے کہا۔

اب تو غالباً آپ ایک آدھ مہینہ اور قیام کریں گے ــــ؟"

وہ کھسیا کے ہنسنے لگا۔ کیوں کے پرسوں شام جب شاہین نے بڑے اصرار سے ایک ہفتہ اور رکنے پر اصرار کیا تھا تو اس نے انکار کر دیا تھا کہ جانا بہت ضروری ہے۔ لیکن آج شاہین جان چکا تھا کہ وہ کس چکر میں پھنس چکا ہے۔!

اسے شاہین کی چالاکی پر رشک آرہا تھا۔ شاہین اسی کی عمر کا ہوگا۔! مگر یہ شہری لونڈے اُڑتی چڑیا کے پَر گن لیتے ہیں۔

"کیوں پکی ہے نا بات ــــ؟ ملاؤ ہاتھ یار۔" شاہین نے ہنس کر ہاتھ بڑھایا تو وہ دونوں خوب ہنسنے لگے۔

راشد اور رضیہ فوزیہ کا جہیز خریدنے گئے تھے۔ چاند اپنے کمرے میں پڑی کراہ رہی تھی ــــ دالان کے تخت پر فوزیہ اور لنگڑی پھوپو بیٹھی کپڑے قطع کر رہی تھیں۔ نصیر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہاں کیسے بیٹھے ــــ اپنے پاس کھڑا دیکھ کر لنگڑی پھوپو نے اپنی عینک ٹھیک کی اور وہ گھبرا گیا۔

اب اس کے عشق کا نشہ اتارا جائے گا۔ لنگڑی پھوپو اپنی نصیحتوں کا پٹارہ کھولنے ہی والی ہیں۔

"اجی نصیر بابا، آپ کیا کھا رہے ہیں۔ آپ کو کچھ بھی یہاں آرام نہیں مل رہا ہے؟"

"جی نہیں پھوپو میں تو بہت مزے میں ہوں؟"

"اجی پھوپو یہ تو ضرورت سے زیادہ ہی مزے میں ہیں ــ" شاہین نے شیو کرتے کرتے مڑ کے کہا تو اسے پھر ہنسی آگئی۔ اور مارنے دوڑا شاہین کو ــــ

"کیا ہے کی ماں" ۔ ہم لوگاں تو چاند کی وجہ اتنے پریشان ہاں۔ میں غزل کو بولی تھی کہ ذرا نصیر بابا کے کھانے پینے کا خیال رکھو۔" لنگڑی پھوپو

نے کپڑا تخت پر پھیلا کر کہا۔"

"بس یہی آپ نے بہت اچھا کیا۔" شاہین نے نصیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"غزل نے ان کی بہت خاطر تواضع کی ہے۔ کیا کیا کھلایا ہے اب تک اجی ذرا پھوپو کو بتاؤ نا حضرت ــــ؟" اور اپنی بات پر شاہین خود بھی نصیر کے ساتھ ہنسنے لگا۔

"چل یہ ایک چھچھورا بچہ ہے۔" لنگڑی پھوپو نے ہنس کر کہا۔

"آپ کو کیا پسند ہے بولو میں وہی پکواؤں گی۔ لنگڑی پھوپو نے پھر قینچی ہاتھ میں اٹھالی۔

"آہا آہا ــــ کیا اچھی بات پوچھی ہے پھوپو آپ نے ــ" شاہین اچھل پڑا ــــ دیکھو نصیر میاں ایسا موقعہ پھر نہیں ملے گا۔ ہاں جلدی بتاؤ آپ کو کیا پسند ہے ــــ؟"

"آپ خاموش بیٹھتے ہیں کہ میں آؤں ــ" نصیر شاہین کو مارنے بھاگا۔ اور وہ دونوں لڑتے جھگڑتے باہر کی طرف بھاگے۔

پھر نصیر نے ایک مہینہ حیدرآباد میں یوں گزارا کہ دن پر لگا کے اڑ گئے۔ اس نے باپ سے چوری چھپے اماں جان سے ایک ہزار روپے منگوائے۔ یوں تو اجالا بیگم دمڑی دمڑی پر جان دیتی تھیں۔ مگر ان کا بیٹا پہلی بار حیدرآباد گیا تھا۔ اور وہ چاہتی تھیں کہ واحد حسین کے سامنے وہ اپنے خوب ٹھاٹ باٹ دکھائے۔ اس نے غزل کے ساتھ ٹیکسیوں میں خوب سیریں کیں۔ اس کے لئے تحفے خریدے۔ ہمایوں کبھی زیادہ دنوں تک غزل کو بی بی کے ہاں چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ لیکن نصیر روز شام کو ہمایوں کے ہاں اتنے تحفے لے کر جانے لگا کہ ہمایوں نے غزل پر سختی کرنا چھوڑ دی۔

اب غزل کو احساس ہونے لگا کہ وہ نصیر کے ساتھ حیدرآباد میں نہیں رہ سکتی۔ ہر طرف اسے شناسا نظریں دکھائی دیتیں ــ لوگ اسے نصیر کے ساتھ دیکھتے

تومسکرانے لگتے اس لئے اس نے نصیر سے کہہ دیا کہ میں کبھی حیدرآباد نہیں آیا کروں گی۔ ـــــ بس وہیں کہیں اجنتا کے غاروں کی طرح وہ بھی ایک کٹیا بنا کر رہا کریں گے۔ ـــــ لیکن نصیر اپنا حال سنانا شروع کر دیتا۔ ایک چھوٹے سے قصبے کا حال۔ جہاں پرانے زمانے کی ایک عظیم الشان ڈیوڑھی ہے۔ اس میں نصیر کی سخت مزاج اماں جان رہتی ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر نصیر تنکا بھی نہیں توڑ سکتا۔ وہاں نصیر کے کھیت ہیں۔ جن میں وہ غزل کے ساتھ ٹریکٹر چلایا کرے گا ـــــ وہاں کے گاؤں میں لوگوں نے کبھی پیسٹری نہیں کھائی اسٹیج ڈرامے نہیں دیکھے۔ وہاں بوٹ کلب نہیں ہیں اور نہ بلگرامی اور بھان جیسے سوشل ورکرس۔

غزل نے یہ باتیں سنیں تو خوشی سے جھوم اٹھی۔ ایسی خوبصورت فضا۔ اتنے سادہ مزاج لوگ! بوٹ کلب اور بھارت کلا منڈل کی گندی فضا سے وہ جگہ کتنی مختلف ہوگی! وہاں وہ کسی کے اوپر بوجھ بن کر نہیں رہے گی۔ اس گھر میں سب اس کی عزت کریں گے۔ ـــــ وہ بھی فوزیہ کی طرح دلہن بن کر وہاں چلی جائے گی۔

ایک دن نصیر نے غزل کو لمبے لمبے ناخنوں پہ پالش لگاتے دیکھا تو ہنس کر کہا۔

"اورنگ آباد جانے سے پہلے تم کو یہ ناخن کاٹنا ہوں گے۔" اماں جان کو بڑی گھن آتی ہے لمبے ناخنوں سے۔"

یہ سن کر غزل کو بڑی ہنسی آئی۔ نانا حضرت اور بی بی کو بھی اُس کے اور فوزیہ کے لمبے ناخنوں سے بڑی چڑ تھی۔

"اور وہاں عورتیں بے پردہ نہیں پھرتیں نہ لپ اسٹک لگاتی ہیں۔"

پھر ایک دن کھانا کھاتے میں نصیر نے پوچھا

"تمہیں بریانی پکانا آتی ہے ـــــ؟" اس وقت نصیر کو وہ خوبصورت

سی دبلی پتلی لڑکی یاد آرہی تھی۔ جسے بہو بنانے کا اعلان کرتے وقت اماں جان بار بار یہی کہتی تھیں کہ اجی میرا تو دل نصیر کی سلیقہ مندی پر آگیا ہے۔ ـــــ کیا بتاؤں بچی ماں اس دن مرغ کی بریانی تو ایسی اچھی پکائی تھی کہ اچھا رڈ صورت باورچی شرما جائیں۔ خود نصیر کو بھی یہ گوری گوری بیوقوف سی لڑکی خاصی پسند تھی۔ لیکن اچھا ہوا کہ اماں جان نے ابھی وہاں باقاعدہ پیغام نہیں بھیجا تھا۔

"میرے کو تو کچھ بھی پکانا نہیں آتا۔" غزل نے بڑی شان سے کہا ـــــ چاند آپا کی صحبت میں وہ اس بات کو جان چکی تھی کہ اس کے خوبصورت ہاتھ روٹی پکانے اور چولھا جلانے کے لئے نہیں بنے ہیں۔

"پھر تو ہماری اماں جان آپ کے عورت ہونے میں شک کریں گی۔"

اس پر خود غزل کو بھی ہنسی آگئی۔

نصیر کے جاتے وقت وہ دونوں خوب روئے۔ غزل نے اس سے بے شمار وعدے لئے اور اس نے غزل کو تاکید کر دی کہ وہ آئندہ کسی ڈرامے میں کام نہ کرے اور باقاعدہ پردہ کرنے کی عادت ڈالے۔ کیوں کہ اس کی اماں جان بے پردہ عورت کو رنڈی سمجھتی ہیں۔

جانے سے پہلے نصیر تھوڑی دیر کے لئے بی بی کے پاس آبیٹھا اور بی بی کو سنا دیا کہ عنقریب اجالا بیگم غزل کا پیغام یہاں بھیجنے والی ہیں۔ بی بی تعجب کے مارے اچھل پڑیں۔! راشد اور رضیہ کا غصہ اور جلن کے مارے برا حال ہو گیا۔

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ یہاں تو کسی نے خواب میں بھی یہ بات نہ سوچی تھی کہ یہ آوارہ چھوکری اجالا بیگم کی بہو بن کر راج رچے گی۔ اس بات پر سب سے پہلے اقرار کرنے والے واحد حسین تھے۔ اور سب سے بعد میں رضیہ تیار ہوئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ایک بار پھر نئے سرے

سے نصیر آئے اور وہ غزل کو دھکا دے کر فوزیہ کو اس کے کمرے میں بھیج دے۔ حد ہوگئی ـــ فوزیہ کے لئے کہاں کہاں بڑا گھر ڈھونڈا اور ملا بھی تو یہ بوڑھا ڈاکٹر جس کے مطالبے کم ہی نہ ہوتے تھے۔ ادھر یہ دنیا بھر کی خوار خراب چھوکری اور اس نے رضیہ ہی کے گھر میں بیٹھ کر نصیر کو چھین لیا۔

دوسرے دن غزل اندر بیٹھی نصیر کو یاد کرکے رو رہی تھی تو جانے کیسے ڈگمگاتے قدموں سے چل کر چاند اس کے پاس آ بیٹھی اور اپنا سوکھا مارا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھا۔

"نصیر کو یاد کرنا چھوڑ دے گجو ـــ بچوں کو چاند کس نے لا کر دیا ہے؟"

غزل چاند کی بات سن کر چونک پڑی اور اس نے بڑے غور سے چاند کو دیکھا۔

"تم مجھے پاگل سمجھتی ہو ـــ! لیکن میرا کلیجہ دہل جاتا ہے جب سوچتی ہوں کہ تم اتنی یادوں کو لے کر کیسے جیو گی۔ ـــ؟"

انھوں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور اس کے پاس تخت پر آنکھیں بند کرکے لیٹ گئیں۔

یہ چاند آپا کیسی بدشگونی کی باتیں کرتی ہیں! غزل کو اب چاند آپا سے کوئی ہمدردی نہ رہی تھی۔ یہ بھی شاید ممانی بیگم کی طرح اس کے نصیب جاگنے پر جل رہی ہیں

"چاند آپا انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اپنا کوئی شعر میرے ذکر کے بغیر پورا نہ کریں گے۔

"بھولی دیوانی ـــ" چاند آپا کی مسکراہٹ میں نیم کے پتے گھلے ہوئے تھے ـ "ان کے شعروں کی تکمیل سے کیا تیری زندگی سنور جائے گی ـ"

وہ اپنی سانس ٹھیک کرنے کے لئے رک گئیں۔

"یہ آرٹسٹ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں گجو۔ انھیں کسی کی رفاقت نہیں چاہیے۔ زندگی کو خوبصورت بنانے والی یادیں چاہییں۔

خیر، چاند آپا کچھ بھی بکتی رہیں ـــ لیکن نصیر کا خیال تو اس کی روح میں رچ گیا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ نصیر بلگرامی نہیں ہے ـــ یہ تو اس کی قسمت تھی کہ اس کا دولہا اتنی بڑی جائداد کا مالک ہے۔ ورنہ وہ تو غریب

نصیر کو بھی اسی طرح قبول کر لیتی ــــ نصیر نے کہہ دیا تھا کہ اسے جہیز نہیں چاہیے ـــــ ایک فوزیہ تھی کہ اس کا میاں چھ سات سو روپے کمانے والا ڈاکٹر تھا۔ اس پر بھی سسرال والوں کی ناک سیدھی نہ ہوتی تھی۔ ممانی بیگم جہیز کی فہرست بڑھاتے بڑھاتے تھکی جا رہی تھیں۔ ابھی انھوں نے ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے شاہین کو بھی یوروپ بھیجا تھا۔ اب وہ بیٹی کی شادی پر زیادہ پیسہ اٹھانے کو تیار نہیں تھیں۔ فوزیہ کی ساس کہہ گئی تھیں کہ زیور چڑھانا اور ولیمہ کرنا ان لوگوں کو راس نہیں ہے۔ اس لئے وہ صرف دلہن کے کپڑے لائیں گی۔

فوزیہ نے ابھی تک اپنے ہونے والے دولھا کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس کے باوجود سنی سنائی باتوں پر اس نے نہ صرف اپنے دولھا کی صورت کا تصور کر لیا تھا۔ بلکہ اس کی عادت و اطوار سے بھی پوری طرح واقف ہو چکی تھی۔

"انھیں مستی پسند نہیں ہے ـ کہہ دیا ہے کہ جلوے کے دن میرے مستی مت لگانا ـــــ"

"سنا ہے گوشت بڑے شوق سے کھاتے ہیں ـــــ فضول خرچی سے بڑی چڑ ہے ـــــ بڑے صفائی پسند ہیں ـــــ"

وہ غزل کو چپکے چپکے سناتی اور پھر خود ہی ہنسنے لگتی تھی۔

فوزیہ کی باتیں سن سن کر غزل اپنے خیالوں میں ڈوب جاتی۔ کھانے پینے کا تو کچھ شوق ہی نہیں ہے۔ ـــــ بس میں سامنے بیٹھی رہوں اور وہ شاعری کرتے رہیں۔ ـــــ

کہتے ہیں میری آنکھوں پر تو وہ ایک ہزار سال تک شعر کہتے رہیں گے۔ انھیں کنجوسی سے بڑی چڑ ہے ـــــ وہ کہہ گئے ہیں کہ میں اب کبھی ڈرامے میں کام نہ کروں۔ ـــــ"

لیکن ہمایوں کیوں مانتا! اور سچی بات تو یہ تھی کہ ہمایوں بھی کوشش نہیں کرتا تھا۔ لوگ خود ہی چلے آتے تھے۔ ہمایوں کی خوشامد کرنے وہ لوگ اپنی مجبوریوں کو اس طرح ظاہر کرتے کہ غزل کا دل بھی پسیج جاتا تھا۔

خورداد کا مہینہ آگیا ـــ

ہلکی ہلکی بدلیاں چھائی رہتی تھیں ــ اور بدلتے موسم کا مدوجزر دلوں میں بھی کھلبلی مچائے ہوئے تھا۔

حیدرآباد کی سرحدوں پر انڈین یونین کی فوجیں آ چکی تھیں۔ ہر طرف سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ کیوں کہ اعلیٰ حضرت نے سروالٹر مانکٹن کے ذریعے دہلی جو تجاویز بھیجی تھیں وہ نامنظور ہو چکی تھیں۔ ادھر قاسم رضوی جناح سے بڑی بڑی امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ لیکن اس بات سے ناواقف تھے کہ حیدرآباد سے جانے والے خطوط، ٹیلیگرام اور خبروں کا سارا ریکارڈ انڈیا کے ایجنٹ کے۔ ایم۔ منشی کے پاس تھا۔ لیکن قاسم رضوی نے عوام کو یہ باور کرا رکھا تھا کہ پاکستانی ہوائی جہاز فوجی کمک لے کر بیگم پیٹھ کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ مگر مسٹر جناح جانتے تھے کہ حیدرآباد کے مستقبل کا حل فوجی کارروائی میں نہیں ہے۔ اس لئے وہ کسی بھی جارحانہ ایکشن کے خلاف تھے۔ اس نازک مرحلے پر بھی قاسم رضوی اپنا مشن واپس لینے کو تیار نہیں ہوئے۔

کیوں کہ عوام میں سلطنتِ آصفیہ کے بچانے کے لئے بڑا جوش و خروش تھا۔ اس لئے قاسم رضوی نے اپنے طور پر رضاکاروں کو سرحدوں پر لڑنے کا حکم دے دیا تھا۔

"کنگ کوٹھی" میں بیٹھے ہوئے "اعلیٰ حضرت" "دہلی کے بدمعاشوں" اور رضاکار غنڈوں کا منہ توڑنے کا حکم دیتے رہے۔ لیکن اس وقت تک "نہتے" نوجوان انڈین یونین کی فوج کا مقابلہ کرنے پہنچ گئے اور ٹینکوں کے نیچے تنکوں کی طرح پسنے لگے۔

"اس وقت تاشقند بڑے غور سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مختلف چیزوں کی تجارت سے اتنا کما لے کہ "ایوان غزل" کا سارا قرض بے باق ہو جائے۔ اب حیدرآباد کا ہر تاجر نفع نقصان کی ترازو تھامے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کا پلڑا کس طرف جھکنا چاہیے۔؟

ہر طرف ہما ہمی تھی۔ سب فرار کے راستے ڈھونڈ رہے تھے۔ مفاد پرست خود ساختہ لیڈر معصوم اور نہتے نوجوانوں کو بہکا رہے تھے۔ فضا نعروں اور تکبیروں سے گونج رہی تھی۔"

"آگے بڑھو" وطن کے لیے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دو۔"

قاسم رضوی چلا رہے تھے۔

"غنڈے بدمعاش ـــــ ان سب کو گرفتار کروا دو۔"

اعلیٰ حضرت غصے اور غم کے مارے حکم دیتے رہے۔ انھیں سخت تعجب تھا کہ آج ان کے عتاب سے در و دیوار لرز کیوں نہیں جاتے!

ہر گھر کا ایک نہ ایک نوجوان جنگل کی کسی جھاڑی میں الجھا ابدی نیند سو رہا تھا ـــــ عالم جنون میں انھوں نے بڑھتے ہوئے ٹینکوں کو روکنے کے لیے اپنے ہاتھ پھیلا دیے تھے۔ کیوں کہ ان کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی حفاظت کی کوئی تیاری نہیں کی تھی ـــــ وہ تو ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے باشندے تھے جو ریاست سے باہر کے ہر فرد کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ ان کی بخشش اور سخاوت کے دور دور تک چرچے تھے۔ جسے یہاں پناہ ملی اس کی سات پشتوں کا ٹھکانا ہو گیا ــــ جو یہاں سے دھتکارا گیا اسے کہیں آسرا نہیں ملا ـــــ ہماری تہذیب ـــ

ہمارا ملک ——— ہمارا وطن ——— ہمارے حضور ——— اور حضور پر جان نثار کرنے والی ان کی وفادار رعایا ——— جو توپوں کے دہانے کے آگے سینہ سپر تھی ——— کیوں کہ وہ حضور پرنور کے وجود کے بنا جینے کا تصور نہیں کر سکتے تھے ——— یہ بڑی عجیب سی شہنشاہی تھی —— انوکھی آمریت —— جہاں بادشاہ سے پیار اور تعظیم کا جذبہ ہر حد سے افضل تھا —— اور اس کا ثبوت انڈین یونین کی فوجوں کو پانچ دن میں ہر ہر قدم پر ملا۔

اب سڑکیں سنسان پڑی تھیں ——— ان ماؤں کے دلوں کی طرح جنھوں نے اپنی آنکھوں کی جوت کھو دی تھی۔

بغاوت کا جوش دبانے والے کچھ لوگ تو راتوں رات پاکستان بھاگ گئے تھے باقی جو رہ گئے تھے وہ بھی کہیں نہ کہیں روپوش تھے۔

"ایوان غزل" کے باغ میں انگریزی بولنے والی چڑیا حیران تھی کہ نواحد حسین کئی دن سے باغ میں کیوں نہیں آرہے ہیں۔

وہ ان کی کرسی ——— کے آس پاس شوں —— شوں —— شور ——— دوو ——— کرتی پھرتی۔

باغ کی روش پر لگے ہوئے پھول سر اٹھائے ان کی آمد کے منتظر تھے۔ مگر ان کے سر قطع کرنے کا حکم دینے والا ہارٹ اٹیک سے نڈھال اپنے کمرے میں گم سم پڑا تھا اور اس کی تمام بیا فیں الماری میں چپ چاپ پڑی تھیں۔

ایوان غزل کے باسی اتنے باشعور تھے کہ نہ صرف انھوں نے آنے والے خطرے کو بھانپ لیا تھا بلکہ اپنے لئے پناہ گاہیں بھی تیار کرلی تھیں —— راشد کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔

کیوں کہ وہ ایک آدھ مہینہ پہلے اتحاد المسلمین کا سرگرم کارکن بن گیا تھا۔ اس نے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور تاجروں سے چندے اکٹھے کئے اور قاسم رضوی کے سامنے لاکر ڈالتا رہا۔ کیوں کہ وہ چاہتا تھا کہ بات صرف سمجھوتے سے ختم نہ ہوجائے۔ ایسی صورت میں اسے کئی لاکھ کا گھاٹا ہوتا۔

اور جب معلوم ہوا کہ یونین کی فوجیں آرہی ہیں تو وہ سیاست و یاست چھوڑ صرف بزنس مین بن گیا۔

"اپن سیاست کے چکروں میں نہیں پڑیں گے ——" اس نے اپنے دوستوں سے کہا ——— "ہم تو بزنس مین ہیں —— ہمیں کیا لینا دینا"

وہ شولاپور اور احمد آباد کے راستے چیزیں اسمگل کرتا رہا۔

لیکن بیٹے کی ان سرگرمیوں سے واحد حسین کے دل میں کوئی امنگ نہ جاگی۔ اور ان کا دل بجھتا ہی گیا۔ وہ جو گزشتہ شان و شوکت کے واپس آنے کی ایک موہوم امید تھی وہ پوری طرح ڈوب رہی تھی۔ اس لئے ہر جاگیردار گھرانے میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی

یہ وہ لوگ تھے جو بالکل نہیں جانتے تھے کہ عیش وہ عشرت کی زندگی گزارنے کے لئے۔ موقع پرست ذہن' ہر بات برداشت کرنے والے دل اور ہر ایک کی تعریف کرنے والی زبان کی بھی ضرورت ہوگی ۔ وہ تو یہ جانتے تھے کہ جاگیردار کا بیٹا بھی جاگیردار ہوگا۔ امیر آدمیوں کی قسمت اللہ میاں ایک بار سونے کے قلم سے لکھ ڈالیں تو پھر اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔

واحد حسین کے دادا پائیگاہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان صاحب اقتدار لوگوں میں سے تھے جن کی اپنی فوج اور پولیس تک تھی۔

یہی وہ لوگ تھے جو سلطنت آصفیہ کے اصل نگہبان کہلاتے اس وقت تک نہ تو ریذیڈنٹ کا ڈنڈا سر پر آیا تھا اور نہ خود حضورِ اعلیٰ کو اتنا اختیار تھا کہ پائیگاہ والوں سے کوئی بازپرس ہوتی۔ ایسے میں موج اڑانا صرف واحد حسین کے باپ دادا کی میراث تھی۔ اسی لئے انھوں نے "ایوانِ غزل" بنایا اور اس میں ہر زمانے کے مطابق ایک نیا معشوق جلوہ گر رہا — ان حسیناؤں کا محض تصور ہی بڑے بڑے جاگیرداروں کو بے چین کیے رکھتا تھا۔ خود حضور کی نظریں بھی ہمیشہ "ایوانِ غزل" کی سرمستیوں پر لگی رہیں۔ کیوں کہ "عنبری باغ" میں اگرچہ سارے ہندوستان کے ہیرے جواہرات اکھٹے کیے جاتے تھے، مگر "ایوانِ غزل" میں چمکنے والے چاند کے آگے ان کی کوئی حقیقت نہ ہوتی۔ اس کی کشش دور دور سے لوگوں کو کھینچ لاتی تھی — نصیر بھی ایوان غزل میں کسی ایسے ہی محبوب کا تصور کر کے آیا تھا — اور جلتے وقت وہ حسن کے سحر سے پتھر کی مورت بن گیا تھا۔ اسی سرمستی میں آکر واحد حسین کے باپ دادا نے کھیت کے کھیت چبا ڈالے — ڈیوڑھیاں نگل لیں۔ بیویوں کے زیور پھانک گئے — اور کولھے سے ہاتھ پونچھ کر قبر میں جا سوئے — رہ گئی اولاد تو سزا بھگت رہی تھی —

دن میں دو دو بار ڈاکٹر آتا تھا — مگر واحد حسین کو دوا پلانے کے بجائے دو چار خوش خبریوں کے انجکشن دے کر چلا جاتا۔ شام کو راشد اخبار سامنے رکھ کر بیٹھ جاتا تھا اور ایک چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ اس کے اوپر رکھتا۔ جس میں سے واحد حسین کو اچھی اچھی خبریں پڑھ کر سنائی جاتیں۔ اب رہ گئے لنگڑی پھوپھا اور شیخو میاں تو بقول راشد کے یہ دونوں بڑے جھوٹے

گپ باز تھے۔ ریڈیو کی خبریں بھی وہ خوب بڑھا چڑھا کر اور نمک مرچ لگا کر سناتا تھا تاکہ لوگوں میں خوف و دہشت پھیلے۔

لیکن لنگڑی پھوپو اس زمانے میں اخباروں پر قطعی اعتبار نہ کرتی تھیں۔ بلکہ ان کے نامہ نگار خصوصی دھوبی، ماما، بھوئی اور سب سے بڑھ کر شیخو میاں تھے۔ شیخو میاں رضاکاروں میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن ڈر کے مارے گھر سے باہر قدم نہ رکھتے تھے۔ البتہ بھوئی اور کریم کی سنائی ہوئی خبروں کی بنیاد پر رضاکاروں کی فتوحات کی جو کہانی وہ گڑھتے تھے اس کے ہیرو وہ خود ہوتے اور یہ کہانی ان کی بہادری کے کارناموں سے بھری ہوتی۔

اس لئے راشد نے واحد حسین کے کمرے پر سخت پہرہ لگا دیا تھا کہ سوائے بی بی اور ڈاکٹر کے کوئی نہ جائے۔ مگر واحد حسین کی بیماری نے بی بی کو ایسی چپ لگائی تھی کہ وہ واحد حسین سے باتیں کرتیں نہ کسی اور سے۔ دن رات چپ چاپ بیٹھی در و دیوار کو گھورے جاتیں — یہ وقت ہی ایسا تھا۔ سب ہی لرزہ براندام تھے کوئی کسی سے بات نہ کرتا دن رات سجدوں میں گرے توبہ تلا کیا کرتے —

واحد حسین اپنے کمرے میں پڑے کڑوی کسیلی دوائیں پیے جاتے مگر ان کا دل و دماغ اورنگ آباد میں تھا، جہاں ان کا بھائی جانے کتنی پریشانیوں میں گھرا ہوگا — ویسے تو راشد نے انھیں اطمینان دلا دیا تھا کہ اس نے اپنے دوست سے سب کی خیریت منگوالی ہے اور وہ لوگ بالکل محفوظ ہیں۔ لیکن دراصل اورنگ آباد کے بارے میں بڑی پریشان کن خبریں آتی تھیں۔ خصوصاً احمد حسین کی جاگیر کے بارے میں تو اطلاع ملی تھی کہ بمباری سے تہس نہس ہو چکی ہے — جانے اجالا بیگم، احمد حسین اور نصیر کہاں ہوں گے بھی یا نہیں! بعض وقت بی بی کو اجالا بیگم کی باتیں اور محبتیں یاد آتی تھیں تو وہ چپکے چپکے رونے لگتیں — وہ دنیا کی

پہلی جٹھانی تھیں جو اپنی دیورانی کی تباہی پر رو ئی تھیں ۔ ان کے آنسو دیکھ کر رضیہ کو بہت غصہ آیا ۔ یہ کیسی عورت ہے کہ اپنے بیٹے کی تقدیر جاگنے پر خوش ہو نے کی بجائے رو رہی ہے ۔ ارے بلا سے غنڈے ڈیوڑھی کو لوٹ کرے جائیں ۔ مگر ڈھائی لاکھ کی جائداد کو تو اٹھا کر نہیں لے گئے ہوں گے ۔ آج نہیں تو کل ۔ آخر وہ چیزیں اپنی ہی ہوں گی ۔

اور ایک غزل تھی کہ روتے روتے پاگل ہوئی جا رہی تھی ۔ جب سے نصیر گیا تھا ۔ اس نے لوٹ کر کوئی خبر نہ لی تھی ۔ حالانکہ غزل نے ایک دن میں چار چار خط لکھے تھے ۔ فوزیہ کہتی تھی کہ نصیر کی اماں جان بڑی جلاد ہیں ۔ وہ یقیناً غزل کے سارے خط حاصل کر کے پھینک دیتی ہوں گی ۔ اب دیکھنا وہ ایک دن اچانک بارات ہی لے کر آنے والا ہے اور غزل بیچاری ہر وقت دروازے پر کان لگائے بیٹھی رہتی ۔ آج کل ڈراموں کا بھی کسی کو ہوش نہیں تھا ۔ جگہ جگہ امن کمیٹیاں بن رہی تھیں ۔ مسجدوں میں جا کر لوگ دعائیں مانگتے اور درگاہوں میں عورتیں منتیں لے کر جاتیں ۔ کہ ان کے شوہر اور بھائی خیریت کے ساتھ واپس آجائیں تو پھولوں کی چادریں چڑھائیں گی ۔ مگر ان درگاہ والوں کو شاید ہزاروں انسانوں کے بدن سے کپڑے اترتے دیکھ کر اب پھولوں کی چادروں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی ۔

ایک دن سڑک پر شور سن کر غزل کھڑکی میں بھاگی ۔ اس کے پیچھے پیچھے بی بی، رضیہ اور لنگڑی پھوپو بھی آگئے ۔

سڑک پر سے رضاکاروں کے دستے لڑائی پر جا رہے تھے ۔ پیدل مارچ پاسٹ کرتے ہوئے پچیس تیس برس سے لے کر سولہ سترہ برس کے نوعمر لڑکے بھی تھے ، جن کے آگے آگے موت چل رہی تھی ۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی راہ کون سی ہے ۔ مگر اس کے باوجود عزت اور وطن دوستی کے نام پر کٹ مرنے کو تیار ہو گئے تھے ۔ سارے محلے کے لوگ ان پر پھول پھینک رہے

تھے ۔ نعرے لگا رہے تھے ۔ جگہ جگہ انھیں روک کر پھول پہنائے جاتے ۔

غزل نے غور سے دیکھا ۔ اس دستے کے کمانڈر شیخو میاں تھے ۔ ان کی پتلی کمر پر پتلون کسی طرح نہیں ٹک رہا تھا ۔ وہ صرف آدھے میل چل کر بُری طرح ہانپ رہے تھے ——

" اوبی —— شیخو بھائی اتنے جوان چھوکروں کو کہاں لیے جا رہے ہیں —— " لنگڑی پھوپو نے گھبرا کے پوچھا ۔

" پھوپو —— پھوپو ۔ انھیں روکیے ۔ " غزل نے روتے ہوئے لنگڑی پھوپو کو جھنجوڑ کر کہا ۔

پھر راشد بھی پھاٹک سے باہر آیا ۔ اور ان لوگوں کو روک کر سب سے ہاتھ ملائے ۔ مبارک باد دی اور انھیں پہنانے کے لیے پھول منگوائے ۔ اچانک فوزیہ چلائی ۔

" ایاز بھائی —— غزل دیکھ ایاز بھائی بھی جا رہے ہیں "

غزل نے گھبرا کے دیکھا ۔ سچ مچ ایاز تھا ۔ خاکی وردی پہنے ۔ کاندھے پر بندوق رکھے، سب کے ساتھ چل رہا تھا اور چاہتا تھا کہ " ایوان غزل " کے سامنے سے جلدی نکل جائے ۔ اس پر کسی کی نظر نہ پڑے ۔

" ایاز بھائی —— میرا بھائی —— " غزل چلائی تو وہ صف توڑ کے چلا آیا اور بی بی کے سامنے قدم بوسی کے لیے جھکا —— سب زور زور سے رو رہے تھے ۔

" گجو ۔ میں بھی محاذ پر جا رہا ہوں ۔ تو گھبرانا مت ۔ میں جلد ہی آجاؤں گا ۔ " ایاز سب کو روتے دیکھ کر خود بھی خوف زدہ سا ہو گیا تھا

" نہیں نہیں —— ہرگز نہیں ۔ میں نہیں جانے دوں گی "

غزل اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے رونے لگی ۔

بی بی اور لنگڑی پھوپو نے بھی منع کیا ۔

"دیکھ گجو۔ مجھے میٹرک پاس کرنے سے کہیں نوکری نہیں مل رہی ہے میں وہاں سے واپس آؤں گا تو فوج میں مجھے بہت بڑی پوسٹ مل جائے گی۔ قاسم رضوی نے ہم سے وعدہ کیا ہے۔ پھر ہمارے گھر کی سب مصیبتیں دور ہو جائیں گی۔ تیرا رونا ختم ہو جائے گا۔ مجھے جانے دیجئے بی بی" ایاز نے رو رو کر سب سے کہا اور سب کے سامنے ایاز کا درخشاں مستقبل آ گیا۔ سچ مچ ان بچوں کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔

"مگر ایاز بھائی تم لڑنا کیا جانو۔ ایک بندوق سے کیسے لڑو گے؟" فوزیہ نے پوچھا۔

پھر راشد اندر آیا اور سب کو ڈانٹنے لگا۔

یہ کیا ہائے واویلا مچائی ہے۔ خواہ مخواہ ایاز کو بھی پریشان کر رہی ہو۔ آخر ہمارے خاندان سے ایک آدمی بھی لڑنے نہیں جائے گا تو بدنامی نہیں ہوگی؟ ——— جاؤ بابا، اللہ کو سونپا ہے تمہیں۔ خیریت سے گھر واپس آنا۔"

ادھر لنگڑی پھوپو شیخو بھائی کو کسی طرح نہیں جانے دے رہی تھیں اور روتے روتے ان کا بُرا حال تھا۔ آخر راشد نے سب کو زبردستی اندر کیا اور پھر سب واحد حسین کے ڈر سے خاموش ہو گئے کہ ایاز کے جانے کی خبر سے ان کی طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔

اس دن کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ سارے گھر پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سوائے اس چڑیا کے جو دالان کی الگنی پر بیٹھی بار بار گھر والوں سے پوچھتی تھی۔

"شوں شوں۔ شوشو ——— دو ——— دو ———"

سڑکوں پر جیپ کاریں اور ٹینک چلاتے پھرتے۔ رات کو بلیک آؤٹ میں سارا شہر قبرستان لگتا تھا۔

لنگڑی پھوپو اور غزل ساری رات جا نماز پر بیٹھے محاذ پر جانے والوں کی خیریت کی دعائیں مانگتے تھے۔

اس کے ساتھ ہی لنگڑی پھوپو آج کل اتنے غرور سے بات کرتی تھیں جیسے وہ شہید بھگت سنگھ کی بہن ہوں۔

"بہن میں نے تو شیخو بھائی سے کہہ دیا ہے کہ دشمنوں کو پیٹھ نہ دکھانا آخر پٹھان کا خون ہے۔ میرا بھائی تو رن میں بجلی کی طرح چمکے گا۔"

لیکن دوسرے دن دیکھیے تو شیخو میاں لان کی سیڑھیوں پر بیٹھے سینڈھی کے نشے میں مست، بیڑی پی رہے تھے۔ پوچھنے پر بڑی شان سے بولے کہ فی الحال تو ان چھوکروں کو بھجوا دیا ہے۔ میں چند دن بعد جاؤں گا۔"

اسی دن دوپہر کو، جب سب نوکر چلے گئے تو رضیہ اور بی بی نے مل کر آنگن میں ایک گڑھا کھودا اور اس میں سب زیور روپیہ پیسہ رکھ دیا۔ کیوں کہ راشد کہتا تھا کہ اگر لوٹ مار مچی تو ہمارے گھر پر سب کی نظر جائے گی۔ لنگڑی پھوپو نے گڑھے کی مٹی برابر کر کے ایک کروٹن کا گملا لا کر اس گڑھے پر رکھ دیا پھر انھوں نے کھڑے ہونے کے لئے لاٹھی اُٹھائی تو لرز کر رہ گئیں ———

سامنے ایک اجنبی عورت کھڑی تھی۔ لمبی دبلی۔ خوب صورت سی۔ بڑی بڑی آنکھوں والی۔ سفید ساری پر سیاہ برقع اوڑھے۔ اس کے ساتھ دو تین برس کی ایک سانولی سی بچی تھی ———

"کون ہو تم ———" رضیہ نے گھبرا کے پوچھا ——— کیوں کہ سب نوکر جا چکے تھے۔ راشد بھی گھر میں نہیں تھا۔ اور آج کل سنا تھا کہ سی۔ آئی۔ ڈی والے سب پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

میں قیصر ہوں ——— قدم بوسی ممانی جان ——— آداب عرض ——— گوہر پھوپو ———"

"قیصر ——— ؟" سب چونک پڑے۔ بی بی بھی کمرے سے باہر نکل

آئیں۔ غزل غور سے اسے دیکھنے لگی۔

یہ قیصر تھی ـــــ وہی لمبے بالوں ـــــ والی لڑکی جس کی لمبی چوٹی کاٹ کے بشیر بیگم نے آنگن میں پھینک دی تھی ـــ رضیہ تو اسے دیکھ کر کانپ اٹھی ـــ الٰہی خیر ـــــ سنا ہے یہ تو کمیونسٹوں کی سرغنہ ہے ۔ کیا پتہ یہاں کیا لوٹ مار کرنے آئی ہے ۔ جانے اس کے ساتھ کتنے غنڈے باہر کھڑے ہوں گے ! لنگڑی پھوپو نے بھی شاید یہی بات سوچی۔ اس لیے جھٹ بڑھ کر اسے گلے لگایا۔

" ارے قیصر ہے ـــــ ! اتنی بڑی ہو گئی تو ـــــ رنگ کیوں اتنا جل گیا ـــــ اری تو بڑی بے مروت ہے ـــ ہم سب تجھے اتنا یاد کرتے ہیں ـــــ"

" اچھی تو ہے قیصر ـــــ ؟" بی بی نے بھی دھڑکتے دل سے کہا۔

" فاطمہ بیگم کہاں ہیں ـ ؟"

" جی ـــ میں ذرا چاند سے ملنے آئی ہوں ۔ ایک ضروری کام ہے۔" اس نے سب کو نظر انداز کر کے کہا ۔

" چاند سے ـــــ ؟" اب تو سب اور بھی گھبرائے ۔ چاند کی تو اس سے ہمیشہ پکی دشمنی رہی ہے ۔ جانے آج کیوں ملنا چاہتی ہے ۔"

" ہم نے تو سنا ہے کہ تم نے کسی ہندو سے شادی کر لی ہے جنگلوں میں بندوق لیے گھومتی ہو ـــ کمیونسٹوں میں مل گئی ہو ـــــ" رضیہ نے اب ذرا جرأت کے ساتھ کہا۔

" جی ہاں آپ نے صحیح سنا ہے ـ" وہ آکر دالان میں بچھے ہوئے تخت پر بیٹھ گئی ۔ بچی کو اپنے پاس بٹھا لیا۔

" آپ چاہیں تو مجھے ابھی گرفتار کرا سکتی ہیں ـ" اس نے مسکرا کے کہا۔

" آپ کے چچا نے تو میرے سر کی قیمت ایک ہزار مقرر کی ہے ۔"

یہ سن کر سب تھر تھر کانپنے لگے کہ وہ چڑیل ان کے گھر پر کوئی مصیبت نہ چھوڑ جائے ۔

" تو پھر کیوں آئی ہے یہاں ۔ ہم سے تمہارا کیا رشتہ ہے ـ ؟"

" ہاں میں جا رہی ہوں ۔ اپنی بچی چاند کے پاس چھوڑنے آئی ہوں ۔ کیوں کہ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے ۔ کرانتی کے باپ نے مجھ سے کہا ہے کہ اسے میں چاند کو دے آؤں ۔"

" کون ہے اس کا باپ ـــ ؟" لنگڑی پھوپو نے غصے میں پوچھا۔

" سنجیوا ـــــ "

" سنجیوا ـــــ ؟ جیسے سب آگ میں جا پڑے ۔

لنگڑی ممانی کو یوں لگا جیسے بشیر بیگم نے ابھی ابھی قیصر کی چوٹی کاٹ کر آنگن میں پھینکی ہے اور قیصر نے پھر کر چاند کا کلیجہ چبا ڈالا ہے ۔

" ہونھ ۔ ذلیل واحد حسین نے اپنی حرافہ نواسیوں کو پناہ دے کر اس گھر کو بدنام کر دیا ہے ۔ لیکن اب میں حرامی بچے یہاں پال کر " ایوان غزل" کو قحبہ خانہ نہیں بناؤں گی ـ"

لنگڑی پھوپو کی آواز میں اس وقت بڑا دبدبہ تھا ۔ وہ بڑی اونچائی سے بول رہی تھیں ـ

"کہاں ہے سنجیوا کی لڑکی ـــــ یہاں لاؤ ـــ ادھر آؤ قیصر ـ"

اپنے کمرے کے دروازے میں چاند پر چھائیں کی طرح کھڑی لرز رہی تھی ۔ قیصر اندر گئی تو چاند نے دونوں ہاتھوں میں اسے سمیٹ کر خوب پیار کیا جیسے آج وہ پرانی دشمنی بھلا کر قیصر سے نئے رشتے استوار کر رہی ہو ـ اور جب اس نے کانپتے ہاتھوں سے بچی کو تھام کر سینے سے لگایا تو کسی طرح اپنے آنسو نہیں روک سکی ۔ چاند کی حالت دیکھ کر قیصر بھی رو رہی تھی ـ اور اس کے سفید ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں چپ چاپ تھامے بیٹھی تھی ـ

سے کہا۔

"ہوس پرستوں نے اپنے مفاد کے لیے تمہارے بھائی کو موت کی آگ میں جھونک دیا ہے۔ اب تم اس کے لیے صبر کرنا۔"

"نہیں نہیں ——" غزل اور زور سے رونے لگی۔

"رونا چھوڑو غزل۔ بلکہ اپنی یہ روش بھی بدلو ——" قیصر نے اسے گلے لگا کر کہا۔ "چاند کی طرح مردوں سے کھیلنا چھوڑ دو۔ جسم کے علاوہ دماغ بھی تو ہے تمہارے پاس۔ وہ کیوں نہیں بیچتیں۔!"

قیصر سے اتنی صاف صاف باتیں سن کر غزل کو بہت غصہ آیا مگر وہ رونے کے سوا کوئی جواب نہ دے سکی۔

"اچھا تو غزل میں جاتی ہوں۔ میری بچی کو 'ایوان غزل' کی روایتوں سے بچائے رکھنا۔ اور اسے یہ ضرور بتا دینا کہ اس کی ماں کون تھی! باپ کون تھا ——" قیصر نے جلدی سے چہرے پر نقاب ڈالی۔ اور باہر چلی گئی۔

"تم اس سے کیا باتیں کر رہی تھیں؟" رضیہ نے غزل کے پاس آکر پوچھا

"ایاز بھائی کو واپس لانے کے لیے کہا۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔"

غزل ابھی تک سسکیاں لے رہی تھی۔

چاند آپا کے کمرے میں گئی تو کرانتی ان کے کاندھے سے لگی لگی سو چکی تھی

"قیصر تم سے کیا کہہ رہی تھی ——؟" چاند نے بڑے اشتیاق سے پوچھا شاید انھیں امید تھی کہ قیصر نے سنجیوا کی باتیں کی ہوں گی۔

"سنجیوا ماما آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ انھوں نے کرانتی کو بھیجا ہے۔ وہ بھی جلد آئیں گے۔" اپنے جھوٹ پر غزل کو خود تعجب ہو رہا تھا۔

"نہیں اب وہ نہیں آئے گا ——" چاند نے بستر پر لیٹ کر کرانتی کو اپنے قریب کر لیا۔

"اور اب میں اس کا انتظار نہیں کروں گی۔ ——"

جب چاند نے بچی کو اٹھا کر سینے سے لگایا تو قیصر کھڑی ہو گئی۔

"تو میں جاؤں چاند! ہم دونوں کو کرانتی کی بڑی فکر تھی۔ لیکن سنجیوا نے کہا کہ اسے صرف تم بچا سکو گی۔" قیصر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

"ہاں میں صرف اسی کو بچا سکوں گی۔" چاند نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

"کیوں کہ یہی تو وہ خواب ہے جو میں نے دیکھا تھا۔"

—— قیصر جانے لگی۔ چاند نے آنکھیں بند کیے کیے اس کے پاؤں کی آہٹ سن کر کہا۔

"پھر کب آؤ گی۔"

"کبھی نہیں ——" قیصر نے دھیمی آواز میں کہا ——

"میں انڈر گراؤنڈ ہوں۔ گرفتار ہونے پر مجھے پھانسی دی جائے گی —— کرانتی کو بار بار سردی ہو جاتی ہے —— اسے ذرا سی چائے ——"

اور پھر قیصر جلدی سے باہر آئی تو اس نے بی بی، لنگڑی پھوپو اور رضیہ کے منتظر چہروں کو بالکل نہ دیکھا ——

البتہ پھاٹک کے پاس غزل نے اسے روک لیا ——

"آپ کی لڑکی اس گھر میں کیسے رہے گی ——؟"

"ہاں میں جانتی ہوں۔ چاند بیچاری تو بس اب مرنے ہی والی ہے۔ لیکن کرانتی کو میں تمہارے حوالے کر رہی ہوں۔ تم غزل ہو نا ——؟"

غزل گھبرا گئی —— کرانتی کو وہ کیسے سنبھالے گی!

"تم بھی اسی خاندان کی روایتوں میں رنگ چکی ہو ——"! قیصر نے غزل کو غور سے دیکھا۔

"میرا بھائی محاذ پر چلا گیا ہے۔" غزل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"آپ اسے کسی طرح بچا کر لے آئیے۔"

"نہیں —— ہم کچھ نہیں کر سکتے غزل بی بی ——" اس نے بڑی بے رحمی

پھر انھوں نے بڑے غور سے سوتی ہوئی بچی کو دیکھا ــــ
اس کے سانولے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔ اس کے گھنے گھنگریالے بالوں وسمیٹ کر چوما اور آنکھیں بند کر لیں ــــ

"چاند آپا ــــ" غزل چلانے لگی۔

یوں زندوں میں تو چاند کا شمار دو برس سے نہ تھا۔ مگر اس کی موت پر بی بی یوں روئیں جیسے آج پھر ان کی ایک جوان بیٹی مر گئی ہو۔ انھیں بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے اور وہ پتھر کی مورت بن گئی تھیں ــــ

"کہاں ہے چاند ــ کہاں ہے چاند ــــ؟" واحد حسین اپنے کمرے سے لڑکھڑاتے ہوئے آئے اور انھیں کہیں چاند کی سفید چادر میں ڈھکی ہوئی لاش نظر نہ آئی۔

"کہاں گئی وہ ــــ میرا چاند ــ میرا بیٹا ــــ" وہ سر پیٹ پیٹ کر رو رہے تھے ــــ سارا گھر گم سم تھا۔

رضیہ نے چھبیس برس کی چاند کو دیکھا تو رونے کی بجائے سر پر پلّو سنبھال کر توبہ کرنے لگی ۔ لنگڑی پھوپو آنے والی عورتوں کے بیچ بیٹھی بین کر رہی تھیں کہ ان کی نواسی کیسی ستی ساوتری کنواری اُٹھ گئی ــ لوگوں نے اسے بدنام کر کے کلیجہ چھلنی کر دیا تھا۔

فوزیہ پچھاڑیں کھانے والی غزل کو سنبھال رہی تھی۔ غزل کو یوں لگا جیسے آج اس کی ماں پھر مر گئی ۔ چاند آپا کو اس نے سب سے زیادہ چاہا تھا۔ وہ اس کا سورج تھیں ــ اس کی زندگی اس وقت چاند کے چہرے پر اس کی وہ مشہور روایتی خوبصورتی پھر لوٹ آئی تھی، جس نے اسے سارے حیدرآباد میں مشہور کر دیا تھا ۔ اس کے چمکتے ہوئے چہرے پر پندرہ سولہ برس والی لڑکیوں کی معصومیت اور شادابی تھی ۔ اس کے گلابی ہونٹ کنول کی کچی کلیوں کی طرح پاک لگ رہے تھے اور اس کے نازک سے بدن پر کنوارپنے کا

نکھار تھا۔ سفید کفن میں اس کے سیاہ بالوں کی لہریے دار لٹیں کانپ کر اس کی زندگی کا یقین دلا رہی تھیں اور غزل سوچ رہی تھی، اس موہنی صورت کو لوگ کیسے مٹی میں ملا دیتے ہیں ۔؟

آخری دیدار کے لیے چاند کی میت جب "ایوانِ غزل" کے بڑے ہال میں رکھی گئی تو وہاں دیواروں پر فریم میں لگے ہوئے تمام شاعر سخت بے چین نظر آنے لگے ۔ جیسے عشق کا یہ انجام ان کی شاعری میں کبھی نہ آیا ہو۔

دو گھنٹے کے اندر اندر راشد چاند کو یوں دفنا کر آ گیا جیسے سارا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا ۔ اور رضیہ نے فنائل چھڑک کر چاند کا کمرہ خوب دھلوایا۔ اس کے تمام کپڑے، میک اپ کا سامان، دائمن اور فوٹوز کا البم نکال کر کباڑیے کو دے دیا گیا ــــ اس سامان سے سارا گھر یوں ناک پر کپڑا رکھ کر بچتا پھرا جیسے چاند طاعون کی چوہیا تھی۔

کرانتی کو غزل نے اپنے کمرے میں لا کر چھپا دیا۔

چاند کے سوئم کے دن جب گھر مہمان بیبیوں سے بھرا ہوا تھا، راشد نے احمد حسین کا خط لا کر سنایا ۔ قیصر نے گاؤں کے کئی جاگیرداروں کو قتل کر دیا تھا اس نے احمد حسین کی دولت اور ڈیوڑھی کی بھی نشان دہی کی تھی ۔ اس لیے وہ سب جان بچا کر اورنگ آباد آ گئے ہیں۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی نصیر کی منگنی کی رسم ہو گی۔ جس میں حیدرآباد سے سب کو آنا پڑے گا۔

"حرام زادی ــــ چڑیل ــــ" رضیہ نے دانت کٹکٹا کے کہا

"ہائے کیسی ہاتھوں سے نکل گئی ۔" لنگڑی پھوپو نے ہاتھ مل کر کہا

"ارے وہ تو خود کہہ رہی تھی کہ میں گرفتار ہونے والی ہوں۔"

"اچھا تو کیا چچی جان راضی ہو گئیں۔ غزل سے رسم کر لے پر ۔" فوزیہ نے پوچھا

"ہاں مگر رسم ان کی بھانجی نفیس سے ہونے والی ہے۔"

راشد نے خط تہہ کرتے ہوئے کہا

ابھی خط رکھ کر راشد باہر گیا تھا کہ خبر آئی اورنگ آباد میں انڈین یونین کی فوجیں داخل ہوگئی ہیں اور بڑی ہولناک تباہی آگئی ہے۔

اب کسی سے ضبط نہ ہو سکا — لنگڑی پھوپو تو چھاتی پیٹ کر چلانے لگیں —— "ہائے میرا بھائی — ارے کیسا شاندار محل تھا۔ ہائے میں لٹ گئی لوگو ——"

اور ان کی آواز میں آواز ملا کر بی بی، رضیہ، غزل اور فوزیہ بھی رو رہی تھیں۔ غزل تو غم کے مارے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ واحد حسین تکیے پر جھکے سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھے تھے۔

شام تک ان کا بلڈ پریشر دو سو سے اوپر تھا اور ان کی ہچکیاں کسی طرح نہ تھمتی تھیں۔ ڈاکٹر پریشان تھے۔ راشد بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ سارا گھر انھیں تسلی دے رہا تھا اور سب کہہ رہے تھے کہ یہ خبر انھیں کیوں سنائی!

پھر راشد ان کے پاس آبیٹھا اور ادھر ادھر کی باتوں سے دل بہلانے لگا۔

"ذرا آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے تو میں اورنگ آباد ہو آؤں۔ آپ مجھے سب تفصیل بتائیے کہ چچا جان کی جائیداد کہاں کہاں تھی اور کتنی ہے —— ڈیوڑھی میں کتنی مالیت کا سامان تھا۔ جو بھی سامان بچا ہو وہ ذرا امن ہو جائے، تو حیدرآباد لے آؤں گا۔"

واحد حسین کی ہچکیاں تھم گئیں اور انھوں نے گردن اٹھا کے راشد کو دیکھا۔

"چچا جان کی جائیداد تو بہت ہے۔ لیکن سنا ہے قیصر نے کسانوں کو بڑا سرکش بنا دیا ہے۔ مجھ سے تو یہ جھگڑے نہیں سنبھلیں گے۔ آپ

ہی انھیں ٹھیک کر سکیں گے۔"

واحد حسین نے سرہانے سے رومال ٹٹول کر آنکھیں پونچھیں اور راشد کا ہاتھ تھام کر بولے۔

"احمد میاں کی جائیداد کا کام اب تمھیں کرنا ہے۔" اور پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"ان کی تو لاکھوں کی جائیداد ہے۔ اجالا بیگم کے پاس ہزاروں روپے کے جواہرات تھے۔ امین گڑھ کی زمین اور دولت آباد کے باغات —"

پھر وہ خود اٹھ کر الماری میں سے پرانے کاغذات نکال لائے اور راشد بہت آہستہ سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

شام تک واحد حسین کا پریشر نارمل ہو چکا تھا۔

"ارے کم بختو — کسی نے میرے بھائی کی روح کو دو پیسے کی مٹھائی کا ثواب نہ پہنچایا۔" وہ گھر والوں پر بگڑنے لگے اور خود قرآن شریف لے کر بیٹھ گئے۔

"اللہ رکھے کیا ان کے وارث نہیں ہیں — خوب دھوم سے فاتحہ کراؤں گی۔" رضیہ نے بڑی شان سے کہا۔

ان کاموں سے نبٹ کر راشد کو کرانتی یاد آئی۔

وہ کتیا —— حرامی اولاد —— اسے ابھی گھر سے نکالو — ورنہ کہیں حکومت کو خبر ہو گئی تو سب کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔

سب نے اسے ڈھونڈا —— دیکھا تو بی بی کرانتی کو سینے سے لگائے بیٹھی رو رہی تھیں جیسے وہی چاند کی یادگار ہو — لیکن رضیہ نے جلدی سے کرانتی کو بی بی کی گود سے لے کر کریم کو دیا کہ اس چھوکری کو کہیں پھینک آؤ —

غزل رو پڑی۔ جیسے آج پھر چاند کا جنازہ اٹھ رہا ہو۔

اس نے مڑ کے دیکھا۔ بی بی ہونٹ بند کیے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ غزل کو غصہ آنے لگا۔ آخر بی بی کب تک چپ رہیں گی! وہ راشد اور رضیہ کو کیوں نہیں ڈانٹتیں۔ وہ کب تک اس گھر میں اجنبی بنی رہیں گی۔

پھر وہ گیٹ کی طرف بھاگی ــــــ کرانتی سڑک پر کھڑی رو رہی تھی۔ ــــ اس نے جلدی سے کرانتی کو گود میں اُٹھا لیا ــــ کچھ دیر کے بعد وہ رنگما کی جھونپڑی میں گئی۔

"یہ میری بچی ہے۔ اسے تم اپنے پاس رکھ لو۔ میں تھوڑے دنوں بعد آکر لے جاؤں گی۔"

"تمہاری بچی ہے ــــ؟" رنگمّا نے تعجب سے پوچھا ــ رنگما ان کے ہاں کی کماٹن تھی۔ اس لیے وہ غزل کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔

"مگر میں اسے کیا کھلاؤں گی بی بی ــــ یہ تو دودھ پیتی ہوگی۔"

"اس کا انتظام میں کر دوں گی۔ تم فکر مت کرو ــ" وہ جلدی سے بچی کو وہاں بٹھا کر گھر کی طرف آئی۔

باہر ملیشم راشد کی خوشامد کر رہا تھا ــــــ" رات بھر کے لیے میری بیوی اور بہن کو اپنے ہاں رکھ لو۔ ہماری جانوں کو خطرہ ہے۔"

"میں ابا جان سے پوچھوں گا۔" راشد نے سرد مہری سے کہا۔

"ہمارے گھر پر ہی کہیں غنڈے چڑھائی نہ کر دیں۔"

پھر اچانک ریڈیو ایک سسکی لے کر خاموش ہو گیا۔

جنگ کی شعلہ پوش خبروں کے بیچ میں یہ دھاکہ گونجنے لگا کہ انڈین یونین کی فوجیں آرہی ہیں۔

اور سارا حیدرآباد خوف سے لرزنے لگا۔

میرا بھائی ــــ میرا بیٹا ــــ میرا شوہر ــــ

ہر گھر سے چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ عورتیں اپنی چھتوں پر کھڑی ان

ننھے سپاہیوں کو پکار رہی تھیں، جو بندوقیں تھامنا نہیں جانتے تھے، مگر چند مفاد پرستوں نے ان کے ہاتھ میں جذبات کی لاٹھی تھما دی تھی۔ ہزاروں نوجوانوں کی لاشیں پیڑوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ چٹانوں پر بکھری پڑی تھیں۔ ندیوں میں تیر رہی تھیں۔ ان کی کھلی ہوئی ساکت آنکھیں پوچھ رہی تھیں ــ" ہم کس کے لیے لڑے ــ؟"

ہوٹل اور بازار سنسان پڑے تھے۔ دکن ریڈیو رک رک کر پوچھ رہا تھا ــــــ یہ کیسا انیائے دا"ا ــــــ"

رضیہ نے چھت کے اوپر چڑھ کر دیکھا ــــــ سارے شہر میں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا ــــ پھر سامنے خادم علی بیگ کے بنگلے پر ایک ٹرک آکر رکا اور اس میں گھر کا قیمتی سامان رکھا جانے لگا۔

لوگ کہہ رہے تھے کہ خادم علی بیگ نے بمبئی سے ایک ڈکوٹا طیارہ حاصل کر لیا تھا جو انھیں حفاظت کے ساتھ پاکستان لے جائے گا۔

یہ وہی خادم علی بیگ تھے جنھوں نے اتحاد المسلمین کے جلسوں میں قوم کو اپنا آخری قطرۂ خون بہانے کی تعلیم دی تھی۔ ماؤں اور بیویوں سے آگے گڑگڑائے تھے کہ مادرِ وطن اُن سے قربانی چاہتی ہے۔

"آج آپ سب لوگ ہمارے ہاں آجایئے۔" اپنی چھت پر سے ملیشم نے رضیہ سے کہا

"ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے بھابی۔ ہم تو آپ کے پڑوس میں ہیں ــــ" رضیہ آنسو پونچھتی ہوئی نیچے اتر آئی۔ شکر ہے آج کل شاہین لندن میں تھا۔ مگر جوان فوزیہ کی وجہ سے رضیہ کے ہوش و حواس غائب تھے۔

"سنا ہے گھروں کی خانہ تلاشی بھی ہوگی ــ" راشد سارے گھر میں گھبرایا ہوا پھر رہا تھا۔

"ہائے ہائے سو برس کی خود مختاری آج ختم ہوگئی۔" لنگڑی پھوپو یوں ماتم کر رہی تھیں۔ جیسے آج ان کے سر سے تاج اتر گیا۔

کوئی ان سے پوچھے کہ اس خود مختاری میں انھوں نے کتنے عیش کیے

غزل نے سوچا —— وہ بار بار یاد کرتی کہ ایاز اس وقت کہاں ہوگا —— اسے پکا یقین تھا کہ اتنی کم عمری میں ایاز نہیں مر سکتا۔ وہ یقیناً کسی پہاڑی میں چھپ گیا ہوگا یا پھر کسی کیمپ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ہوگا —— ممکن ہے کسی ہسپتال میں ہو —— یا پھر —— اور —— یا ——

اور پھر وہ خود ہی رونے لگتی۔ آج کل آنسوؤں کی اتنی فراوانی تھی کہ کوئی کسی کو تسلی دینے نہیں بیٹھتا تھا۔ لنگڑی پھوپو شیخو بھائی کے لیے رو رہی تھیں۔ رضیہ اپنے بھائیوں کے لیے۔ سنا ہے فوزیہ کا ہونے والا دولہا بھی کسی محاذ پر گیا تھا۔

اب رہا راشد —— اس کا پریشانی کے مارے برا حال تھا۔ جیسے آج اسی کے سر سے تاج اتر رہا تھا —— اب جانے کیا ہوگا —— اور پھر ہرلش چندر —— بھاون —— بلیشم —— اور بروا —— پتہ نہیں کون کون اس کی گھات میں بیٹھے ہیں۔ یہ سب وہ حقیر کیڑے تھے جنھیں وہ پیروں تلے روند دیا کرتا تھا۔ مگر آج خوفناک اژدھوں کی طرح اس کے سامنے آکھڑے ہوئے تھے —— ایسے میں اسے کیا کرنا چاہیے ——؟ ندرت جنگ کے پوتے اور واحد حسین کے لڑکے کے لیے کیا مناسب ہے —— خودکشی —— یا کتے کی موت —؟

وہ پاگلوں کی طرح سر تھامے سوچ رہا تھا۔

"کیا شیخو میاں نے کوئی اطلاع بھیجی —— وہ میرے بیٹے کو بھی لے گئے تھے۔" باہر کوئی عورت پوچھ رہی تھی۔

"اماں کہہ رہی ہیں ابا کو کس پتے پر خط لکھا جائے؟" ایک چھوٹی

سی لڑکی دروازے میں کھڑی راشد سے پوچھ رہی تھی۔

کس پتے پر ——؟ وہ کیا جواب دے! یہ عورتیں کس قدر رجائی ہوتی ہیں! جانتی ہیں کہ ان کے شوہر بادل کی طرح فضاؤں میں بکھر چکے ہیں۔ لیکن خط بھیجنے کی آس نہیں توڑتیں اور پھر بہت سوچ سمجھ کر راشد پھولوں کے ہار لے کر سکندرآباد دوڑا —— یونین کی فوجوں کا استقبال کرنے —— اور وہاں جانے سے پہلے اس نے عالی جناب جے۔ این چودھری دام ظلکم کے نام ایک درخواست لکھی جس میں نظام کے عہد میں بزنس کرنے والوں کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ان سے جبراً اتحاد المسلمین میں شرکت کروانے کا حوالہ دے کر موجودہ دور میں انصاف کرنے کی درخاست کی گئی تھی ——

شام کو وہ تھکا ہارا پسینے میں شرابور گھر لوٹا تو اعلیٰ حضرت ریڈیو سے تقریر کر رہے تھے —— انھوں نے حیدرآباد کے الحاق کی اطلاع دی اور عوام کو صبر و شکر کے ساتھ نئے حالات سے سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا۔

اعلیٰ حضرت کی آواز پہلی بار "ایوان غزل" میں گونج رہی تھی۔ حیدرآباد کے گلی کوچوں میں سنائی دے رہی تھی۔ لوگ چلتے چلتے رک گئے تھے۔ واحد حسین سر جھکائے مؤدب بنے کھڑے تھے اور سارے گھر کے ساتھ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

مگر آج جب دکن ریڈیو خاموش ہوا تو ایم۔ اے رؤف نے تاابد اس ریاست کو قائم رکھنے کی دعا مانگی اور نہ عثمان علی خاں کی بصد اجلال سلامتی کے لیے اللہ میاں سے کچھ کہا

صبح ہوئی تو گھر میں احمد حسین، اجالا بیگم اور نصیر کے "دسویں" کی فاتحہ کرائی گئی —— یہ تو ٹھیک سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ سب کب اور کہاں مرے۔ مگر واحد حسین کسی بات میں کمی کرنے کو تیار نہ تھے۔

آج غزل صبح سے رو رو کر دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ نصیر اس سے شادی نہیں کرے گا اب۔ مگر اس کے باوجود نصیر کی موت اسے کسی بھی طرح منظور نہ تھی

"میا بھائی، دل کا بادشاہ تھا، اس کے ہاں ہر کام شاندار ہوتا تھا۔" لنگڑی پھپھو آنسو پونچھ کر باورچیوں سے نبٹ رہی تھیں۔ پانچ سو لوگوں کا کھانا تھا آج۔ آخر احمد حسین اتنی جائداد چھوڑ گئے، تو ان کی موت بھی دھوم دھام سے ہونا چاہیے۔

غزل نے سوچ لیا آج کی رات وہ بھی زہر کھا کے ختم ہو جائے گی

"ہائے میری اجالا بھابی، میں تجھے اپنے ہاتھ سے کفن بھی نہ پہنا سکی۔" لنگڑی پھپھو نے نوحے کا پہلا بول اٹھایا اور رشتے دار عورتوں میں ٹپس پڑ گئی۔

"اے ظالم نامراداں! ہم پر کیسا ظلم توڑ گئے، ہائے ہائے لاکھ کا گھر خاک ہوا۔"
لنگڑی پھپھو سینہ کوٹ رہی تھیں اور ان کے ساتھ فوزیہ، بی بی اور رضیہ دھاڑیں مار کے رو رہی تھیں۔

اندر غزل چپ چاپ لیٹی تھی، نصیر سے اب اس کی شادی نہیں ہو گی مگر پھر بھی وہ ساری زندگی نصیر کی یاد میں گزارنے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن کسے معلوم تھا کہ اتنی جلدی آج ہی وہ نصیر کا زوال کرے گی۔

وہ باہر کی کھڑکی کھول کر دور نگما کی جھونپڑی کے پاس کھیلنے والی کرائی کو دیکھنے لگی۔ آج کل سڑکیں سنسان تھیں، ہر گھر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں، غزل کو بعض وقت ایسا لگتا جیسے وہ ایک طویل بھیانک خواب دیکھ رہی ہو، ابھی آنکھ کھلے گی تو یوں ہی چاند آپا سیاہ جارجٹ کی ساری میں قیامت ڈھاتی، دامن پہ اپنی سفید انگلیاں رکھے گنگنا رہی ہوں گی۔

شمع جلتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

اماں ناک نہ صاف کرنے پہ اس کی پیٹھ پہ ایک گھونسہ ماریں گی اور وہ اپنی ننھی سی بھبیا ادیر گھسا کر فوزیہ سے پوچھے گی۔

"تم اتنا کیوں ہنستی ہو۔"

پھر کسی نے اس کے کمرے کا دروازہ پیٹنا شروع کیا۔

"اری غزل، غضب ہو گیا، باہر تو آ —" فوزیہ بدحواسی میں اندر آ کر غزل پر گر پڑی۔

پھر دونوں باہر دالان میں آئیں

راشد ماموں بے ہوش پڑے تھے، بی بی ان پر پانی چھڑک رہی تھیں، رضیہ دیوار سے لگی ساکت ہو چکی تھی اور لنگڑی پھپھو پھیرنی کے کٹوروں پر چاندی کے ورق لگاتی ہوئی ایک خط کو دیوانہ وار چومے جا رہی تھیں، باہر کوئی چلا رہا تھا،

"ذرا واحد نواب کے لیے ٹھنڈا پانی بھجوا دیجیے اور ڈاکٹر صاحب سے فون پر کہیے کہ واحد نواب کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔"

اور مہمان بیبیاں یوں ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھیں جیسے کسی سحر نے انہیں پتھر کر دیا ہو۔

"کیا ہوا بی بی۔" غزل ڈر کے مارے بی بی سے لپٹ گئی، بی بی نے غور سے غزل کو دیکھا اور وہ بھی اس سے چمٹ گئیں۔

پھر انہوں نے لنگڑی پھپھو سے وہ خط چھین کر غزل کو تھما دیا۔

برادرم محترم دام بالاحترام —!

بعد قدم بوسی کے عرض ہے کہ ہم سب خدا کے فضل سے بخیریت کرآپ کی خیریت نیک مطلوب،

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ کی دعاؤں سے ہم سب اورنگ آباد میں بالکل محفوظ ہیں، غنڈوں کی چڑھائی کی بھن گن پا کر میں گھر کا قیمتی اثاثہ یہاں لے آیا تھا۔ اور اب آج ہی شام میں معہ والدہ انجہانی اور نصیر نواب سلمۂ بذریعہ طیارہ پاکستان جارہے ہیں، جائیداد کا تصفیہ حالات پرسکون ہونے پر کردیا جائے گا۔ آپ سے دور ہو جانے کا از حد قلق ہے لیکن اللہ کا شکر ہے ہم دل سے دور نہیں ہوئے۔ جناب بھاوج صاحبہ کی خدمت میں قدم بوسی اور تمام خورد و کلاں کو دعا مطالعہ فرمادیں۔ جملہ تمام کی خیریت معلوم کرو،

فقط

احقر

نواب احمد حسین خاں عفی عنہ،

خط پڑھ کر غزل نے نظریں اٹھائیں تو چاندی کے ورق پھولوں کی طرح چاروں طرف اڑ رہے تھے ۔۔۔ وہ جلدی سے کمرے میں گئی اور جانماز بچھا کے سجدے میں

گر پڑی، اس نے دونوں بانہیں پھیلا کے یوں زمین کو تھام لیا جیسے نصیر کی بانہوں میں سمٹ آئی ہوں، آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے اس نے دیکھا کہ نصیر ہوائی جہاز کے دروازے پر کھڑا تھا۔۔۔ وہ ہر لمحہ اس سے دور ہٹ رہا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں غزل کے دل میں سکون کا ایک چراغ جلنے لگا، کیونکہ نصیر کی وہ انگوٹھی اس کی انگلی میں تھی جس میں اس کی جان ہے، اس سے پہلے بھی اس کی زندگی میں کئی مرد آئے تھے مگر نصیر کی طرح دل کی دھڑکن کوئی نہیں بنا۔ وہ تو چار دن کے بعد ہر صورت بھول جاتی تھی، اپنی ہنسی میں خود اپنے وعدے بھلا بیٹھتی مگر نصیر کی یاد کنول کی طرح کبھی نہ ڈوبتی تھی، حالاں کہ اس سے ملنے کی ہر آس ٹوٹتی جارہی تھی۔

پھر واحد حسین کو دیکھنے والا ڈاکٹر راشد کی نبض دیکھنے لگا، لیکن اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ دوا نہیں پئے گا جیسے وہ اب جینے سے مایوس ہوچکا ہے، اسے ایک ہی رٹ لگی تھی کہ شاہین کو امریکہ سے جلد بلانا چاہیے، پھر اس نے رضیہ سے کہا:

"ہمیں بھی اپنا روپیہ پاکستان منتقل کردینا چاہیے، کیا پتہ حالات کیسے ہوجائیں شاہین واپس آجائے تو ہر بات کا فیصلہ کرنا ہوگا۔"

راشد ابھی بستر پر ہی لیٹا تھا کہ واحد حسین کو رات میں پھر ہارٹ اٹیک ہوا۔۔۔ یہ دوسرا اٹیک تھا۔ راشد نے ڈاکٹر کا پورا بورڈ بٹھایا خوش خبریوں اور امیدوں کے سیکڑوں انجکشن لگاتے مگر شام ہوتے ہوتے ان گیارہ بیاضوں کے اشعار دھندلے پڑنے لگے، جن میں واحد حسین کی زندگی، عشق و ہوس میں ڈوبی جھومتی گاتی شاعری بند تھی ۔۔۔ وہ اتنی خاموشی سے مر گئے کہ راشد کو یقین نہ آیا۔۔۔ ڈاکٹر آکسیجن کی نلی نکال کر سامان سمیٹنے لگا مگر راشد ابھی تک ان پر جھکا دل کی دھڑکن گن رہا تھا، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ آدمی مرجائے جس نے زندگی کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا تھا، اس کا تو زندگی سے جی کبھی نہیں بھرتا تھا، اس نے پھولوں کو ہنسنا سکھایا تھا، پودوں کو جھومنا ۔۔۔ وہ زندگی بھر اپنی ذات میں کھویا رہا، اپنے

آس پاس محبت کے پودے اُگاتا رہا ——— وہ جو ایک فرد نہ تھا "ایوانِ غزل" کا نگہبان تھا ——— ایک تہذیب ——— ایک ایسے دور کو اپنے ساتھ سمیٹ لے گیا جس کی کہانیاں "ایوانِ غزل" میں سنائی جائیں گی، وہ دور جو آج ختم ہو رہا تھا، اپنا فرض ادا کر چکا تھا ——— سارے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا، نوکر اور مامائیں اپنی وفاداری جتلانے کے لیے سب سے زیادہ چلا رہے تھے،

بی بی عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں جو انہوں نے واحد حسین کے کمرے سے راشد اور فوزیہ کی چیخیں سنیں۔ غزل لپک کر ان کے پاس پہنچی کہ انہیں سہارا دے مگر بی بی نے بڑے اطمینان کے ساتھ جانماز تہہ کر کے اور آہستہ آہستہ روتے ہوئے لوگوں کو ہٹا کر واحد حسین کے سرہانے آئیں ———

سب دم بخود تھے، چالیس برس کا ساتھ تھا، جانے بی بی آج کتنا روئیں گی۔

مگر انہوں نے مڑ کے نہایت اطمینان سے راشد کو تھاما۔

"کیوں روتا ہے تو ——— وہ نہیں مریں گے ——— وہ مجھے نہیں چھوڑ سکتے۔"

اور چپ چاپ دیوار سے لگ کر بیٹھ گئیں۔

صبح تک انہیں رُلانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، مگر جب انہوں نے اپنے ہاتھ دیکھے تو اچانک رونے لگیں۔

"میرے ہاتھ خالی ہو گئے ——— میں اب یہاں سے بھاگ جاؤں گی میری رسی ٹوٹ گئی ہے"

اس کے بعد وہ بستر سے نہیں اٹھیں نہ کوئی بات کی۔

کسی نے کہا،

"پاگل ہیں۔"

کسی ڈاکٹر نے بتایا:

"برین ہیمرج" ہے

دن گزرتے رہے ——— ایک ہفتہ ——— دو ہفتے ——— دو مہینے ——— بی بی مرتی نہ تھیں ——— زندہ بھی نہ تھیں ——— زندگی اور موت کے درمیان ایک سانس کا ڈورا باقی تھا ——— کوئی کہاں تک ڈاکٹروں کو بلائے ——— کتنی آکسیجن دے ——— کب تک نلیوں سے غذا پہنچائے ———!

گھر میں ان پے در پے حادثوں کی خبر سن کر شاہین واپس آ گیا۔ بڑی بھاری بھاری ڈاکٹری کی ڈگریاں لیے ——— ایک دم چھ فٹ کا ایسا نوجوان بن چکا تھا کہ رضیہ اسے دیکھ کر گھبرائی جا رہی تھی۔

شاہین نے بی بی کو الٹ پلٹ کر دیکھا ——— وہ چار سال تک امریکہ میں انسانی دل پر تجربے کرتا رہا تھا ——— اس نے سیکڑوں انسانوں کے دل چیر کے دیکھے تھے ——— مگر اپنی دادی کا کیس اسے عجیب سا لگا، اسے پریشان دیکھ کر اسگری پھوپو لاٹھی ٹیکتی پاس آ کھڑی ہوئیں،

"بیٹا یہ کوئی نیا مرض تھوڑی ہے، یہ عورت تو ہمیشہ ہی آنکھیں بند کیے جیے گئی۔"

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب شاہین نے راشد کو یقین دلا دیا کہ اب بی بی زندہ نہیں ہیں ——— غالباً رات سوتے ہی میں کسی وقت انتقال ہو گیا تھا ———!

اب تو "ایوانِ غزل" والے جیسے قبر میں۔ مردے کو پہنچانے کے ماہر ہو چکے تھے۔ ظہر کی نماز تک بی بی کا وجود "ایوانِ غزل" سے ہٹ چکا تھا ——— اور "ایوانِ غزل" کے مرکزی ہال میں لگی ہوئی واحد حسین کی بڑی سی تصویر آنکھیں کھولے یہ بات کسی طرح ماننے کو

تیار نہ تھی۔

بی بی کا جنازہ لے گئے تو غزل کو احساس ہوا کہ وہ کتنی بیکار رہی ہے ہمایوں نے حبیب سے سیا کو مسلمان کر کے اس سے نکاح کیا تھا اپنے گھر سے غزل کا قطع تعلق ہو چکا تھا، پھر بھی بی بی کی تدفین میں ہمایوں آیا تو زبردستی اسے گھر لے گیا،

آج تیسرا دن تھا اسٹیج پر "رام بن باس" کا

تین دن سے غزل روزانہ سب کے سامنے ایک گڑھے میں دفن ہوتی پھر اسٹیج کا پردہ کھینچ کر لوگ اسے باہر نکال لاتے اسے کچھ خبر نہ ہوتی۔ اسٹیج پر کیا بک رہی ہے، وہ تو بس اس بات کی منتظر رہتی تھی کہ وہ زمین میں سمانے والی اسی سمادھی سے آتے اور اسے کوئی باہر نہ نکالے، ایک ایسی دھرتی ماتا تھی جو اسے اپنی چھاتی میں بھی پناہ دینے کو تیار نہ تھی۔

لوگ اس کی اداکاری پر دیوانے ہوتے جا رہے تھے، تالیاں پیٹتے پیٹتے راشد کے ہاتھ دکھے جا رہے تھے۔

جیسے ہی حالات بدلے راشد نے بھی اپنا چولا بدل لیا تھا، اب شرنارتھیوں کی امداد کے لیے ہر سیاسی پارٹی نے لمبے چوڑے پروگرام بنائے، کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے بھی کئی امدادی اسکیمیں شروع ہوئیں، اس سلسلے میں کچھ کلچرل پروگرام بھی رکھے گئے ۔۔ مگر سرور کو کیا معلوم تھا کہ وہ سو روپے لگا کر جو "رام بن باس" اسٹیج کر رہے ہیں وہ ہزاروں روپے کھینچ لائے گا۔ سارا کمال تو غزل کا تھا جو سیتا کے کردار میں گم ہو گئی تھی۔ جب بڑی بے بسی سے وہ دھرتی کی گود میں سمانے کی دعا مانگتی تو سرور جیسا سخت مزاج

انسان بھی کانپ اٹھتا تھا، حالاں کہ اسے مذہبی کہانیوں، خصوصاً عورت کی مظلومی کی کہانیوں سے بڑی نفرت تھی، اس لیے جب ڈرامے کے سلسلے میں کوئی پہلی بار غزل کو لایا تھا تو اس کا جاگتا ہوا اپنے آپ سے باخبر حسن، بے باک لہجہ اور ہر ایک سے بے تکلفی کا انداز سرور کو ذرا اچھا نہ لگا تھا، اگرچہ خورشید آپا نے حسب عادت اسے بھی ایک اعلیٰ خاندان کی لڑکی ثابت کیا تھا۔ لیکن جب ایک بڑی بڑی موچھوں والے، دبلے پتلے شخص نے غزل کا باپ بن کر اس کی ایکٹنگ کا بھاؤ تاؤ کیا تو سرور کو یقین ہو گیا کہ وہ لڑکیاں سپلائی کرنے والا کوئی دلّال ہے، کہیں شریف باپ، بیٹیوں کے دام لگانے پھرتے ہیں! تیسرے دن جب آخری بار غزل زمین میں سمائی تو ڈرامے کا سارا کلائمکس غارت ہو گیا اور اس المناک سین پر رونے والے —— لوگ ہنسنے لگے جب غزل نے زمین سے منہ نکال کر چلانا شروع کیا،

"میرے اوپر اب پتھر برساؤ۔ اللہ کے لیے مجھے اب کوئی مت نکالنا۔ میرے اوپر مٹی پھینکو! مجھے سنگسار کر دو۔"

بڑی افراتفری میں پردہ گرایا گیا۔ رمیش سنہا جو اس ڈرامے کے ڈائرکٹر تھے دوڑے ہوئے آئے۔ سرور بھی اپنے دوستوں کے درمیان سے اٹھ کر اوپر ڈائس پر بھاگا۔

"مجھے مار ڈالو —— میرے اوپر پتھر رکھ دو، تم میں سے کوئی انسان ہے۔" گڑھے کے اندر سے غزل چلا رہی تھی،

"کیا بات ہے مجھے بتاؤ ——" سرور نے پسینے میں تر اور غزل کو ایک کرسی پر بٹھا کے پوچھا،

دو بجے رات کو جب سرور غزل کو اس کے گھر پہنچانے آیا تو بھابیوں کہیں گیا ہوا تھا، سایا نے بڑی بیزاری کے ساتھ دروازہ کھولا اور بڑبڑاتی ہوئی لیٹ گئی،

"لو اب یہ مرد راتوں کو بھی گھر آنے لگے"

غزل ہوش میں آ چکی تھی، مگر ابھی تک اس کی آنکھیں بند تھیں جسم بالکل ٹھنڈا تھا اور وہ سسکیوں کے مارے دہل رہی تھی، سرور کو رونے والی عورتوں سے بڑی چڑ تھی مگر اس وقت وہ غزل کی سسکیوں سے سخت پریشان تھا، گڑھے سے اسے نکالتے وقت اچانک اس نے محسوس کیا تھا کہ اس لڑکی میں کوئی خاص بات تھی۔ ایک بے نام سی کشش —— جو سات بجے سے رات کے دو بجے تک اسے غزل کے ساتھ لیے لیے پھر رہی تھی۔

"اب مجھے بتائیے —— اصل قصہ کیا ہے —— ؟" غزل کے ہاں آ کر کمرے میں بیٹھ گئے تو سرور نے سگریٹ سلگا کے پوچھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ لڑکی کہیں سے اغوا کر کے لائی گئی ہے اور وہ خوفناک موچھوں والا آدمی زبردستی اس سے پیشہ کروا رہا ہے۔

"قصہ کچھ نہیں ہے —— مجھے یہ بتائیے کہ زمین میں سمانے کا حق صرف سیتا ہی کو تھا۔ میں کیوں نہیں مر سکتی —— ؟"

"آپ کیوں مرنا چاہتی ہیں —— ؟" سرور نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔ "آپ ابھی بہت کم سن ہیں۔ ابھی آپ کی شادی ہوگی، بچے ہوں گے —— عورت تو غزل کا ایک مطلع ہے۔ اس پر پچاسوں اشعار لکھے جاتے ہیں، ہزار خوبصورت خیالوں کا اضافہ ہوتا ہے۔"

شاعری کے نام پر غزل کو نصیر یاد آ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میری شادی اب کبھی نہیں ہوگی۔ میں جب تک زندہ ہوں گی مجھے اسی طرح ہر روز قبر میں سونا پڑے گا۔"

"آپ کی فیس کے لیے اس دن جو صاحب جھگڑا کر رہے تھے وہ واقعی آپ کے ابا ہیں —— ؟" سرور نے سرگوشی میں پوچھا،

اور غزل بھی سوچنے لگی کہ کیا واقعی وہ اس کے آبا ہیں:

"آپ اتنی مایوس کیوں ہیں —؟" سرور نے غزل کی نشیلی آنکھوں کے سحر سے بچتے ہوئے کہا۔

اس نے اٹھ کر غزل کے آنسو اپنے رومال پونچھے۔

"بعض وقت انسان حالات کے ہاتھوں وہ کر بیٹھتا ہے جو کرنا نہیں چاہتا، مگر اب ایسا نہیں ہوگا، میں آپ کے لیے کچھ سوچوں گا، جب کبھی آپ کا دل چاہے مجھ سے آفس پر مل لیجیے گا۔"

وہ غزل کے سارے آنسو، سب سسکیاں اپنے رومال میں سمیٹ کر چلا گیا۔

پلنگ پر سونے لیٹی تو غزل نے سوچا — وہ بائیس[۲۲]، تئیس[۲۳] برس کا ہوگا، مگر اس کا انداز کیا ہے، جیسے وہ لمبائی کے قطب مینار پر کھڑا ہو اور غزل ننھی سی بچیوں کی طرح اس کے سامنے بیوقوف سی لگتی تھی، اتنی رات گئے اس نے ایک بار بھی تو غزل کے بے سدھ جسم کو نہ ٹٹولا۔ ایک بار بھی اس کے دہکتے ہوئے سرخ گالوں کو نہ چھوا، یہ کیسا انوکھا مرد تھا، غزل نے آج پہلی بار ایک اجنبی مرد ایسا دیکھا تھا جو اس کی جوانی کو بالکل ساشہ داموں کی طرح نظر انداز کر رہا تھا، حالاں کہ اسے تو دیکھتے ہی مرد اپنی عقل اور صبر دونوں کھو بیٹھتے تھے۔

اب جانے وہ کیا سوچنے والا ہے —؟ کیا کرنے والا ہے —؟

صبح وہ اٹھی تو حسب توقع ابا نے پہلے تو ڈرامہ غارت کرنے پر خوب ڈانٹیں سنائیں اور پھر آفس جاتے جاتے حکم دیا،

"کل میں نے خورشید آپا سے کہا ہے، وہ تیرے فلم اسٹار بننے کے لیے کچھ کریں گی، آج ان کے پاس ہو آنا۔"

چناں چہ اپنی اداسی کو میک اپ میں چھپا کے وہ خورشید آپا کے گھر گئی۔

خورشید آپا بھارت کلا منڈل کی روح رواں تھیں، عمر پچاس سے اوپر ہوگی، مگر ان کی شانِ لاپرواہی اور موٹاپا دیکھ کر عمر کی بھی ہمت نہ پڑتی کہ ان پر وار کرتی، وہ اپنے ڈائی کیے ہوئے بالوں کی لٹیں گالوں پر بکھرائے رکھتیں، سگریٹ پینے کی وجہ سے سیاہ ہونٹوں کو لپ اسٹک سے چمکائے رکھتیں، تیز نوکیلی پتلی بھوؤں کی کمانیں کھنچی ہوئی اور مصنوعی پلکوں کے تیر چاروں طرف شکار ڈھونڈتے ہوئے، ان کے بھاری بھرکم بدن پر بلاؤز صرف اتنی جگہ ڈھانپتا تھا کہ پولیس انہیں ننگی کا الزام لگا کر پکڑ نہ لے، ورنہ سب کچھ ہر ایک کے دیکھنے کے لیے کھلا پڑا رہتا۔ جوانی جانے کون سے دشت کی سیاہی میں لٹا چکی تھیں، جب دوڑتے ہوئے ہانپنے لگیں تو اپنے سے ایک دس برس کم عمر کے احمق کلرک سے بیاہ رچا لیا۔ لوگ اس واقعے کے بڑے دلچسپ لطیفے بنا کر سناتے تھے کہ کس طرح ایک دن اچانک خورشید آپا نے رکشا روک کر لطیف صاحب کو پکارا جو سائیکل پر آفس جا رہے تھے اور انہیں حکم دیا کہ فوراً مجھ سے نکاح کر لو —

بھرے بازار کا معاملہ تھا اور پھر خورشید آپا کی دھونس — بیچارے سیدھے بھاگے قاضی کی تلاش میں — اب ان لطیف صاحب کا صرف ایک کام تھا کہ خورشید آپا کے ہاں شام کو جمع ہونے والے دوستوں کے لیے، سگریٹ، شراب اور پان کا انتظام کر دیں اور جب خورشید آپا کو کہیں جانا ہوتا تو رکشا لا دیں — اس کے علاوہ اور کوئی کام کرتے لطیف صاحب کو کسی نے کبھی نہیں دیکھا تھا،

کبھی کسی ڈرامے میں ماں کا کردار ادا کرتے وقت انہیں رات ہو جاتی تو وہ اٹھتے وقت کہتیں۔

"ارے اجاڑ صورتو — تم کو ذرا تو شرم ہو، میرا مرد میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

تب یاد آتا کہ ہاں خورشید آپا تو "مرد والی" ہیں۔

اسٹیج کے علاوہ ریڈیو ڈراموں میں بھی لڑاکا ساس اور ماں کا کردار اس خوبی سے کرتیں کہ لوگ ہنستے ہنستے لوٹ جاتے، لیکن ریڈیو ڈراموں میں بڑے جھٹکے کے ساتھ کام کرتیں۔ کیا مجال کہ ریہرسل کے وقت کوئی ڈائرکٹر کا بچہ چوں بول جائے، انگلیوں سے اس کا سر مونڈھ کر رکھ دیتیں، ایسی فحش گالیوں کی بوچھاڑ کرتیں کہ ڈھیٹ سے ڈھیٹ مرد بھی شرما جائیں، یوں بھی خورشید آپا کو اداکاری کوئی کیا کھا کر سکھائے گا! بڑے بڑے بوجھ بجھکڑ ان کے سامنے جھک مارتے تھے۔ اچھے اچھوں کو چٹکیوں میں اڑاتیں۔ ایک دن دیکھئے تو ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی ہیں، لوگ سوچتے آج جانے کون سا زعفران کا کھیت دیکھ آئی ہیں — مگر معلوم ہوتا ابھی بہن کے انتقال کا ٹیلی گرام ملا ہے، اس غم کو چھپا رہی ہیں — یہ سن کر خورشید آپا کا احترام اور بڑھ جاتا۔

ان کا بہت بڑا اور بے حد خوب صورت سجا بنا گھر دراصل ایک چھوٹا سا کلب تھا، ہر شام اونچے طبقے کے آرٹسٹ نما لوگ اور ان سے دلچسپی رکھنے والے بے فکرے یہاں جمع ہوتے تھے، جس کا جی چاہے شراب پئے، رنڈیاں نچائے، قتل کر دے یا قتل ہو جائے، وہ کسی کو نہ روکتیں البتہ روتی صورتیں انہیں ذرا نہ بھاتیں — سچ مچ کان پکڑ کے نکال دیتی تھیں، محبت کرنے والوں کے لیے سہولتیں فراہم کرنے کا تو انہوں نے ٹھیکہ لے رکھا تھا، کوئی کتنا ہی اجنبی ہو مگر محبت کے نام پر وہ اس کی ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہو جاتیں، وہ کہتی تھیں کہ عورت کا پڑھایا ہوا نکاح قانون نہیں مانتا ورنہ بہت سے لوگ ان کے سامنے روتی صورتیں لیے نہ پھرتے۔

ویسے راوی کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک قاضی کو مستقل ملازم رکھا

تھا جو حیدر آباد کی ہر بھاگی ہوئی لڑکی کا نکاح ان کے ہاں پڑھاتا تھا۔ ویسے خورشید آپا نکاح وکاح کی قائل نہیں تھیں اور انہیں عمر بھر کے لیے گلے پڑنے والی عورتوں سے بڑی وحشت ہوتی تھی، محبت کرنے والوں کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کرتے دیکھ کر بلگرامی کہتا تھا کہ خورشید آپا تو اچھی خاصی "حکیم اجمل خاں" ہیں۔ جہاں دو ہزار کے کشتے سے کام نہ بنے، وہاں دو پیسے کا چٹکلا بھی آزماتیں علاج کے بارے میں انہوں نے کبھی تعصب سے کام نہیں لیا، یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کسی شامت کے مارے پولیس والے نے ان کے مکان پر بدکاری کا الزام لگاتے ہوئے انہیں گھیرنا چاہا تو خورشید آپا نے فوراً اسے کہیں نہ کہیں پھنسوا دیا! اس طرح کہ چند دن بعد وہ خود بھی ان زندہ دلوں میں بیٹھا خورشید آپا کی خوشامد کرتا نظر آتا، کوئی مذاق تھا خورشید آپا کو چھیڑنا—!

یہ سارے اونچی ناک والے آفیسرس اور کاروں میں گھومنے والے اکڑتے ہوئے بزنس مین انہیں دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے مگر وہ گالی کے بغیر کسی سے بات نہ کرتیں، جدھر سے گزرتیں، ہنسی کے پھول بکھر جاتے

غزل ان کے پاس بڑا اچھا موڈ طاری کر کے گئی تھی، مگر جاتے ہی خورشید آپا نے وہ نقاب نوچ پھینکا، انہیں کس لڑکی کے کس اسکینڈل کی خبر نہ تھی کہ بھان اور بلگرامی والی بات چھپی رہتی۔

"اب خیریت اسی میں ہے کہ تم بمبئی جا کر کسی فلم کے لیے کام ڈھونڈو ورنہ یہ مردوے تمہیں دو کوڑی کا کر کے چھوڑیں گے۔"

"مگر میں کیسے جاؤں گی وہاں —؟" غزل ہونق بنی

"میں بھجوا دوں گی۔" انہوں نے بڑے اطمینان سے پان کی ایک گلوری منہ میں رکھ کر کہا۔

غزل چپ ہو گئی — خورشید آپا سے زیادہ باتیں کرنے کی ہمت نہ تھی،

وہ یہاں تک کو بچہ کہہ دیتیں اور بچہ ثابت کر کے رہتی تھیں، پھر آگے کی بات بھی انہوں نے خود ہی سنائی،

"وہ اپنا بچہ راجہ شیوراج ہے نا! وہ تم پر مکھی کی طرح مرتا ہے، کئی بار میرے پاس آیا مگر تم بلگرامی کے چکر میں پھنسی ہوئی تھیں۔"

غزل جھینپ گئی، خورشید آپا بات کریں تو بات کے سارے کپڑے نوچ پھینکتی تھیں، انہیں شاعری کرنے سے بڑی چڑ تھی۔

"تو شیوراج کا بمبئی میں بڑا اثر و رسوخ ہے، اس نے کئی لاکھ روپیہ فلمی بزنس میں لگا رکھا ہے، تم چند دن اس کے ساتھ رہ لو تو شاید کوئی چانس مل ہی جائے گا۔"

"چند دن رہ لوں ۔۔؟" غزل نے تعجب سے پوچھا

خورشید آپا کے لیے کسی مرد کے ساتھ چند دن رہنا کوئی اہم بات نہیں تھی اور وہ بھی غزل جیسی لڑکی کے لیے جس کے بارے میں وہ سب کچھ جانتی تھیں ۔!

"اور کیا جی، گو کھاؤ تو ہاتھی کا کہ پیٹ تو بھرے، ادھر ادھر دھکے کھانے سے اچھا ہے فلمی ہیروئن بن جاؤ، تمہارا چہرہ تو بہت اچھا ہے۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔۔؟" غزل کا جی چاہا کہ خورشید آپا کو خوب کھری کھری سنا دے، کیا انہوں نے اُسے بالکل ہی طوائف سمجھ رکھا ہے کہ جہاں جی چاہے چلی جائے۔

غزل نے شیوراج کی صورت یاد کی، اکثر ڈرامے ختم ہونے کے بعد وہ بھی پھولوں کا ہار لے کر اسٹیج پر آتا تھا۔

وہ کسی بہت بڑے آفس کا ڈائرکٹر تھا اور بہت بڑی جائداد کا مالک، وہ آتا تو لوگ راجہ صاحب راجہ صاحب کہہ کر کھڑے ہو جاتے تھے، شہر میں جتنے کلچرل فنکشن ہوتے سب اسی کی صدارت میں، جب روپے کی کمی پڑتی سب اسی کی طرف

6/23

دوڑتے، علم و ادب کی سرپرستی اس کے خاندان کی روایت بن چکی تھی، ٹھگنے سے قد کا گول مٹول ۔۔۔ ہر وقت بچوں کی طرح مسکرانے والا بیوقوف سا آدمی چوڑی دار پاجامہ، ٹوئیڈ کی سیاہ شیروانی، مخمل کی ٹوپی اور کام دار سلیم شاہی جوتے پہنے، خوشبوؤں میں بسا ہوا، گھنے بالوں میں جانے کون سی خوشبودار کریم لگاتا تھا کہ غزل کی نظریں سب سے پہلے اس کے چمکیلے بالوں پر جاتی تھیں ۔۔ خواتین سے تعلقات بڑھانے اور ان کا احترام کرنے میں مشہور تھا۔ بڑے دھیمے سروں میں بے حد تہذیب کے ساتھ باتیں کرتا اور ہر ایک کی بات پر گردن ہلا کر "جی ہنہ"، "بجا ارشاد فرمایئے" کہہ جاتا تھا، اب عورتیں اس کے گرد نہ منڈلائیں تو کیا کرتیں، سنا ہے چاند پر اس نے ہزاروں خرچ ڈالے تھے اور کئی برسوں ساتھ رہا!

خورشید آپا کے گھر کے ہمایوں نے ہزاروں پھیرے کر ڈالے، آخر اس کی کوششیں کام آئیں اور غزل کے لاکھ انکار کرنے پر اور لفٹ نہ دینے کے باوجود شیوراج نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا ۔۔۔، وہ روز غزل کے ہاں آ دھمکتا، اس کے لیے تحفے لاتا، اسے پارٹیوں میں سینما کے لیے لے جانا چاہتا، جب غزل کسی بات پر تیار نہ ہوئی تو ایک دن اس نے ہمایوں سے کہا کہ وہ غزل کو بمبئی لے جائے گا، فلمی ہیروئین بنانے، اس نے ہر تاریخ کے لیے پلین میں سیٹیں بھی ریزرو کروا لیں، روتی پیٹتی اور ہمایوں کے لاتیں مکے کھاتی ہوئی غزل ایئر وڈ روم پہنچی تو بُری طرح کانپ رہی تھی بات ہمایوں نے "ایوانِ غزل" والوں سے پوری طرح چھپائی تھی کہ اچانک ایک دن غزل کا نام پردہ سیمیں پر میوزک کی جھنکار کے ساتھ دیکھ کر سب حیران رہ جائیں۔ جاتے وقت ہمایوں نے اسے ایک بار پھر راستے میں

خوش رہنے کی تلقین کی۔ پھر جب راجہ صاحب کے سکریٹری نے غزل کے سامان میں ہمایوں کا سامان چھانٹ چھانٹ کے الگ رکھ دیا تو ہمایوں ایروڈروم کے کینٹین میں جا گھسا۔

"راجہ صاحب کیا میرے لیے سیٹ ریزرو نہیں کروائی ہے؟"

"جی نہیں —" انھوں نے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کے بڑے اطمینان سے کہا۔

"پھر غزل کیسے جائے گی —؟"

"میں جو ہوں۔"

ہمایوں کو ذرا سی بھی عقل ہوتی تو یہ جواب سن کر چپ ہو جاتا آخر راجاؤں کے منہ لگنا ہنسی کھیل تھوڑی ہے۔ مگر غزل اور اس کی ماں کو گالیاں دیتے دیتے ہمایوں کی زبان پر دھار رکھ گئی تھی۔ ایک دم غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔

"میں غزل کو اکیلا نہیں بھیج سکتا۔ میں بھی چلوں گا۔"

یہ سن کر شیوراج نے بڑے اطمینان سے سکریٹری کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی اس سے انگریزی میں کچھ کہا۔ اور اخبار پڑھنے لگے۔ پھر ہوائی جہاز آنے کا اعلان ہوا۔ تو وہ کینٹین سے نکل کر باہر جانے لگے اور غزل ان کے پیچھے پیچھے لپکی۔

"راجہ صاحب — راجہ صاحب —" مگر وہ آناً فاناً پلین کی طرف بڑھ گئے۔ بعد میں نوکر نے بتایا کہ انھوں نے غزل کی سیٹ کینسل کروا دی تھی۔ یہ سن کر غزل وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک ہمایوں چپ چاپ کھڑا بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتا رہا۔ پھر اس نے غزل پر لاتوں اور گھونسوں کی بوچھار شروع کر دی بعد میں وہ روتی ہوئی غزل کو چھوڑ کے باہر آیا اور اپنا سامان ٹیکسی میں رکھوا کے گھر چلا گیا۔

تھوڑی دیر تک تو غزل کو درد کی شدت میں کچھ یاد نہ آیا۔ اس کے دانتوں سے خون بہہ رہا تھا اور گال سوجھ گئے تھے۔ اب وہ کینٹین کے کیبن میں اکیلی بیٹھی تھی۔ شیوراج کے ادھ جلے سگریٹ سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا اور ان کا پرس میز پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس جانے والے مسافروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ بیرے ادھر ادھر گھوم رہے تھے اور ایروڈروم کی جگمگاتی روشنیوں کی چکا چوند میں بغیر رات تیزی سے نیچے آ رہی تھی۔

غزل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے۔ —— اس نے شیوراج کا پرس کھولا۔ اس میں سو سو کے کئی نوٹ تھے۔ ہوائی جہاز کے ٹکٹ تھے۔ ٹیلی فون کے نمبر والی ایک چھوٹی سی ڈائری تھی اور ایک چیک — جلدی سے وہ بٹوا اس نے اپنے پرس میں رکھا اور لاؤنج کی طرف دوڑی۔

"کیا بمبئی کا ہوائی جہاز چلا گیا —؟"

"جی ہاں۔"

وہ پھر دھیرے دھیرے بڑے ہال کی ایک کرسی پر آ بیٹھی۔

ٹیکسی میں سامان رکھوانے کے بعد وہ بڑی دیر تک سڑکوں پر گھومتی رہی پھر اس نے سرور کے آفس کے پاس ٹیکسی رکوائی۔ مگر وہ آفس میں نہیں تھا البتہ اس کے کسی دوست نے سرور کا گھر بتایا جو سامنے ہی تھا۔

یہ سرور کا گھر تھا۔ ٹوٹا پھوٹا — پرانا دروازہ جس پر پھٹا ہوا ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا —— سامنے آنگن کی مدھم سی روشنی میں تین چار بچیاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔

آنکھ مچولی کڑوا تیل

راجہ رانی کا گھوڑا چھوٹا —!

اب اس گھر کے اندر جاؤں گی تو وہاں جانے کتنے بکھیڑے پھیلے ہوں گے۔ باہر سے چپ چاپ نظر آنے والے ہر گھر کے اندر کتنے آنسو چھپے ہوتے ہیں۔ کتنی سسکیاں۔ اب پھر ایک کہانی شروع ہو جائے گی۔ سرور کی مفلسی اور عشق کا ٹنٹا — اور ان قصوں سے اسے اب وحشت ہوتی تھی۔ اسی لیے نہ تو وہ شاعری سنتی۔ نہ ناول پڑھتی اسے تو وہ فلم بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ جس میں ہیرو ہیروئن کو عشق کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا — اس کے باوجود ہر ہر قدم پر اسے کوئی نہ کوئی مردود مل جاتا — اپنا دل ہتھیلی پر لیے — اس کے ساتھ غزل کو بھی مجبوراً رونا پڑتا۔

"سرور صاحب ہیں۔"

"جی ہاں —" ایک بچی نے بھاگتے ہوئے کہا۔ آنکھ مچولی۔

"ذرا انھیں بلائیے۔" غزل نے کھیلتی ہوئی لڑکیوں سے کہا۔

"انوں سور ہیں۔ آپ اندر جاؤ نا — بھئی چھوڑ دو۔ چھوڑ دو —"

اس نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ دو بھاگتی ہوئی لڑکیاں اس سے الجھ گئیں — چور — چور —

آنگن میں پہونچ کر وہ ٹھٹک گئی۔ پرانے زمانے کا کھپریل والا مکان تھا۔ بیچ میں آنگن اور دونوں طرف دالان۔ کوٹھریاں۔ دالان میں طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا۔ آنگن میں مرغیوں کا جھانبہ تھا۔ ایک ٹوٹے ہوئے جھلنگے پلنگ پر چھوٹا سا بچہ سو رہا تھا اور تمام گھر کو ایک پرانے بڑے آم کے پیڑ نے اپنے سائے میں چھپا رکھا تھا جو کچی کیریوں سے لدا ہوا تھا۔

اللہ — یہاں تو ایک دنیا آباد تھی۔ وہ سمجھی تھی سرور کنوارا ہے کسی کمرے میں اکیلا رہتا ہوگا۔

کون ہے —؟ ارے غزل — کیسے آ گئیں؟

ایک ادھیڑ عمر کے لمبے سے دبلے پتلے صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ تہمد باندھے، میلا بنیان پہنے وہ دری پر بیٹھے بچوں کو پڑھا رہے تھے۔

اب غزل اور گھبرائی۔ یوں آوارہ لڑکیاں کنوارے لڑکوں سے ملنے ایسے گھروں میں چلی آئیں تو قیامت آ جاتی ہے۔ پھر دھوئیں بھرے سیاہ کمرے سے ایک لمبی دبلی سی عورت بھی باہر آئی میلی ساری سے ہاتھ پونچھتی ہوئی۔ ننگے پاؤں

"کون ہو تم —؟ کس سے ملنے آئی ہو —؟ غزل کو یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سوال ہر طرف گونج رہا ہے۔ زمین سے آسمان سے۔ سارے گھر پر سایہ کرنے والے آم کے پیڑ سے۔ مرغیوں کے ڈربے سے۔

طوطے کے پنجرے سے۔

"ارے یہ غزل ہیں بھئی — رضیہ آپا کی نند کی لڑکی — مسکین علی شاہ کی پوتی — ہمیں نہیں پہچانتی — میں حامد ہوں۔ رضیہ کا بھائی —"

"حامد بھائی —" غزل کی جان میں جان آئی۔ یہ وہی حامد بھائی تھے جن کی منگنی کی رسم میں وہ رضیہ ممانی کے ساتھ گئی تھی۔ اور وہاں دلہن کے بھائی سے خوب مار کٹائی ہوئی تھی۔

"سرور صاحب یہاں رہتے ہیں —؟"

"جی ہاں — وہ میرا بھائی ہے" حامد کی بیوی نے اب کی بار بہت خوش ہو کر کہا۔

"آپ سرور کو بھول گئے! جب میری رسم کرنے کے لئے رضیہ آپا کے ساتھ آئے تھے تو سرور کو آپ خوب مارے تھے۔

پھر وہ سب ہنس پڑے۔

"اجی دالان میں کیا کھڑے ہیں۔ اندر آؤ نا۔"

سارے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ یوں جیسے آج غزل پھر اس گھر کے نصیب جگانے آئی ہے۔ ایک بچی نے جلدی جلدی فرش پر بکھرے ہوئے میلے کپڑے کتابیں اور چپلیں ہٹائیں۔ حامد بھائی کی بیوی نے ایک سفید چادر میلی دری پر بچھا دی۔ اور حامد بھائی کہیں سے ایک ٹوٹا ہوا پنکھا ڈھونڈ لائے۔ مگر غزل ٹھٹک گئی — یوں جیسے وہ کسی درگاہ میں داخل ہو رہی ہو — اتنی مقدس جگہ — اتنی پاک جگہ اپنے گناہ گار پاؤں رکھتے ہوئے وہ کانپ گئی۔

"آپ کپڑے پہنئے۔" غزل کو زبردستی چادر پر بٹھا کر حامد بھائی کی بیوی نے ان سے کہا۔

"آفس سے آنے کے بعد گرمی کی وجہ سے قمیص بھی نہیں پہنتے۔"

اونہہ۔ اب استری کی قمیص کیوں خراب کر دں!
غزل بیگم کوئی غیر تھوڑی ہیں۔ اپنے گھر کی بچی ہے۔"
بھڑوآنا ـــــ بھڑدآجاؤں ـــــ؟"
باہر ابھی تک بچیاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔
حامد بھائی اپنے بچوں سے کہہ رہے تھے۔

"یہ تمہاری بہن ہیں۔ بہوت بڑی آرٹسٹ ہیں۔ کبھی تم سب کو لے جائیں گے ان کا ڈراما ـــــ ہاں تو اب کون سا ڈرامہ ہونے والا ہے ـــ؟ حامد بھائی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اللہ جانے ـــــ؟ اس نے گھبرا کے سامنے دیکھا۔

سرور نیند سے بوجھل بدن لیے۔ منہ پر بال بکھرائے۔ بنیان اور پینٹ پہنے کمرے سے باہر نکلا اور اس کی جانب دیکھ کر کھل اٹھا لو ـــــ شروع ہوگیا پہلا سین ـــــ اس نے کانپ کر سوچا۔ آخر سرور کے گھر آنے کی کیا تک تھی اجاڑ صورت ـــــ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگی۔

"اداہو ـــ آج ہم پر اتنی عنایت ـــــ؟ آپا اس خوشی میں دو پیالی چائے تو بنا دو ـــ" وہ بھی آکر حامد بھائی کے قریب بیٹھ گیا۔

"ہاں ہاں۔ مگر پہلے غزل سے پوچھ لو اتنی گرمی میں چائے پئیں گی یا نہیں ـــــ خواہ مخواہ دودھ شکر ضائع ہو۔" حامد بھائی نے جلدی سے کہا۔

"نہیں میں چائے نہیں پیوں گی۔ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

میں ابھی آیا۔" حامد بھائی اٹھے اور چولھے کے پاس جاکر بیوی سے کچھ کھسر پھسر کرنے لگے۔

"آپ کو مکان کیسے مل گیا ہمارا ـــــ؟" سرور نے پوچھا۔

اور پھر وہ کچھ جھینپ کر ـــ گھبرا کے بولا۔

"اچھا ہوا آپ نے میرا گھر بھی دیکھ لیا۔ ہم لوگ بہت ہی معمولی سی زندگی

گزارتے ہیں۔ حامد بھائی کو ایک ہزار تنخواہ ملتی ہے۔ مگر وہ اپنا مستقبل سنوارنا چاہتے ہیں۔ اس لیے بڑی کفایت شعاری سے کام لیتے ہیں۔ مجھے پارٹی میں کام کرنے کی وجہ سے سرکاری نوکری نہیں ملتی۔ اس لیے ایک اخبار میں کام کرتا ہوں۔ اماں اور بڑی آپا کا انتقال ہوگیا۔ بھائی جان پاکستان چلے گئے۔ اس لیے چھوٹی آپا کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔

اونہہ ـــــ غزل باہر کھیلتی ہوئی بچیوں کا کھیل دیکھنے لگی۔ سرور کی کہانی میں کوئی بات نئی نہیں تھی۔ یہ تو وہی کہانی تھی جو سرور کی ماں نے حامد بھائی کی رسم کے دن سنائی تھی ـــــ بیچارے حامد بھائی کتنی مصیبت اٹھا رہے ہیں۔ کتنی خواہشوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ ایک اچھے مستقبل کے لئے جو نہ جانے کب آئے گا!

"غزل تمہاری بھابی کہہ رہی ہیں آج ہمارے ساتھ کھانا کھالو۔ حامد بھائی نے بڑی دیر کے بعد اپنا فیصلہ سنایا۔

"نہیں حامد بھائی اب مجھے اجازت دیجئے۔" وہ گھبراہٹ کے مارے اپنی ساری کے پلو سے پنکھا جھلنے لگی۔

"صرف تھوڑی دیر بھی ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتیں!" سرور نے بڑے دکھ سے کہا۔ اور غزل کا جواب سنے بغیر کہا۔

"میں ابھی کچھ پھل اور مٹھائی لے آتا ہوں۔"

پھر بھابی نے چٹائی سے بنا ہوا ایک گول دسترخوان لاکر بچھایا۔ تمام چینی کی ٹوٹی پھوٹی رکابیاں آئیں۔ کھٹی دال اور خشکہ۔ بگھارے بینگن ـــ کھانا دیکھتے ہی سارے بچے بھی اپنی اپنی رکابیاں لے کر آ بیٹھے۔ مگر بھابی نے سب کو باہر کر دیا۔

"پہلے مہمان کو کھا لینے دو۔ نہیں بعد میں ملے گا۔"

غزل کو اپنا بچپن یاد آگیا۔ جب بھی گھر میں کوئی مہمان آتا تو اس کا یہی

حشر ہوتا تھا

سرور نے خربوزے کی ایک پھانک کاٹ کر اس کی طرف بڑھائی۔ "بس یہ کافی ہے" اس نے سوچا۔ یہ چھوٹا سا قبر جیسا گھر ——— دھوئیں سے بھرا سیاہ باورچی خانہ جہاں دال چاول کے علاوہ کچھ نہیں پک سکتا۔ سارا دن وہیں بیٹھے بھٹتی چنگاریوں کو بھڑکاتے رہو ——— چاہے باہر کیسے ہی خوب صورت بادل جھوم کر آئیں ——— عثمان ساگر کے پانی میں کتنے ہی سنہرے رو پہلے رنگ گھل جائیں۔ "ایوانِ غزل" میں میز کے اوپر سالم مرغ رکھے ہوں ——— پتھر گٹی کی دو کانوں پر کتان کی، کنجی ورم کی ساریاں جھلملا رہی ہوں ——— کہاں صاحب کی میز پر جانے میک اپ کا کتنا سامان پڑا ہوگا ——— نشاط ٹاکیز کے میک اپ روم میں سیتا، نور جہاں، اور کلوپیٹرا بننے کا سارا سامان رکھا ہے ——— پیلیس ٹاکیز کے ہال میں لوگ پردہ اٹھنے کے منتظر ہیں۔ اس کا انتظار کرتے کرتے تھک جائیں ——— مگر وہ سوئے گی نہیں ——— ساری رات سرور کا انتظار کیے جائے گی جو شراب کے نشے میں دھت کسی مشاعرے میں غزل پڑھ رہا ہوگا۔ آدھی رات کو کسی اخبار کے دفتر میں بیٹھا خبروں کا ترجمہ کر رہا ہوگا۔

"اور کیا چاہیے ——— ؟" سرور نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"بس ——— اور کچھ نہیں۔"

باہر نکل کر اسے جھٹکے میں بٹھانے کے بعد سرور نے کہا۔

"آج مجھے معلوم ہوا کہ تم کون ہو۔"

"یہ اور بھی برا ہوا۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"خیر ——— میں کل آؤں گا ——— تم "ایوانِ غزل" جا رہی ہو نا!"

"ہاں ———" غزل نے بغیر کسی ارادے کے کہا اور "ایوانِ غزل" پہنچ گئی۔

دوسرے دن اس نے اپنے تمام ناکردہ گناہوں کی معافی مانگ کر

ابا سے گھر آنے کی اجازت طلب کی تو انھوں نے اسی پرچے کے دوسری طرف لکھ کر بھیج دیا کہ وہ غزل کو ایروڈروم پر گاڑ آئے ہیں۔ ادھر "ایوان غزل" میں کوئی اسے نہ پوچھتا تھا۔ صرف بی بی ایک خاموش طرف دار تھیں۔ یا نانا حضت کے ڈر سے سب اسے برداشت کرتے تھے مگر اب گھر میں رضیہ کی شہنشاہی تھی جہاں وہ اپنے کسی سسرال کے عزیز کو برداشت نہیں کرتی تھیں۔ لیکن راشد ماموں نجانے کس مصلحت کے تحت روتی ہوئی غزل کے سر پہ ہاتھ رکھا اور اپنی مرحوم بہنوں کو یاد کر کے بولے۔

"بس آج سے تم ہمایوں بھائی کے ہاں نہیں جاؤ گی۔ رونا دھونا چھوڑو اور آرام سے رہو۔"

ادنگھتے کو ٹھیلے کا سہارا ——— وہ جاتی بھی کہاں ———! ادھر کرانتی کی فکر الگ کھائے جا رہی تھی۔ کیوں کہ رنگما اب اسے مفت میں کھلانے پر تیار نہ تھی۔ خیر اس نے شیوراج کے پرس والے دو نوٹ رنگما کو تھما کر اس کا منہ بند کر دیا۔ اور سرور کا انتظار کرتی رہی کہ وہ کسی اخبار میں اسے بھی نوکری دلائے گا۔ مگر سرور نہیں آیا ——— غزل جانتی تھی کہ اس دن اس کے آنے کے بعد حامد بھائی کے ہاں بڑا ہنگامہ ہوا ہوگا۔ ایسی آوارہ.. چھوکریوں سے دوستی بڑھانے پر بھابی نے اسے خوب ڈانٹا ہوگا۔ ممکن ہے سرور خود بھی پچھتایا ہو کہ اس نے غزل کو کیوں منہ لگایا ——— چلو اچھا ہوا ——— یہ ڈراما اتنی جلدی ختم ہوگیا۔ پھر ایک دن زاشد یہ خبر لیے ہوئے آیا کہ حامد بھائی کا انتقال ہوگیا۔ سڑک پار کرتے وقت کسی بس کی زد میں آگئے تھے ——— نہیں نہیں ——— غزل چلا پڑی ——— حامد بھائی سے زندگی مت چھینو۔ انھوں نے اپنے مستقبل کے بڑے خوب صورت خواب سجائے ہیں۔ زندگی کا ہر دکھ ہر کڑواہٹ نگل لی ہے۔ مستقبل میں عیش کرنے کے لیے۔ پھر ایک دن سرور بھی آگیا ——— اور اس نے بڑی دیر تک حامد بھائی

کے بارے میں باتیں کرنے کے بعد جیسے اس تکلیف دہ موضوع کو بدلتے ہوئے کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ تمہارے لیے بھی کچھ کرنا ہے۔"

"میرے لیے ۔۔۔؟ کیا ۔۔۔؟"

ابھی اس دن لنگڑی پھوپو کہہ رہی تھیں کہ امن کمیٹیوں والے سرکار کے ساتھ مل کر آوارہ لڑکیوں کو پکڑ رہے ہیں۔ انھیں جیل میں ڈال دیتے ہیں۔

ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ تمہاری عمر کی لڑکیاں تو ہنس بھی نہیں سکتیں۔ حالات نے تمہیں آنسوؤں میں نہلا دیا ہے۔"

"آپ کو میرے بارے میں کیا کیا معلوم ہے۔"

"چھوڑو اس ذکر کو ۔۔۔" اس نے سگریٹ سلگایا اور ایوانِ غزل کے اس شاندار ہال کو دیکھنے لگا۔

"ایوان غزل میں عورت کا صرف ایک مصرف رہا ہے۔ مرد کی جنسی تسکین کا ذریعہ۔ میں نے اس ڈیوڑھی کے بارے میں بہت سی کہانیاں سنی ہیں۔" وہ ہال میں لگے ہوئے فوٹو دیکھ رہا تھا۔

"مگر ایوان غزل" نے مجھے کوئی دکھ نہیں دیا۔ یہ تو میری آخری پناہ گاہ ہے غزل اطمینان سے کرسی پر سر رکھ کر بیٹھ گئی۔

"ہر مجبور عورت کی آخری پناہ گاہ یہی ہوتی ہے۔" اس نے سگریٹ کا دھواں باہر اگلا۔

"خیر ۔۔۔ یہ میں نہیں کہوں گا کہ تم اتنے لطیف احساسات کی مالک ہوتے ہوئے کیوں اس گندگی میں پھنس گئیں۔

"سننا چاہتے ہیں کیا آپ ۔۔۔؟" غزل اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"نہیں ۔۔۔" سرور نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

میں نے ابھی طے کیا ہے کہ آج ہم جو باتیں کریں گے وہ بالکل صاف اور سچی ہوں گی۔ کیوں کہ تمہارے آگے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

غزل کو جیسے کسی نے پیچھے کی طرف دھکا دے دیا۔ صاف اور سچی باتیں؟ مجھ سے ۔۔۔؟ تو کیا کہہ دوں میں ضمیر کے لیے جی رہی ہوں۔ جب تک یہ انگوٹھی میرے ہاتھ میں ہے سچ بولنے پر مجبور ہوں۔

"میں نے بہت سی خوب صورت عورتوں کو مخاطب کر کے شاعری کی ہے۔ مگر اب مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری وہ شاعری جھوٹی ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا سچ ۔۔۔ ناقابلِ فراموش حقیقت صرف تمہارے وجود میں ہے۔"

پھر کسی ذہنی بے چینی سے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سگریٹ کو مسل کے پھینک دیا اور میز پر جمی ہوئی گرد کو اپنی انگلی سے صاف کرنے لگا۔

"جانے کیوں غزل تم سے بات کرتے وقت میری زبان لڑکھڑا جاتی ہے ۔۔۔ یوں لگتا ہے میرا دم گھٹ جائے گا۔" وہ بیچ بیچ اپنی اکھڑی اکھڑی سانسوں کو ٹھیک کرنے کے لیے رکا۔ پھر غزل کے قریب آیا جو کرسی کے تکیے پر سر رکھے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا تم اجازت دو گی۔ میں کہہ دوں کہ ۔۔۔"

"نہیں نہیں ۔۔۔؟ غزل کانوں پہ ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ سچ نہیں ہو گا۔ تم نے تو کہا تھا کہ آج صرف سچ بولو گے۔"

وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے کو ہٹ گئی۔ اسے سارے گھر پر سایہ کیے ہوئے آم کا پیڑ یاد آیا۔ دھوئیں سے بھری سیاہ کوٹھری۔ پتلی پانی جیسی دال اور ننگے پاؤں دوڑنے والی بھابی اور ننھے ننھے بچے جو خالی رکابیاں تھامے دروازے میں کھڑے تھے ۔۔۔ غزل کسی سحر سے پگھلنے لگی۔ آنگن میں سوئے ہوئے بچے کو اٹھانے لپکی۔ مگر سرور کی آواز پر چونک پڑی۔

"میں تمہیں اس پرانے گھر میں نہیں لے جاؤں گا۔ تم الف لیلیٰ کی شہزادی ہو — میں تمہیں اپنے تخیل کے سنگھاسن پر بٹھائے رکھوں گا۔ کوئی دکھ۔ کوئی تکلیف تم تک نہیں پہنچے گی۔ تم — تم میری شاعری کی جان ہوگی — میرے خوبصورت خیالات کا پرتو۔"

غزل اچانک یوں کرسی پر بیٹھ گئی جیسے کسی نے اسے شوٹ کر دیا ہو۔

"جان غزل —؟ محبوبہ —؟ شاعری کی تکمیل کرنے والی —؟"

غزل کو یوں مایوسی کے ساتھ بیٹھتے دیکھ کر وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں مردوں نے اتنے دھوکے دیئے ہیں کہ اب تمہیں کسی پر اعتبار نہیں رہا۔ لیکن میری شاعری میں تم ہمیشہ زندہ —"

"ہاں۔ مجھے تم پر بھی اعتبار نہیں ہے۔"

بعد میں غزل سخت حیران ہوئی کہ یہ بات اس نے اتنی جلدی سرور سے کہہ دی! اس کی تو یہی سب سے بڑی کمزوری رہی تھی۔ کہ وہ کسی مرد کو مایوس نہیں کر سکی۔ اس نے دوسروں کو ذہنی صدمے سے بچانے کے لیے ہمیشہ اپنی جھولی خالی کی۔ مگر وہ محبوبہ بننے کے کھیل سے اکتا چکی تھی۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ سرور اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر میں پناہ دینے کے خواب دکھائے گا۔ اس پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں کا لالچ دے گا جو اس کے گھر پر پھیلا ہوا ہے۔ مگر وہ تو آج سچ بولنے پر تلا ہوا ہے۔

"غزل —" غزل نے مڑ کے دیکھا سرور سر جھکائے رو رہا تھا بالکل اس احمق لڑکے کی طرح جسے بچپن میں اس نے خوب ٹھوکا تھا۔ غزل کو یوں لگا جیسے سرور ابھی تک وہی چھوٹا سا لڑکا ہے میلی شیروانی پہنے بغیر پھندنے والی ترکی ٹوپی اوڑھے۔

"ہاں — آج تم نے کہا تھا کہ ہم دونوں صرف سچ بولیں گے۔ اور اس سچ کی بدولت تم بال بال بچ گئے — جاؤ اب جاکر اس حادثے پر ایک نظم لکھ ڈالو۔ اور اس چوٹ کو ہمیشہ اپنے دل میں محسوس کرتے رہو — میری طرح۔"

غم اور غصہ کے مارے سرور سے کچھ نہ کہا گیا۔ وہ سر جھکائے بالکل لڑکیوں کی طرح سسکیاں بھر رہا تھا۔

"پھر کبھی ایوان غزل آؤ تو ایک بار پھر مجھے سنانا "جان غزل تخیل کی ملکہ — فن کی زندگی —"

اور اب کی بار غزل رو پڑی — دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

راشد نے دو ایک بار سرور کو گھر آتے دیکھا تو اس کی بڑی خاطر تواضع کی۔ ویسے بھی مشہور اور بڑے آدمیوں سے دوستی بڑھانے میں وہ ہمیشہ پہل کرتا۔ سرور کی شاعری کی بھی آج کل دھوم مچی ہوئی تھی۔ ہر رسالے میں اس کا نام نظر آتا۔ ہر مشاعرے میں وہ موجود۔ سنا ہے کمیونسٹ ادیبوں نے جو ادبی انجمن قائم کی تھی سرور ہی اس کا سکریٹری تھا۔ آج کل تو کمیونسٹوں کا زور تھا۔ اس لیے ایک آدھ شاعر سے بنائے رکھنے ہی میں فائدہ تھا۔ اس لیے غزل سے سرور کی بڑھتی ہوئی دوستی پر راشد نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ رضیہ اور لنگڑی پھوپو بھی یہی سمجھتی رہیں کہ سرور صرف راشد سے ہی ملنے آتا ہے۔

مگر آج سرور کے آنے سے دو ہفتے پہلے حامد بھائی راشد کے ہاں باقاعدہ سرور کا پیغام بھجوا چکے تھے۔ سرخ کاغذ پر لکھی ہوئی اسم نویسی اور اس کے ساتھ سرور کا ایک فوٹو جس میں وہ بی۔ اے کی سند لیے گون پہنے کھڑا تھا۔ سرور کو اس بات کی

بالکل خبر نہ تھی۔ بلکہ غزل کو بھی آج فوزیہ نے بتایا کہ گھر میں سب اس رشتے کو پسند کر رہے ہیں اور اب بہت جلد غزل بھی دلہن بننے والی ہے۔

غزل نے سنا تو ٹھٹک کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ فوزیہ سے کیا کہے۔ پھر اسے اتنا پریشان دیکھ کر فوزیہ اس کے پاس سرک آئی۔ فوزیہ منجے بیٹھ چکی تھی اور اس کے پیلے کپڑے، چھپے اور ہلدی کی خوشبو میں بسے ہوئے تھے۔

”تمہیں کیا سرور پسند نہیں ہے۔ سنا ہے بہت بڑا شاعر ہے۔

”نہیں — سرور کو میں پسند نہیں ہوں۔ فوزیہ تم راشد ماموں سے کہہ دو کہ آج سرور اس رشتے سے انکار کرنے آیا تھا۔ حامد بھائی نے اپنی مرضی سے یہ پیغام بھجوایا تھا۔“

”کیا — سرور کو تم پسند نہیں ہو — ؟“ فوزیہ چونک پڑی۔

کہیں تمہارے بارے میں اسے کچھ معلوم ہو گیا ہوگا۔

”اسی لئے تو کہہ رہی ہوں۔ ممانی سے کہہ دو اس رشتے پر غور نہ کریں۔

وہاں فرصت بھی کیسے تھی غزل کے بارے میں سوچنے کی۔

فوزیہ درزی سے الجھ رہی تھی۔ رعنیہ جہیز سنوارنے میں لگی ہوئی تھی راشد شادی کے رقعوں پر نام لکھ رہا تھا۔ سارا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا — فوزیہ کی سہیلیاں دن رات اسے گھیرے بیٹھی تھیں۔ پھاٹک پر نوبت بج رہی تھی اور دالان میں لنگڑی پھوپو لڑکیوں کے ساتھ ڈھول سنبھالے بیٹھی تھیں۔

دلہن میری ساج رہی ماں سنہرے جوڑے سے
دلہن تیرا چاؤ کریں گے تیرے بابا
روپے پیسے سے — ہیرے موتی سے

جانے کیوں گاتے گاتے لنگڑی پھوپو کی آواز کانپ جاتی اور وہ اپنے آنسو پونچھنے لگتی تھیں۔

پھر فوزیہ کا دولہا برات لے کر ایوان غزل کے پھاٹک پر آیا۔ اندر ہڑبونگ مچی ہوئی تھی — چہکتی دمکتی عورتیں — ہنسی قہقہے — بریانی اور مرغ کی خوشبوئیں اور دل پر لکیر ڈالنے والی تیز آوازیں۔

بابل مورا نہر چھوٹو جائے —

سہیلیوں کے بیچ میں دلہن بنی فوزیہ کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ غزل سامنے سہاگ پوڑا کھولے اس کے مہندی لگے ہاتھوں پر افشاں سجا رہی تھی۔ زیور پہنا رہی تھی۔ میک اپ کر رہی تھی۔

”سنا ہے سگریٹ بہت پیتے ہیں — میرا تو تمباکو کی بو سے دم گھٹتا ہے۔ درینہ کہہ رہی تھی انھیں سرخ کلر بہت پسند ہے۔“

اور پھر اس نے غزل کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”یہ ڈاکٹر لوگ بڑے بے شرم ہوتے ہیں۔ میں تو تین دن تک آنکھیں نہیں کھولوں گی۔“ وہ شرم کے مارے غزل پر جھک گئی۔

غزل نے سوچا — میں تو اب کسی مرد کو دیکھ کر کبھی نہیں شرماؤں گی مجھے تو کسی بات پر گھبراہٹ نہیں ہوگی —

اور پھر جب شاہین اور راشد ماموں فوزیہ سے نکاح کا اقرار کروانے آئے تو فوزیہ کا روتے روتے برا حال تھا۔ زندگی میں پہلی بار فوزیہ نے ایک مرد کی ہو جانے کا اقرار کر لیا تھا۔ اب وہ اسی کے لئے جئے گی۔ اسی کے لئے مرے گی۔ اس نے اپنی باقی زندگی ایک اجنبی کو سونپ دی تھی۔ پھر بھی فوزیہ رو رہی تھی — پاگل — میں ہوتی تو اس خوشی کے مارے مر جاتی۔ کسی ایک کی ہو کر مر جانے کا سکھ کیسا ہوتا ہوگا مجھے فوزیہ کی زندگی کا ایک ہی لمحہ مل جائے تو —

"بس کرو کتنا روؤ گی ___؟" غزل کی کسی رشتے کی خالہ نے اس کے آنسو پونچھے۔۔

"بچپن کا ساتھ تھا دونوں کا۔ رضیہ بیگم اب غزل کی شادی کر دو۔ بے چاری اکیلی گھبرا رہی ہے۔"

کاش میں اکیلی ہوتی ___ فوزیہ کی طرح ___ فوزیہ آج اپنے دولہا کے گھر جائے گی۔ بالکل اکیلی۔ خالی دل ___ خالی ذہن لیے ___ میں کہاں جاؤں گی ___ کیا کیا لے کر ___؟

پھر سب کی نگاہیں غزل پر جم گئیں۔

ایک دن وہ ناہید باجی کے ساتھ پکچر دیکھنے گئی تو ممانی بیگم نے خوب ڈانٹا۔

"اب سیر سپاٹے بند کرو۔ آج سے سخت پردہ کرنا ہوگا۔ گھر میں نیا داماد آگیا ہے۔ میں اپنے گھر کو بدنام نہیں کروں گی۔ جی چاہے تو یہاں رہو ورنہ چلی جاؤ اپنے باپ کے ہاں۔" بیٹی کی شادی کرتے ہی ممانی بیگم کتنی بدلی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ پنکھ کاٹنے کے بعد پنچھی سے کہو کہ وہ اڑ جائے تو کون سی ڈال پہ بیٹھے گا! غزل نے خاموشی سے کپڑے بدلے اور جھاڑو اٹھا کر آنگن صاف کرنے لگی۔ یوں بھی باہر کون اس کے انتظار میں تارے گن رہا تھا! اس نے جان بوجھ کر چاروں طرف کے دروازے بند کر لیے تھے۔ اس کے باوجود فوزیہ اپنے دولہا کے ساتھ آئی تو ممانی بیگم غزل کو اندر ڈھکیل کر باہر سے کنڈی لگا دیتی تھیں۔

خیر، غزل کو یوں بھی فوزیہ کے دولہا سے بڑی نفرت تھی۔ بے حد مغرور تھا، نک چڑھا۔ آتے ہی سارے گھر کو بیمار بنا ڈالا تاکہ اپنی ڈاکٹری کا رعب ڈالے۔ اسے فوزیہ کی کوئی ادا نہ بھاتی۔ ہر کپڑے اور زیور میں مین میخ نکالتا۔

ہر وقت اس کا موڈ ٹھیک کرنے میں لگی رہتی تھی ۔ گھر آتے ہی وہ امی کو جتا دیتی

" امی میٹھے میں کیوڑا مت ڈالنا ۔ ڈالڈا گھی مت منگوانا ۔ مرغ روسٹ کروائیں ۔ لنگڑی پھوپو سے کہیے آہستہ بات کریں ۔ انھیں شور وغل پسند نہیں ہے ۔"

وہ پھر بھی فوزیہ سے شکایت کرتا تھا کہ سسرال میں اس کی کوئی قدر ہی نہیں کرتا ۔

اس لیے دو چار مہینے کے بعد کبھی دن بھر کے لیے وہ دونوں آتے تھے تو ساتھ ہی فوزیہ کی ساس کا رقعہ بھی آتا کہ گذشتہ بار خراب گھی کھانے سے ان کا بیٹا بیمار ہو گیا تھا ۔ اس لیے اسے کھانا نہ کھلایا جائے ۔

چنانچہ غزل انتظار ہی میں رہ جاتی کہ فوزیہ سے اس کے دولہا کے ناز نخرے سنے ، مگر فوزیہ کو فرصت ہی نہ ملتی ۔

ایک دن فوزیہ کو رخصت کر کے رضیہ اداس بیٹھی تھی کہ شیخو بھائی ان کے پاس آ بیٹھے ۔

شیخو بھائی اب اتحاد المسلمین سے نکل کر کانگریس کی امن کمیٹی کے سکریٹری بن گئے تھے اور جگہ جگہ ہندو مسلم اتحاد کے جلسے کرواتے تھے اور پھر انھوں نے فوجی حکومت کے آگے غدار اور ظالم مسلمانوں کی فہرست پیش کی ۔ بتایا کہ کس گھر میں کتنے ہتھیار چھپے ہوئے تھے اور کس ڈیوڑھی میں کتنا سونا گڑا ہوا ہے ۔ کون کون اپنی دولت پاکستان منتقل کر رہا ہے ۔ اس لیے شیخو بھائی کے آج کل مزے تھے ۔ خوب ٹھاٹھ کی نئی شیروانی اور ثابت چپلیں پہنے گھومتے روز شام کو نشے میں چور ہاتھ میں چاٹ کا دونا تھامے ، دالان کی سیڑھیوں پر آ بیٹھتے تھے ۔ لنگڑی پھوپو نے ان کے یہ ٹھاٹ باٹ دیکھے تو ایک بار پھر شیخو بھائی کا گھر بسانے کی فکر پڑ گئی ۔

مگر آج شیخو بھائی دالان کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر تخت تک آ گئے

تو غزل کو بڑا تعجب ہوا ۔ کیوں کہ ان کے حدود نوکروں کے کوارٹرس سے لے کر دالان کی سیڑھیوں تک مقرر تھے ۔ شاید وہ واحد حسین اور بی بی کے بعد اب رضیہ کی شخصیت کو نظر انداز کر رہے تھے ۔

" ہم تو یہ جانتے ہیں دلہن بیگم کہ بیٹی کی شادی ہمیشہ واں کرنا جاں اس کی خدر کرنے والے لوگاں ہوں ۔"

انھوں نے رضیہ کا اداس چہرہ دیکھ کر کہا اور تخت کے کونے پر ٹک گئے ۔

" یہ تو قسمت کی بات ہے شیخو بھائی ۔ نصیبوں کا لکھا کیسے دیکھیں گے اپن تو بھوت ڈھونڈے اچھا بر ۔"

" مگر پھر بھی عورت بیٹی کو ہمیشہ واں دینا جاں اس کی خدر کرنے والے ہوں ۔ اب جیسے میں ہوں ۔ اب آپ میری شادی کسی جوان چھوکری سے کردو ۔ دیکھو اس کا مرید بن جاتا ہوں ۔"

شیخو بھائی کی بات پہ رضیہ کو ہنسی آ گئی اور لنگڑی پھوپو منہ بنا کے بڑبڑانے لگیں ۔

" چھچھوری باتاں ہی نہیں جاتے اُجاڑ صورت کے ۔"

مگر غزل نے دیکھا کہ ممانی بیگم آج بڑی دل چسپی سے شیخو بھائی کی باتیں سن رہی تھیں ۔

دوپہر کو ممانی بیگم پھر لنگڑی پھوپو کے پاس بیٹھی سر جوڑے کھسر پھسر کر رہی تھیں ۔ ان کے چہرے پہ وہی سنجیدگی تھی جو عموماً کسی اہم فیصلے کے وقت خواتین پر چھا جاتی ہے ۔

شاہین نے ہاسٹل جاتے وقت ان دونوں کو یوں چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھا تو زور سے ہنس کر بولا ۔

" میں نے سن لیا ہے ۔ آج ہی شیخو بھائی سے کہتا ہوں کہ تمہاری برائیاں

ہو رہی تھیں۔

" تمہارا کیا بیچ ہے جی ہماری باتوں میں "

میرا ہر بات میں بیچ ہے ۔ مجھے بتائیے آپ کیا باتیں کر رہی تھیں "

وہ اپنا بریف کیس رکھ کر ان دونوں کے بیچ میں بیٹھ گیا ۔

" جاؤ بابا ہسپتال میں مریض انتظار کر رہے ہوں گے "

لنگڑی پھوپو نے اسے ٹالنا چاہا ۔

" ایسی کی تیسی مریضوں کی، میں تو ہرگز نہیں جاؤں گا۔ چاہے شام ہو جائے"

رضیہ شاہین کی ضد سے واقف تھی ۔ وہ ہمیشہ اپنی بات منوا کے چھوڑتا۔

" اچھا تو سن لو غزل کی شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں ہم لوگ "

" یہ ہوئی کوئی بات ۔" شاہین نے بریف کیس اٹھایا اور جاتے ہوئے کہا۔

مگر غزل کے لیئے ایسا ضدی اڑیل ٹٹو مت ڈھونڈیے جیسا وہ نیم حکیم طاہر فوزیہ کے لیے انتخاب کیا ہے "

شاہین کو اپنا بہنوئی ذرا بھی پسند نہیں تھا۔ نہ تو اس کی عادت اطوار اچھے لگتے اور نہ اس کی شیخی اور ڈاکٹری کو وہ کوئی اہمیت دیتا تھا۔ شاہین کہتا طاہر نے یورپ میں صرف عیش کیے ہیں ۔

اس کی قابلیت صفر ہے ۔ اور طاہر کہتا تھا کہ میں امریکہ میں سات برس رہا ہوں۔ اس لیے شاہین قابلیت میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔

غزل نے ان لوگوں کی باتیں سنی تو چونک پڑی ــــ فرنیچر صاف کرتے میں اس نے سوچا کہیں بھابی کے ذریعہ پھر سرور نے تو بات شروع نہیں کی ہے۔ میں اس پیغام کو اس کے منہ پر ماردوں گی ۔ کیا میں اس کھیل کے لیے رہ گئی ہوں۔ سرور میرے بارے میں شاید کچھ نہیں جانتا ۔" پھر اس نے سوچ سوچ کر سرور کو ایک خط لکھا ۔ اپنے ماضی کے تمام قصے سنائے

اور پوچھا کہ اب بھی کیا تم مجھے اپنے گھر میں پھیلے ہوئے پیڑ کی چھاؤں دو گے ! کیا میں ایسے پاک گھر میں رہ سکتی ہوں جہاں زندگی صرف صبر و شکر کا نام ہو۔

شام کو وہ خط بند کر کے پوسٹ کرنے والی تھی کہ ممانی بیگم نے لنگڑی پھوپو سے کہا ۔

مجھے تو غزل اور شیخو بھائی کا جوڑ بہت ہی ٹھیک لگتا ہے ۔ دونوں ٹھیک ہو جائیں گے ۔"

غزل کے ہاتھ سے لفافہ چھوٹ گرا ۔ اور وہ اسی طرح پتھر کی مورت بنی کھڑی رہی ۔ اسے یوں گم سم دیکھ کر راشد ماموں گھبرا گئے ۔

" میں کہتا ہوں رضیہ ۔ ذرا اچھی طرح غور کرو ۔ غزل اور شیخو بھائی کا بھی کوئی جوڑ ہے ! دونوں کی عمروں میں چالیس سال کا تو فرق ہوگا "

" بس بس اب آپ چپ بیٹھیے " رضیہ کو غصہ آگیا ۔

" تو کوئی جوڑ والا ڈھونڈا ہوتا نا آپ نے۔ ایسے کرتوتوں پر کون تھوکے گا ۔ ایک تو قبر میں جا سوئی ۔ اور چھوٹ دوں گی تو اب آپ کی یہ بھانجی ہمیں قبر میں سلا دے گی ۔"

خیر خیر ــ ان باتوں کو چھوڑو ۔ لیکن میں کہتا تھا کہ کوئی اور لڑکا ــــ" راشد کھسیا گیا۔

" ہاں لڑکے تو سڑکوں پر رلتے پھرتے ہیں۔ آپ اپنی بیٹی کے لیے تو ڈھونڈ لائے ہوتے کوئی اچھا لڑکا ۔"

" اچھا اچھا ــــ آہستہ بولو ــــ" راشد ہار گیا ۔

" بات یہ ہے راشد میاں ۔" لنگڑی پھوپو نے فوراً آکر مورچہ سنبھال لیا۔

" کہ کوئی مرد ذرا سخت مزاج ہو تو اس کی نکیل تھامے ۔ ورنہ یہ تو زندگی بھر ایسے ہی جھگڑوں ٹنٹوں میں پڑی رہے گی "

راشد نے اب کچھ نہ کہا ۔ صرف چاول صاف کرتی ہوئی غزل کو دیکھتا

رہا اور غزل کی خاموشی دیکھ کر کچھ مطمئن سا ہو گیا۔

ممکن ہے غزل نے خود ہی شیخو بھائی میں کوئی خوب صورت بات ڈھونڈ لی ہو۔ ورنہ یہ لڑکیاں اپنی مرضی کے بغیر تو کوئی بات نہیں کر سکتیں۔

"اب اپنے لیے بھی دلہن تلاش کرو راشد میاں۔"

لنگڑی پھوپو نے فوراً راشد کا موڈ بدلنے کے لیے دوسرا موضوع شروع کیا۔

"میرا شاہین بابا ماشاءاللہ پڑھ لکھ کر نوکر بھی ہو گیا۔ فوزیہ کے بغیر مجھے تو اب گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ دلہن آجائے تو کچھ رونق ہو گی۔"

"اجی انھیں کہاں فرصت ہے پھوپو ان کاموں کی۔" رضیہ بدستور غصہ میں تھی۔ "بس یہ تو ایک ہی بات جانتے ہیں کہ روپیہ کمائیں۔ اولاد کی خوشیوں سے انھیں کیا کام۔"

"اجی غصہ تھوکو بیگم صاحب۔ وہ کام بھی کر رہا ہوں۔ ذی شان جاہ کی پوتی کے لیے رحیمو میاں سے کہا ہے۔ سنا ہے لڑکی بی۔ اے پاس ہے۔ ایک لاکھ تو صرف نقد دیں گے۔"

"سچ ——— ؟" رضیہ چونک پڑی

"ارے اس اجاڑ صورت جل ککڑے رحیمو میاں کا واسطہ چھوڑو۔ میں خود کرامت آپا کے پاس جاؤں گی۔ آخر میرے بیٹے میں کیا کمی ہے۔ صورت شکل اور پھر یورپ کی اتنی ڈگریاں۔ سنا ہے ہاسپٹل میں بھی سب اسے پسند کرتے ہیں۔"

"مگر شاہین بیٹے سے بھی تو پہلے پوچھ لو۔"

یہ سن کر سب چپ ہو گئے۔

شاہین بے حد سادا مزاج تھا۔ خود نمائی اور تکبر نام کو نہیں تھا۔ مگر یورپ سے ضد تھوڑی اور سمیٹ لایا تھا۔ بس وہی کام کرتا جو اسے پسند آتا۔ آتے ہی

اس کی راشد سے کئی بار جھڑپ ہوئی۔ وہ بدتمیز یا منہ پھٹ تو نہ تھا۔ لیکن راشد انتظار کر رہا تھا کہ شاہین آجائے گا تو پاکستان چلے جائیں گے۔ یہاں کا پیسہ وہاں منتقل کر دیں گے۔ شاہین پھر یورپ ہی جا کر دولت کمائے گا۔ یہاں کی نوکریوں میں کیا رکھا ہے۔ مگر شاہین کو پاکستان جانا بالکل پسند نہیں تھا۔

اسے یورپ کی تہذیب سے نفرت تھی۔ وہ تو صرف حیدرآباد ہی میں رہنا چاہتا تھا۔ اسے دولت کمانے اور جمع کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بس وہ ڈاکٹری ہی میں مزید ریسرچ کرنے میں وقت صرف کرنا چاہتا تھا۔ اکلوتا بیٹا اور ایسا ضدی ——— !

راشد نے رو پیٹ کر صبر کر لیا۔ جوان قابل اور خود سر بیٹے کے آگے وہ کیا کر سکتے تھے!

غزل کو اکیلا کمرے میں بیٹھا دیکھ کر رنگما چپکے سے اندر آ گئی۔

"بی بی ——— وہ بچی کو باہر باغ میں بٹھا کر جا رہی ہوں۔ میرا مرد اب اسے نہیں رکھنے دے رہا ہے۔"

غزل دوڑی ہوئی گئی۔ کرانتی بڑے اطمینان سے بیٹھی سوکھے ہوئے پھولوں کی پتیاں چن رہی تھی۔ اتنے دنوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اس کے گھنے سیاہ بال رنگما نے غالباً جوؤں کی وجہ سے منڈا دیے تھے۔ اس لیے اس کی صورت بالکل نہیں پہچانی جا رہی تھی۔

غزل نے اسے اٹھا کر سینے سے لگایا تو وہ بڑے غور سے اسے دیکھنے لگی۔

اسے اب کہاں لے جاؤں ۔ ؟ غزل گھبرانے لگی۔ ———————

——— اور پھر گیٹ کے اندر کار کو آتے دیکھ کر اس نے کرانتی کو مرغیوں کے ڈربے میں بٹھا کر کہا۔

"یہاں چپ چاپ بیٹھی رہنا تو میں روٹی لا کر دوں گی۔"

اور پھر آٹھ دن تک اس نے کرانتی کو مرغی کے خالی کمرے میں چھپا کر رکھا۔

کبوتر مرغیوں کا یہ بڑا سا کمرہ نما ڈربہ ڈیوڑھی کے اس حصے میں تھا جہاں لوگوں کا بہت کم آنا جانا ہوتا تھا۔ مگر بار بار روٹی اور رکابی میں چاول لے جاتے دیکھ کر لنگڑی پھوپو چوکنی ہوگئیں کہ کہیں غزل مرغیوں کے انڈے تو نہیں چرا رہی ہے ہر بار جب غزل کرانتی کو روٹی دینے جاتی تھی تو اسے یا تو سڑک کی طرف ہانک دیتی کہ بچوں سے کھیلتی رہو یا پھر شام ہوتی تو مرغیوں کے ڈربے میں بند کر کے کہتی کہ باہر مت نکلنا ورنہ لوگ تجھے مار ڈالیں گے۔

چار برس کی کرانتی ایسے ہی خطروں میں پیدا ہوئی تھی۔ بندوق کی آوازیں — بھاگ دوڑ — کسی غار میں پناہ۔ روٹی اور پانی کے بغیر صبر کرنا — اسے سب کچھ آتا تھا۔ اب مرغیوں کے ساتھ اندھیرے ڈربے میں روتے روتے سو جانا بھی اس نے سیکھ لیا۔

لیکن لنگڑی پھوپو کو جو تشویش ہوئی تو ایک دن انھوں نے لاٹھی کے سہارے وہاں پہنچ کر مرغیوں کا جھانپا کھولا کہ کتنے انڈے ہیں۔ لیکن وہاں انڈوں میں سے ایک یہ بڑا بچہ بھی نکل آیا تھا۔ ڈر کے مارے ان کی گھگھی بندھ گئی اور پھر ان کی چیخیں سن کر سارا گھر اکٹھا ہوگیا۔

رضیہ اور راشد سخت پریشان تھے کہ یہ بلا کہاں سے نازل ہوگئی۔ جانے کس کی بچی ہے اور کس مقصد سے ان کے گھر میں چھپائی گئی ہے۔ فضا خراب تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو بچی کے بہانے پولیس گھر پر چھاپہ مارے اور تہ خانے کے اندر چھپے ہوئے تمام راز باہر آجائیں۔

سب کی چیخ و پکار سن کر وہ بچی بھی ڈر کے مارے رونے لگی اور غزل سے چمٹ گئی۔ اس میں سے مرغیوں کی گندگی کی بدبو آرہی تھی اور تیز بخار میں کانپ رہی تھی۔

بچی کو غزل کے پاس جاتے دیکھ کر رضیہ کو شبہ ہوا کہ یہ وہی قیصر کی بچی نہ ہو۔ مگر غزل نے بڑی شد و مد سے مخالفت کی اور اس بچی کے الگ ہونے

کے ہزاروں ثبوت دے ڈالے۔ یہ تک کہا کہ قیصر کی بچی تو ایک برس کی تھی بے حد گوری خوبصورت — اب ان غلاظت میں پڑی ہوئی بچیوں کی صورت شکل کس نے یاد رکھی تھی! اس لیے سب چپ ہوگئے۔

شور سن کر شاہین بھی وہاں آیا۔ اس نے بچی کو چھوا۔ اور اپنے کپڑے بچا کر اسے ہاتھوں میں اٹھا کر اندر لے آیا۔ رضیہ کے قالین بچھے ہوئے تخت پر اس گندی بچی کو لٹا کر اس نے دیکھا اور کچھ دوا کھلا کے ایک انجکشن لگا دیا غزال نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور جلدی سے ایک پیالی گرم دودھ لے آئی

پھر اس نے جملہ حاضرین کو مخاطب کر کے ایک بہترین مکالمہ مع ایکٹنگ کے شروع کیا —

"ممانی بیگم — ایک بات سنیے — رات جب میں نماز پڑھ کر سوئی نا! تو میں نے بچی اس بچی کو خواب میں دیکھا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ میں ہوں اور اکیلی بیٹھی رو رہی ہوں۔ اتنے میں نانا حضرت آئے اور ان کی گود میں یہ بچی ہے۔ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ غزل ہماری امانت "ایوان غزل" میں رکھنا — پھر تیرے ماموں کی سب فکریں پریشانیاں دور ہو جائیں گی — تو پھوپو — میں صبح سے سوچ رہی تھی کہ اس خواب کی تعبیر آپ سے پوچھوں"

شاہین ہاسپٹل جا چکا تھا۔ اس لئے خواب کا بیان سنتے ہی سب کے سر عقیدت سے جھک گئے اور غزل اپنی کامیابی کی خوشی میں اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ یوں بھی اب غزل لنگڑی پھوپو کی بھاوج بننے والی تھی۔ اس لیے پھوپو سے لے کر رضیہ تک آج کل اس پر بڑے مہربان تھے لہٰذا لنگڑی پھوپو فوراً اندر گئیں اور اپنی ایک شال لا کر اسے اڑھا دی۔

"اجی دلہن بیگم پھر تو پڑا رہنے دو اس چھوکری کو۔ شاہین بابا کے بچوں کا دل بہلائے گی"۔

رضیہ نے بھی خواب سن کر پلو سنبھال لیا۔

"جانے کس مجبور ماں کی بچی ہے کوئی ہماری سخاوت اور شہرت کا حال سن کر "ایوانِ غزل" میں ڈال گیا ہے۔ اب اس کی حفاظت تو اللہ رسول سے ہم پر فرض ہے۔"

شاہین کو اس بات سے قطعی دلچسپی نہیں تھی کہ یہ کس کی بچی ہے اور کہاں سے آئی۔ لیکن جب وہ گھر میں تھی تو دونوں وقت اسے دودھ پلانا، بسم اللہ بی یا غزل سے کہہ کر اس کی صفائی کروانا اس نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے ___ ؟

"کانتی ___" اس نے تتلا کر کہا۔

"کنیز ___ کنیز کہہ رہی ہے۔ غزل نے جلدی سے کہا۔

"ارے ہائے۔ کسی مسلمان کی ہے۔ باپ بیچارا سرحد پر مارا گیا ہوگا۔ ماں نے بے سہارا ہو کر یہاں چھوڑ دیا ہے"

رضیہ نے ترس کھا کے کہا۔

"بہر حال۔ پولیس میں اطلاع دیدینا چاہیے" تاکہ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔"

راشد نے کہا۔ کیونکہ لاوارث چھوکریوں کو ڈیوڑھیوں میں پالنا کوئی نئی بات نہ تھی۔

بلکہ میرا تو خیال ہے کہ کل اخباروں میں ایک نیوز دے دوں کہ نواب راشد علی خاں نے بے سہارا بچوں کو پالنے کا ایک کیمپ قائم کیا ہے جہاں ہر مذہب کے بچوں کو پناہ دی جائے گی۔ سنا ہے کانگریسی حکومت ایسے کاموں سے بہت خوش ہوتی ہے۔

"میں بھی آپ کے کیمپ میں کام کروں گی راشد ماموں۔" غزل نے بے حد خوش ہو کر کہا۔

"ہاں بھئی تم ہی ان کی دیکھ بھال کرو۔ رات کو اس نگوڑی ماری کو میرے پلنگ کے نیچے سلا دیا کرو۔ لنگڑی پھوپو نے کہا۔

"کہتے ہیں یتیم بچوں پر رحم کھاؤ تو اللہ ستر گناہ بخش دیتا ہے۔"

"گوہر پھوپو ___ آپ نے بھی کوئی گناہ کیا ہے کیا ___ ؟"

شاہین کی اس بات پر سب ہنسنے لگے اور لنگڑی پھوپو کو جانے کیوں رونا آ گیا۔

"ارے یہ کوئی رونے کی بات ہے! یہ تو ہنسنے کی بات ہے۔"

شاہین نے اب غزل سے کہا۔

"اچھا بھئی غزل بیگم۔ اب آپ بتائیے کہ اس بچی کی خدمت کے صلے میں آپ کونسا منافع کمائیں گی؟"

یہ سن کر غزل بھی اپنے آنسو چھپانے اندر بھاگی۔ مگر شاہین ایک ضدی ٹھہرا ___ تھوڑی دیر میں اندر آیا تو غزل کونے میں بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔ وہ اپنے تنگ پینٹ کو سمیٹ کر وہاں اکڑوں بیٹھ گیا۔

"غزل - ایک سچی بات بتاؤ۔ کیا کنیز تمہاری کسی حماقت کا نتیجہ ہے ؟"

"شاہین بھائی ___ ؟" وہ شاہین کا ہاتھ پکڑ کے رو پڑی۔ اور پھر روتے سسکتے کرانتی کی پوری کہانی شاہین کو سنا دی۔

دوسرے دن سب ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے کہ ایک بند لفافہ کسی نے کھڑکی میں سے اندر پھینک دیا۔ راشد سخت گھبرایا۔ آجکل شہر میں ڈاکوؤں کا ایک گروہ آیا ہوا تھا جو "بنگالی بابو" کہلاتے تھے۔ یہ لوگ پہلے ایک خط بھیجتے تھے کہ اتنی رقم فلاں جگہ رکھ دو ورنہ جان کی خیر نہیں۔ اور پھر سچ مچ مار ڈالتے تھے۔

اس لئے سب ہی کھانا چھوڑ چھاڑ کھڑے ہو گئے۔ رضیہ نے سب کو منع کیا کہ لفافہ مت کھولو۔ کیا پتہ اندر بم چھپا ہو۔ مگر کرانتی دوڑتی ہوئی گئی اور لفافہ اٹھا کر اسے پیار کرنے لگی۔

"پھوپو ___ پھوپو جی ___ ؟" وہ غزل کو لفافہ تھمانے لگی۔

غزل ڈر رہی تھی کہ اس کے گھر والے عاشق کو پھر تنگ نہ آئی ہو۔ اس لئے اس نے کرانتی سے لفافہ لے لیا۔ مگر راشد نے لفافہ کھول ڈالا۔ اور سب کو زور زور سے سنانے لگا۔ خط سنجیوا کا تھا۔ چاند کے نام۔

صرف چاند

آج سات برس بعد میرا خط دیکھ کر اس پر تھوک مت دینا میں سمجھتا تھا کہ تمہاری محبت سے بھی اونچا میرا مقصد ہے جو مجھے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ میں پوری چاند کو کبھی حاصل نہیں کر سکوں گا۔

اس وقت بھی نہیں جب تم خود میری باہوں میں گر جاتی تھیں۔ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیتیں۔ تب بھی میں سوچتا تھا کہ تم "ایوان غزل" کی ایک مرصع نظم ہو اور زندگی کی تلخ و سنگین حقیقتوں کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ اس لئے تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔ اس وقت تک۔ جب تک میں اس قابل نہ ہو جاؤں کہ تمہارے نرم و نازک بدن کو زمانے کی بے رحمی سے بچا سکوں۔ مجھے اس راستے میں بڑی مشکلیں ملیں۔ ہر طرف بند دیواریں تھیں اور ہر موڑ پر خطرے۔ گمان خطرہ میں گھرنے کے باوجود ہم تھوڑی دیر کے لیے ٹھنڈی چھاؤں ڈھونڈ لیتے تھے۔

قیصر مجھے ایک ایسے ہی اندھیرے غار میں ملی تھی جہاں پھانسی کے پھندے ہمارے منتظر تھے۔ ایسے میں ہم ایک دوسرے کے ہو گئے۔ اس میں صرف قیصر کا ایثار تھا کہ وہ ایک ایسے مرد کو قبول کر بیٹھی جو اسے کوئی خوشی تو درکنار، اپنی زندگی کا یقین بھی نہیں دے سکتا تھا ایسے میں کرانتی ہمارے درمیان آ گئی۔ شاید وہ ہمارے عزم کو چیلنج کرنے آئی تھی۔

تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ قیصر جو ہماری اور تمہاری کہانی سے پوری طرح واقف تھی کرانتی کو اپنے ہاتھوں تمہیں سونپ آئی۔ وہ کہتی تھی کہ کرانتی بڑی ہو گی تو چاند ہی اسے بتا سکے گی کہ اس کے ماں باپ کون تھے۔

اور آج میں بھی تمہیں یہی بات سنانے کے لئے خط لکھ رہا ہوں کیونکہ کل قیصر کو سکندرآباد جیل میں پھانسی دیدی گئی۔ میں بھی شاید اب زیادہ دنوں روپوش نہ رہ سکوں۔

جب کرانتی بڑی ہو جائے تو اسے "ایوان غزل" کی تاریخ ضرور سنانا۔ کیونکہ وہ قیصر کی کہانی ہے۔ حیدرآباد کی ڈیوڑھیوں میں پلنے والی ہر لونڈی کی کہانی ہے۔ میں کون تھا! یہ بھی کرانتی کو تم ہی بتا سکتی ہو۔ اچھا تو تمہارے ان سب خوبصورت بچوں کو پیار جو میرے خیالوں کی طرح حسین ہوں گے اور تمہارے اس احمق شوہر کو سلام جو اس غلط فہمی میں ہو گا کہ چاند اس کے پاس ہے آخر میں تمہارے اس بے پناہ حسن کو سلام کرتا ہوں جس نے مجھے ساری دنیا سے محبت کرنا سکھا دیا۔

تمہارا

سنجیوا۔

" اچھا تو یہ وہی حرامی چھوکری ہے۔ زہر کی پڑیا۔ " لنگڑی پھوپھو اسے مارنے لپکیں۔

" اس لڑکی کو تو فوراً گھر سے نکال دینا پڑے گا۔ ورنہ جانے کیا آفت آ جائے گی۔ — راشد نے گھبرا کر کہا۔

" لیکن یہ مری ہوئی چھپکلی تو نہیں ہے کہ اٹھا کر کوڑے میں پھینک دیں۔ ؟" شاہین نے طمانیت سے انڈا کھاتے میں کہا۔

"اور نہیں تو کیا۔؟" رضیہ نے جل کر کہا۔

"یہ تو طاعون کا چوہا ہے۔ اللہ بچائے اس بدذات سے۔"

رضیہ کا بس چلتا تو ابھی اٹھا کر اس کالی چھوکری کو سڑک پر پھینک دیتی

"میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں کہ ایک لاوارث بچی یہاں آگئی ہے اسے لے جائیں"۔ راشد کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

شاہین نے غزل کی طرف دیکھا جو کرانتی کو دونوں ہاتھوں میں تھامے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جیسے کرانتی کے ساتھ اسے بھی سڑک پر پھینک دیے جانے کا حکم ملا ہو۔

"لیکن کرانتی کہیں نہیں جائے گی۔ وہ یہیں رہے گی۔" شاہین بڑے اطمینان سے کھانا کھائے گیا۔

"کیا۔۔۔؟" راشد نے سخت غصے میں کہا۔

اس معاملے میں تمہارا کیا بیچ ہے۔"

"بس ہے۔" شاہین نے نہایت لاپروائی سے کہا۔

اور اگر کسی نے کہہ دیا کہ ہمارے ہاں ایک لڑکی چھپائی گئی ہے تو سارے خاندان کی ناک کٹ جائیگی۔ تمہاری ڈاکٹری داکٹری سب دھری رہ جائے گی۔

"رہ جائے۔ مزدوری کریں گے۔" شاہین لاپروائی سے چائے بنانے لگا۔

"مگر کرانتی کہیں نہیں جائے گی۔ وہ چاند آپا کی یادگار ہے۔"

"انکل ہاہا۔" کرانتی زمین پر بیٹھ کر چیونٹیوں کو مارنے لگی۔

"۔ وہ چاند کی یادگار ہے تو چاند کے باپ سے کہو اپنی بیٹی کی نشانی یہاں سے لے جائیں۔" رضیہ نے اب کی بار ذرا ارسان سے کہا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ شاہین سے بحث میں جیتنا مشکل ہے۔

"واہ ہم کیوں انھیں دیں گے۔ کرانتی کو ہم خود پالیں گے۔"

راشد نے رضیہ کی طرف دیکھا اور پھر لنگڑی پھوپو کی طرف۔ اتنا بڑا چھ فٹ کا ڈاکٹر بیٹا سامنے بیٹھا ہو تو آدمی کیسا بے بس ہو جاتا ہے۔ اس کی پڑھائی پر راشد نے پورے پچاس ہزار خرچ کئے تھے۔ مگر وہ کیسا نکما نکلا ۔۔۔

عقل اور چالاکی تو اسے چھو کر نہیں گئی تھی۔ بھلا کوئی امریکہ پلٹ ڈاکٹر گاؤں میں جانے پر اصرار کرے گا! مگر وہ کر رہا تھا۔ اسے ہندوؤں سے ڈر نہیں لگتا تھا اور ہندوستان سے باہر جانے کو تیار نہیں تھا۔ حالانکہ راشد چاہتا تھا کہ وہ یا تو امریکہ لوٹ جائے ورنہ پاکستان چلا جائے۔ مگر وہ حیدرآباد چھوڑنے کو تیار نہیں ہوا۔ رضیہ چاہتی تھی کہ شاہین یورپ سے ایک میم بیاہ لائے تاکہ وہ فرنگی پوتے پوتیوں کی دادی کہلائیں۔ مگر وہ ہر بار یہی جواب دیتا کہ امی یورپ کی عورت ہم ہندوستانیوں کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح راشد نے روپیہ کمانے کی جتنی تجویزیں رکھیں وہ سب کو رد کرتا گیا۔ حیدرآباد میں ہارٹ اسپشلیسٹ اس وقت ایک دو کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اس لیے راشد نے سوچا تھا کہ شاہین ملازمت کے ساتھ ایوان غزل کے باہر والے حصے میں اپنا پرائیویٹ کلینک بھی کھول لے۔ مگر شاہین اس پر بھی تیار نہ ہوا کہ میں بیک وقت اتنے مریضوں پر توجہ نہیں دے سکوں گا۔

اور آج وہ پھر ضد کر رہا تھا کہ کرانتی اسی گھر میں رہے گی ادھر غزل جانے کیوں کرانتی کی دیوانی تھی۔ جیسے کرانتی اس کی بیٹی ہو۔ آج بھی غزل نے جلدی سے کہا۔

"ممانی بیگم میں کرانتی کو اپنے کمرے میں چھپائے رکھوں گی۔ آپ اطمینان رکھیے"

اور وہ سچ مچ ہر وقت اپنے کمرے میں کرانتی کو بند رکھنے لگی۔

لیکن اب کرانتی بڑی شریر ہو چکی تھی۔ شاہین کے پلائے ہوئے ٹانگو

نے اسے کافی صحت مند بنا دیا تھا۔ اس لئے وہ بند دروازے کے کواڑ پیٹ کر چلاتی تھی۔

"گجو آنٹی مجھے پیشاب آرہا ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ جلدی دروازہ کھولیے۔

"چپ حرام زادی۔ اب چپتی ہے یا تیرا گلا گھونٹ دوں۔"

لنگڑی پھوپو کی ڈانٹیں سن کر وہ اور شور مچاتی۔

چپ حرام زادی بڈھی۔ ابھی آکر تجھے لکڑی ماروں گا۔

ایک دن فوزیہ "ایوان غزل" آئی تو اس کے ساتھ اس کی ایک نند ریحانہ بھی آئی۔ ریحانہ پاکستان میں بیاہی تھی۔ اجالا بیگم کے خاندان میں۔ اس نے رضیہ، لنگڑی پھوپو اور غزل کو وہاں کے حالات سنائے۔ اجالا بیگم جتنی جائیداد یہاں چھوڑ گئی تھیں اتنی ہی پاکستان گورنمنٹ سے حاصل کر لی تھی۔ اور پہلے سے زیادہ ٹھاٹ باٹ میں تھیں۔ بی جانی ٹی۔ بی سے مر چکی تھی۔ نصیر پاکستان کا بہت مشہور شاعر بن گیا تھا۔ اور بڑے ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ احمد حسین نے پاکستان جاتے ہی دنیا کی تمام رنگینیوں سے توبہ کر لی تھی اور اب داڑھی رکھ کر جماعت اسلامی کے ممبر بن گئے تھے۔ مگر تبلیغی جماعت کا کام کرتے

تھے۔ پھر ریحانہ نے کہا۔

ایک بار نصیر بھائی نے شرط لگائی تھی کہ غزل کی شادی کبھی نہیں ہوگی۔۔۔؟

کیوں۔۔۔؟" غزل نے چونک کر پوچھا۔

"میں کیا جانوں!" ریحانہ نے لاپرواہی سے کہا۔

یہ شاعر لوگ ایسے ہی سرپھرے ہوتے ہیں نا۔۔۔ بس کوئی بات دل میں سوچ لی اور اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔"

ہاں یہ شاعر سرپھرے ہوتے ہیں۔۔۔ وہ بھی بڑا سرپھرا تھا۔۔۔ جانے کس مجبوری کے تحت اس نے شادی کی ہوگی۔ لوگ کہتے ہیں اجالا بیگم بڑی جلاد ہیں۔۔۔ وہ پہروں روتا ہوگا۔۔۔ راتوں کو مجھے خوابوں میں ڈھونڈتا ہوگا۔۔۔ میری کھوج نے اسے اتنا بڑا شاعر بنا دیا۔۔۔ وہ سوچتا ہوگا میں اس کی راہ دیکھ رہی ہوں۔۔۔ دیکھے جاؤں گی۔۔۔ کیونکہ وہ انگوٹھی میرے ہاتھ میں ہے۔ جو اجالا بیگم کی بہو کے لیے تھی۔۔۔ چاہے وہ دس بچوں کا باپ بن جائے۔۔۔ مگر اسے یقین ہے وہ صرف میرا ہی ہے۔ میں جو اس کے لیے بن باس لیے بیٹھی ہوں۔ زندگی کا زہر گھونٹ گھونٹ پی رہی ہوں۔

ساری رات غزل نصیر کے خواب دیکھتی رہی۔

مگر صبح شیخو بھائی نے اسے دیکھ کر ایک نہایت فحش قسم کا شعر پڑھا تو اس کا جی چاہا کہ ابھی اس کا نکاح شیخو بھائی سے ہو جائے۔۔۔ تاکہ نصیر ایک دن آئے تو وہ بھی اس زہر کا مزہ چکھے۔۔۔

انھوں نے غزل کو خوب ڈانٹا۔

ایک مہینہ گزر گیا ۔ شاہین اس قصے کو بھول چکا تھا کہ ایک بار جب سب سو چکے تھے ۔ غزل اس کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔

"شاہین بھائی ——— میرا ایک کام کریں گے آپ؟"

"کیا کام ہے ———؟" شاہین نے غور کیا کہ غزل شاید کئی دن سے رو رہی تھی۔

"ایک بار مجھے کسی طرح کرانتی کو دکھا دیجیے۔"

دوسرے دن شاہین کئی گھنٹوں تک غزل کو کار میں بٹھائے مارا مارا پھرا دو چار پولیس اسٹیشن چھانے۔ پھر کسی منسٹر سے بات ہوئی ۔ آخر اس دھرم سالے کا پتہ مل گیا۔

کرانتی بچوں کی قطار میں رکابی ہاتھ میں لیے کھڑی چلا رہی تھی۔

"جلدی کھانا دو نہیں تو اس رکابی سے تمہارا سر پھوڑ دوں گا۔"

شاہین نے دھرم سالے کے منیجر سے الگ لے جا کر بات کی ۔ ایک ہزار روپے اس کی مٹھی میں دبائے اور کرانتی کو اپنے ساتھ کار میں بٹھا دیا۔

مگر اب کرانتی کو گھر لے جانا ٹھیک نہیں لگ رہا تھا ۔ اس لیے شاہین اسے اپنے کلینک لے گیا اور رات کی ڈیوٹی والی نرس کو بلوایا

"یہ ایک لاوارث بچی ہے سسٹر ——— یہیں رہے گی ——— تم اس کی حفاظت کرو گی۔"

"ہم کیا کریں گے ڈاکٹر، یسوع مسیح کریں گا۔"

سسٹر سمجھ گئی یہ لڑکی اس خوبصورت نوجوان ڈاکٹر کی کوئی حماقت ہے

"نمسکار نہیں آنکل ——— میری رکشا بھگوان کریں گے ۔ میری ادوم۔ میری ادھم ۔۔۔" ننھی سی کرانتی نے شاہین سے کہا۔

دوسرے دن شاہین کرانتی کے ساتھ گیند کھیل رہا تھا تو پھاٹک پر بہت سے آدمیوں کا شور ہونے لگا ۔ چالیس پچاس آدمی مل کر چلا رہے تھے۔ سب ہی گھبرا کے بھاگے ۔ معلوم ہوا محلے کے کچھ ہندو پولیس کو ساتھ لے کر آئے ہیں کہ یہاں ایک ہندو لڑکی مسلمانوں نے چھپالی ہے ۔ ان لوگوں کی قیادت ملیشم کر رہا تھا۔

"اللہ خیر ——— غضب ہو گیا ۔ اب کیا ہوگا؟" رضیہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

راشد اور شاہین نے ان لوگوں کو بہت سمجھایا کہ کرانتی چاند کی لڑکی ہے اور سنجیو اسے اس کا بیاہ ہو گیا تھا ۔ مگر پولیس والے نہ مانے اور اس معاملے کی مکمل تحقیق ہونے تک کرانتی کو اپنی تحویل میں رکھنے کے لیے لے گئے۔

خس کم جہاں پاک ——— رضیہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

چھ سال کی کرانتی بری طرح چلا رہی تھی کیونکہ وہ پولیس والوں سے بہت ڈرتی تھی ۔ اسے روتے دیکھ کر غزل بھی رو رہی تھی۔

"کم بخت تھوڑی دیر میں چپ ہو جائے گی ۔ اب اس مسئلے میں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" لنگڑی پھوپو نے سب کو جتا دیا۔

"تو کیا ہم کرانتی کو پولیس کے حوالے کر دیں گے؟"

شاہین سخت خفا تھا

رات بھر غزل روتی رہی ۔ اس نے کھانا نہیں کھایا۔

صبح شاہین ہاسپٹل جانے سے پہلے کار میں پولیس اسٹیشن گیا معلوم ہوا کرانتی ہندو ۔ دھرم سالے میں بٹھا دی گئی ہے۔

لنگڑی پھوپو نے سنا تو بڑا اطمینان ہوا۔

اچھا ہوا ہندو باپ کی بیٹی ہندو دھرم سالے میں ——— اب تم تو رو ۔ نہیں تو لوگ سمجھیں گے تم نے ہی کرانتی کو جنا تھا۔

شاہین کو سخت تعجب ہوا - صرف ایک مہینے میں دھرم سالے والوں نے کرانتی کو کیسا پکا ہندو بنا دیا تھا! راستے بھر وہ شاہین اور غزل کو پاپ اور پُن کا فلسفہ سمجھاتی رہی - اس نے بھجن سنائے اور شاہین کو سمجھایا کہ اس سنسار کی نیو شیو بھگوان نے رکھی تھی -

"بس بس خاموش " غزل نے غصے میں کہا

اور پھر غزل نے نرس سے کہا -

" اس بچی کو دھرم سالے والوں نے بالکل ہندو بنا دیا ہے - میری تم ذرا اس بات کا خیال رکھنا "

غزل آنٹی ، آپ مجھے بھگوان کرشن کی ایک مورتی لا دیجیے میں اسے اپنے کمرے میں سجاؤں گی -"

"کل سے میں یہاں آکر تمہیں نماز اور قرآن شریف پڑھایا کروں گی" غزل نے اس کی بات ان سنی کر کے کہا -

دو تین دن کے بعد غزل نماز سکھانے کی کتاب اور "یسرنا القرآن" لے کر کلینک گئی تو میری کرانتی کے سینے پر کراس بنا کر اسے دعا پڑھنا سکھا رہی تھی -

غزل اسے پڑھانے بیٹھی تو کرانتی سارے کمرے میں پاؤں پٹکتی پھرنے لگی -

" میں اب کچھ بھی نہیں پڑھوں گا - کبھی بھگوان مجھے ناش کر دیں گے کبھی یسوع مسیح مجھے معاف نہیں کریں گے - غزل آنٹی یہ اللہ بھگوان اور یسوع مسیح ، سب لوگ بچوں کے پیچھے کیوں پڑ جاتے ہیں ــــ ؟"

"چُپ چپ ــــ اللہ کے نام سے بے ادبی نہیں کرتے - ایسی باتاں کیے تو اللہ میاں تمہیں دوزخ میں ڈال دیں گے" غزل کو یاد آیا کہ اسے بچپن میں اماں بھی دوزخ کے عذاب سے ڈرایا کرتی تھیں -

" تو پھر میں اللہ میاں کی تعریف کیوں کروں آنٹی ــــ ؟"

"دہریوں کی اولاد ــــ" غزل نے دل میں سوچا -

یہ لڑکی کیسی ضدی ہے - کتنی سرکش ہے - بالکل اپنی ماں پر گئی ہے مگر صورت دیکھو تو سنجیوا یاد آتا ــــ وہی سانولی رنگت - سفید دانت - بڑی بڑی آنکھیں اور سر پر گھنگریالے بالوں کا جھنڈ ــــ جانے اس آدمی میں کیسا سحر تھا جو چاند جیسی ماہ پارہ کو اس کا دیوانہ بنا گیا تھا - وہ سنجیوا کا پھینکا ہوا سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر اپنے گالوں سے لگائیں - اس راستے کو سارا دن تکے جاتی تھیں جدھر سے شام کو سنجیوا آنے والا تھا -

اتنے انتظار کے بعد بھی وہ آتا تو چاند کے نشے میں چور بدن اور سولہ سنگار کو نگاہ بھر کے دیکھنے کی بھی فرصت نہ ملتی - اسے کسی نہ کسی ضروری کام پر جانا ہوتا - اس کی ایک نظر گھڑی پر ہوتی اور ایک چاند پر - وہ یوں جلدی جلدی ہنس ہنس کر چاند سے باتیں کرتا جیسے کوئی فرض پورا کر رہا ہو - پھر جب وہ چاند کو اس کے عاشقوں کے جمگھٹے میں چھوڑ کر چلا جاتا تھا تو چاند ساری دنیا سے منہ موڑ کے اپنی باہوں میں منہ چھپا لیتی تھی -

وہ تیزی ــــ طراری ــــ دو ٹوک بات کرنے کی عادت کرانتی میں بھی آئی تھی - وہ کسی بھی بات کے اوپری جمالیاتی پہلو کو بہت کم دیکھتی تھی - ہر بات کی اصلیت کی کھوج میں رہتی - شاہین اور غزل سے مسلسل سوال کر کے اسے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ "ایوان غزل" میں نہیں رہ سکتی - اس کا کوئی گھر نہیں ہے - ماں باپ نہیں ہیں - اس لیے اسے چپ چاپ میری سسٹر کی ہر بات مان لینا چاہیے - مگر وہ میری سسٹر کی کوئی بات نہ مانتی تھی ــــ روز صبح جب شاہین کلینک آتا تھا تو میری نہایت مظلوم صورت بنائے کرانتی کے جرائم کی رپورٹ سناتی -

اُس نے ہم کو گالی دیا ـــــ ہماری بیر کی بوتل توڑ دیا ـــــ رات کو کھانا نہیں کھایا ـــــ دوا پھینک دیا ، اندھیرے میں اکیلا سڑک پر چلا گیا ـــــــــــــــــــــــ

"اچھا ـــــ آج میں اسے ڈانٹوں گا ۔"

مگر شاہین جانتا تھا کہ کرانتی کی رگوں میں دوڑنے والا خون ڈانٹیں نہیں سنا کرتا ۔

برسات شروع ہوچکی تھی ۔

حیدرآباد کی برسات کہ آج شام کو بارش ہوئی تو کل بھی اسی وقت ہوگی اور پرسوں بھی اسی وقت آجاتی ۔

شاہین باہر جانا چاہتا تھا مگر بار بار آسمان کو دیکھ کر پلٹ آیا اور ورانڈے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر صبح کے پڑھے ہوئے اخبار ایک بار پھر پڑھنے بیٹھ گیا ۔۔

آداب عرض کرتا ہوں ڈاکٹر صاحب ۔ مزاز شریف ـــــ ؟ شیخو میاں اوپر آئے اور جھک کر نہایت جاگیردارانہ انداز میں سلام کیا ۔

"او ہو شیخو بھائی آج کدھر آنکلے اتنی بارش ہیں" ۔ شاہین شیخو بھائی کو بھولا نہیں تھا ۔ کیوں کہ شیخو بھائی گھر کے ہر بچے کو یاد تھے ۔

وہ گرمیوں کی رات کو آیا کرتے تھے ۔ نوکروں والی کوٹھری میں رات کو سویا کرتے ۔ اور گھر کی کوئی نہ کوئی چیز لے کر فرار ہو جایا کرتے تھے ـــــ اس لیے ابّا ان کے فرمان کے بموجب ان کا داخلہ آنگن والے دروازے تک محدود تھا ۔ شیخو بھائی بھی اپنے حدود سے واقف تھے ۔ اس لیے جب کبھی بھوک یا پانی سے مجبور ہوکر انھیں لنگڑی پھوپو کو بلانا ہوتا

تو وہ دروازے سے ہی چلاتے تھے۔

مگر آج شیخو بھائی کو وارنڈے میں آنے کی اجازت کیسے مل گئی!
شاہین کو تعجب تھا۔

"اور سنائیے شیخو بھائی آپ کی سیاسی سرگرمیوں کا کیا حال ہے؟"

اجی کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب — خوم کی خاطر بڑی مصیبتاں اٹھانا پڑ رہی ہیں۔ مسلماناں بچارے کتنے برباد ہوگئے ہیں۔ انھیں بچانا اب ہمارا کام ہے۔"
شیخو بھائی شروع ہو گئے۔

"دیکھو بابا — اب تک دس خاندانوں کو ان کی دولت کے ساتھ پاکستان بھجوادیا ہوں۔ صرف نواب عظیم الدین خاں دس لاکھ روپے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ ادھر غریب مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ہم نے کیمپ لگائے ہیں۔ انڈین گورنمنٹ نے مجھے اس کا گتہ دیا ہے۔ اس واسطے شاہین بابا آج کل اپن تو مزے میں ہیں۔"

"ارے ہٹاؤ شیخو بھائی ان باتوں کو۔ کچھ اور سناؤ آج کل گڑ ہی کا کیا بھاؤ ہے — ؟"

"ہاہاہا —" شیخو بھائی ہنسنے لگے۔ "کیا ڈاکٹر پاشا کبھی ایک روپیہ بھی نہیں دیتے کہ شیخو بھائی آج ہماری طرف سے اپنے منھ کا مزہ بدل لے۔"

"لیکن میں نہیں چاہتا کہ آپ خودکشی کریں۔ گڑ مبہ تو آپ کے لیے زہر ہے۔" شاہین اچانک ڈاکٹر بن بیٹھا۔

"اجی چھوڑو میاں — زہر تو جانے کہاں کہاں ہے۔ آپ زہر پھیلنے سے کیسے روکیں گے — ؟" شیخو بھائی نے غزل کی طرف اشارہ کر کے کہا "چھوٹے نواب۔ آپ کی ڈیوڑھی میں جو زہر پھیل گیا ہے اس کا کیا علاج کریں گے ڈاکٹر صاحب۔؟"

شاہین نے نظریں اٹھائیں۔ غزل اندر کمرے میں دروازے کا سہارا

لیے کھڑی تھی کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی — شاہین نے سوچا اس زہر کا خوف شیخو میاں پر بھی طاری ہے۔ یہ زہر جو خود شیخو میاں کی زندگی میں پھیل گیا ہے جو لنگڑی پھوپو کی جوانی کو راکھ کر گیا — جو بی بی کو عمر قید کی سزا دلا چکا ہے — چاند کو قبر میں سلا گیا — اور آج غزل بن کر "ایوان غزل" میں سرایت کر چکا تھا۔ یہ زہر کہاں سے آیا — شاہین کے ڈاکٹر ذہن نے اس وجہ کو تلاش کرنا شروع کیا جو "ایوان غزل" کو ہلا چکی تھی — کوئی ایسی بات ہوئی تو رہی جو اس ڈیوڑھی کی عورتوں کو زندگی سے مسلسل الرجی ہوتی گئی — دولت — شاہین نے جیسے زمین کی تہوں میں کچھ کھوجتے ہوتے سوچا — دولت جو دکن کے جاگیرداروں کے لیے امرت بھی تھی اور زہر بھی — انھوں نے زندگی بھر اس امرت کو پیا اور اسی کے ایک گھونٹ نے ان کا کام تمام کر دیا — "ایوان غزل" کے مکینوں نے دولت کے پیڑ اگائے — دولت کے محل بنائے اور دولت کے شامیانے اپنی قبروں پر تان دیئے — مگر "ایوان غزل کے بڑے ہال" "بیت الغزل" میں ان حضرات کے جو فوٹو لگے ہوتے تھے ان میں وہ دولت مند نہیں تھے۔ صرف شاعر تھے — شاعری — جس نے ان سب کو زندگی بھر بیقرار رکھا — وہ محبوبہ کی ایک ادا پر اپنی زندگی کے داؤ لگاتے رہے — انھوں نے ہر محبوبہ کو یقین دلایا کہ وہ دل کے ساتھ جان بھی اس کی نذر کر رہے ہیں اور اس کے لیے وفا، یقین اور رفاقت کے تحفے لا رہے ہیں۔ وہ بچاری کھڑی ہے — منتظر آنکھوں میں حیرانیاں سمیٹے —

آج غزل کے چہرے پر کیسی موہنی تھی۔ دل میں برچھی کی انی بن کر چھبنے والی کشش — جانے کیوں اس وقت شاہین کو غزل کبھی چاند آپا معلوم ہونے لگی کبھی بی بی — کوئی بات ضرور تھی جو ادھر دیکھ کر دنیا اندھیری اندھیری سی لگتی ہے — جانے آج شاہین کی آنکھوں کو کچھ ہوگیا تھا یا پھر یہ خون کا

اثر تھا جو شاہین کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ ورنہ یورپ میں پانچ برس گزار کے اس نے بھی عورت کے حسن کے سارے مزے چکھے تھے۔ وہ اپنے دادا اکٹھے دادا کی طرح اتنا تر سا ہوا نہ تھا کہ حسن کی ایک جھلک پر دیوان سیاہ کرنے بیٹھ جاتا مگر آج اسے لگا کہ غزل میں کوئی بات ضرور ہے جو زہر کی طرح مرد کے جسم میں سرایت کر جاتی ہے۔

نصیر چچا نے بچاری کو بڑا دھوکہ دیا ــــ ان سب مردوں نے اسے ہرا دیا جن کے پیچھے وہ بھاگتی رہی۔

بچپن میں غزل کیسی تیز طرار تھی کہ دنیا بھر کو چلانے والا شاہین بھی اس کے آگے مات کھا جاتا تھا۔ اس نے شاہین کو رنگین فوٹو والی کہانیاں چبانے کا گر سکھایا تھا۔ نالے الانگھنے کا۔ کھانے پینے کی چیزیں چرانے کا۔ ابا کے سامنے جھوٹ بولنے کا ــــــــــــــــــــ شاہین کے سامنے بہت پرانے دن سمیلنے لگے جب غزل ناشتے کی میز پر جی بھر کے ٹھڑ دسنے کے بعد نیچے گرے ہوئے چاول اٹھا اٹھا کر کھاتی تھی۔ دانت اور منہ دھوئے بغیر ناشتے کی میز پر آ بیٹھتی تھی۔ بغیر چڈی پہنے کھیلتی ــــ اور ہر بات پر اسے ہنسی آتی تھی۔ مگر اب تو وہ ہر وقت بس آنسو سی پوچھتی نظر آتی ہے۔ شاہین کی بچپن سے عادت تھی غزل کو چھیڑنے ستانے اور جلانے کی۔ مگر اب وہ جوابی حملہ کرنے کی بجائے ٹھنڈی سانس لے کر منہ پھیر لیتی تھی۔

"آپ نکو گھبراؤ ڈاکٹر صاحب ــ یہ زہر پینے کو اب میں تیار ہوں"۔ شیخو بھائی نے اسے یوں سوچ میں گم دیکھ کر کہا۔

چار چوٹ کی مار دے تو ایک دن میں سیدھی ہو جائے گی۔"

"کون ــــ؟" شاہین نے چونک کر پوچھا۔

"یہی غزالہ بیگم ــ میں بھی بانے دو بول کے، کہے رہا ہوں۔ کیا کروں؟ راشد نواب کے سر کا بوجھ بھی تو کچھ کم کرنا ہے نا ــ؟"

"کیا آپ کر رہے ہیں غزل سے شادی ــــ؟" شاہین چونک پڑا

"سچی بات کو کیا ہے۔ میں تو راضی نہیں ہوں میاں۔ مگر راشد دولہن بولے تو اب انکار کیسے کرنا۔ آپ ہی بولو ــــ؟"

شیخو بھائی چلے گئے تو وہ سیدھا امی کے پاس پہنچا۔

"امی کچھ دن کے لیے فوزیہ کو بلا لیجیے۔ غزل کی خاموشی سے تو میرا گھر میں رہنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"اب اپنی دلہن سے جی بہلانا بابا ــ" لنگڑی پھوپو نے آنکھیں مٹکا کر بڑے ناز سے کہا۔ زندگی میں ایسے موقعے بہت کم آ تھے جب لنگڑی پھوپو مسکرانے لگیں۔

"ایسی چاند سی دلہن ڈھونڈ رہی ہوں کہ اس کی صورت تکے جانا۔"

"ارے توبہ ــ صرف دیکھنے کے قابل دلہن ہوگی ــ؟ ارے بھئی امی آپ کہیں میری دلہن کا انتخاب لنگڑی پھوپو کو مت سونپ دینا۔ اگر صورت ہی دیکھنا ہے تو میں غزل کا ایک اسٹیچو بنوا لوں گا۔" اس بات پر سب ہی ہنس پڑے۔ سوائے غزل کے جو زیادہ سنجیدہ ہو کر سینے کی مشین پر جھکی اپنے جہیز کے کپڑے سی رہی تھی۔

"اور نہیں تو کیا ــ غزل کی بولنے والی کل تو بگڑ ہی چکی ہے۔ اب تو وہ اپنے آپ کو خود ہی پتھر کا مجسمہ بنا رہی ہے"۔

مرد اتنے احمق کسی وقت نہیں ہوتے، جتنے وہ کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھتے وقت ہو جاتے ہیں۔ اب ذرا دیکھیے تو کہ اتنی بارش طوفان کی پُر شور دوپہر اور شاہین جیسا تجربہ کار ڈاکٹر جس نے عورت کا ہزار بار ڈسکشن کیا تھا۔ مگر پھر بھی اسے غزل میں آج کوئی ایسی چیز نظر آ رہی تھی کہ وہ مسلسل دو گھنٹے تک اپنی امی سے غزل کے ٹاپک پر باتیں کرتا رہا۔ وہ بھی اس طرح کہ اس کی نظریں صرف غزل پر تھیں۔ مشین چلاتے ہوئے اس کے

خوب صورت ہاتھوں پر۔ بند لبوں پر — اُداس آنکھوں پر — اور ان الجھے الجھے نیل سے بے نیاز بالوں پر جنھوں نے اس کے چہرے کی دل کشی کو اور بڑھا دیا تھا۔

اس دن بیچارے دل کے درد اور بلڈ پریشر کے مارے ہوئے مریض گھنٹوں کلینک میں بیٹھے کراہتے رہے۔ صبح کا اخبار یوں ہی پڑا رہا اور راشد بار بار اندر باہر گھوم گھوم کے شاہین کو یاد دلاتا رہا کہ اب اٹھ کر کلینک جاؤ۔ مریض انتظار کر رہے ہوں گے۔ یورپ جانے اور ڈاکٹر بننے کے باوجود اس لڑکے کو وقت کی قدر کرنا نہیں آئی۔ بھلا کسی اتنے مشہور ڈاکٹر کے پاس اتنا فضول وقت ہوگا کہ وہ محض گپ بازی میں دو گھنٹے گزار دے۔ رات کو گیارہ بجے جب مریضوں کو نبٹا کر شاہین گھر لوٹا تو غزل شیخو بھائی کا کھانا میز پر رکھے جاگ رہی تھی۔ کیوں کہ لنگڑی پھوپو کا حکم تھا کہ جب تک شیخو آ کر کھانا نہ کھا لیں غزل کو جاگتے رہنا چاہیے۔

"آج کل شیخو بھائی کی بڑی خاطر مدارت ہو رہی ہے۔ کیا جنت میں بنگلہ ریزرو کروانے کا ارادہ کر لیا ہے!"

یہ سنتے ہی غزل میز پر جھک کر رونے لگی۔ سب سو چکے تھے۔ بارش اور سردی کی وجہ سے لنگڑی پھوپو نے بھی اپنا کمرہ بند کر لیا تھا۔ باہر بارش کا شور مچا ہوا تھا۔ اس وقت شیخو بھائی کسی نالی میں بے ہوش پڑے ہوں گے۔ اسی لیے کسی کو خبر نہ ہوئی — ورنہ غزل کا رونا اور شاہین کا پہلی بار اسے باہوں میں بھر کے سمجھانا۔ جانے کیا غضب ڈھاتا۔ رضیہ نے تو اسے دوپہر ہی ڈانٹ دیا تھا کہ غزل جیسی آوارہ چھوکریوں کے مسائل پر اسے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

"مجھے ایک زہر کا انجکشن دے دو شاہین۔ بھائی اگر تم کو مجھ سے ذرا

بھی ہمدردی ہے تو اپنے کلینک سے میرے لیے تھوڑا سا زہر لا دو۔"

"مگر کیوں غجو — تم نے کوئی قصور نہیں کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اور چاند آپا کو گھر والوں نے مارا ہے۔"

"نہیں مجھے کسی نے نہیں مارا —" اس نے شاہین کے ہاتھ اپنے کاندھوں سے ہٹا کر کہا۔

"میں خود مرنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں — ؟ دنیا سے ڈرتی ہو — ؟" شاہین کے ہاتھ اب اس کے آنسوؤں میں بھیگے ہوئے گالوں پر تھے۔ اور اس نے غزل کا چہرہ اوپر اٹھا رکھا تھا۔

"اب دنیا میرا اور کیا بگاڑے گی جو دنیا سے ڈروں — ؟ میں صرف شیخو بھائی سے ڈرتی ہوں۔" یہ کہتے کہتے اس پر غشی سی چھانے لگی۔

اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھایا۔ اس کے بستر پر لٹا کے انجکشن دیا۔ اور کمرے کا دروازہ بھیڑ کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

دوسرے دن "ایوان غزل" میں بڑا پرشور طوفان آیا۔

شاہین نے اپنی شخصیت کی تمام اہمیت کو سمیٹ کر کھانے کی میز پر اعلان کیا کہ وہ غزل کی شادی شیخو بھائی سے نہیں ہونے دے گا۔

"تم ابھی بچہ ہو — تم گھر کے معاملات کو کیا جانو۔ ہم جو ٹھیک سمجھیں گے وہ کریں گے۔" رضیہ بھی شاہین کی ماں تھی بہت بڑے باپ کی بیٹی اور "ایوان غزل" کی ملکہ —

"نہیں آپ ایسا نہیں کر سکیں گی۔"

رضیہ کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گرا۔ راشد نے اپنے آدھے سفید اور آدھے سیاہ بالوں کی لٹیں ہٹا کر شاہین کو بڑے غور سے دیکھا اور

روٹی کے ہزاروں ٹکڑے کر کے پھینکے۔ وہ شاہین کا یہ روپ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

" اگر آپ نے شیخو بھائی کی شادی غزل سے کی تو میں غزل کو زہر دے دوں گا۔"

"اور اگر تم پھر اس بیچ میں بولے تو میں زہر کھا لوں گی ۔۔۔" رضیہ نے بھی غصے میں گرج کر کہا۔ پھر سب چپ ہو گئے۔ گیلی لکڑیوں میں پھونکیں مارتی ہوئی غزل آنکھوں سے بہتا پانی پونچھ پونچھ کر پراٹھے سینکتی رہی۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ ناشتے کی میز پر کیسا طوفان آیا تھا

بات اتنی تلخ ہو جائے گی اس کا شاہین کو اندازہ نہ تھا۔ کیونکہ اس نے کبھی اپنے والدین سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔ بلکہ امی کے سامنے جھکنا اور ان کی ہر بات پر گردن ہلانا اس کے خاندان کی روایت تھی ــــــ اس کے باوجود ــــــ ہزار بار ارادہ کرنے کے باوجود وہ امیّ سے معافی مانگنے نہیں گیا ــــ

رضیہ اپنے کمرے میں لیٹی سسکیاں لیتی رہی۔ راشد نے ماں بیٹے کے درمیان ایک لفظ بھی نہیں کہا ــ بیٹے کی خود سری سے اسے بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ اس کے باوجود اس نے بیوی کی طرف داری نہیں کی ــــ کیوں کہ بیٹا اس کا مستقبل تھا اور دوراندیشی راشد کی سرشت میں داخل تھی۔

اس دن کلینک ختم کر کے شاہین دوپہر کے کھانے پر گھر نہیں آیا۔ شام کو وہ کلب چلا گیا۔ رات کو بارہ بجے آیا تو لنگڑی پھوپو کے بے حد اصرار پر بھی اس نے کھانا نہیں کھایا۔

بیٹے کے یہ تیور دیکھ کر رضیہ نے خود ہی سپر ڈال دی۔ رفتہ رفتہ شاہین جیسے بھول ہی گیا کہ اس نے امی سے کوئی گستاخی کی تھی۔

اور رضیہ اسی طرح ہاسپٹل جاتے وقت اسے روک کر پوچھتی۔

" دوپہر میں کیا پکواؤں "

" جھینگے کی کڑھی۔ ماہی قلیہ ــــ" شاہین جیسے پہلے سے سوچے بیٹھا تھا کہ آج کیا کھانا ہے۔

غزل گھر والوں کی اس خاموشی سے کچھ چونکی سی ضرور تھی۔ مگر اس نے اب سب باتوں پر غور کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے وہ دن بھر چولھے کے پاس گھسی رہتی تھی۔ وہاں سے اٹھی تو گھر کی صفائی ہو رہی ہے۔ فرش دھو رہی ہے۔ لنگڑی پھوپو کے سر میں جوئیں دیکھ رہی ہے۔ سرور کبھی اچانک آکر دیکھ لیتا تو ہرگز یقین نہ کرتا کہ سیکڑوں دلوں کو جیتنے والی یہ اسٹیج کی ماہ پارہ وہی ہے جس کی ایک نگاہ پر سرور کا دل کانپنے لگتا تھا۔ جسے وہ دنیا کے ہر دکھ سے بچا کر تخئیل کی ملکہ بنا رہا تھا۔

رضیہ نے گھر کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر شاہین کے بیاہ کی تیاری شروع کر دی تھی۔ ہمرو، اطلس اور کمخواب کے ٹکڑے نکال کر اس نے لنگڑی پھوپو کو دیے کہ خوان پوش سینا شروع کر دیں۔ اس دن کے بعد سے رضیہ نے غزل سے بھی بڑا سرد مہری کا برتاؤ شروع کر دیا تھا وہ چار چار بار بات پوچھتی تو ایک بار جواب ملتا۔

مگر شاہین بڑے مزے میں تھا۔ شام کو وہ کلینک سے آتا تھا تو اس کی جیب میں کبھی ٹافیاں ہوتیں کبھی چاکلیٹ۔ کبھی کھٹے بیر ــ سب کی نظریں بچا کر وہ اس لفافے کو غزل کی طرف اچھال دیتا تھا۔ کبھی شاہین اپنے کمرے میں سو رہا ہوتا تو جانے کیوں رضیہ کو یوں لگتا جیسے اندر کوئی اور بھی نہیں رہا ہو۔ پھر انھیں یاد آتا کہ شاہین ٹرانسسٹر پر کوئی ڈراما سن رہا ہوگا۔

دوپہر کو شاہین کھانے کے لیے آیا تو دالان میں ہر طرف رنگین کپڑے اور گوٹا کناری کی جھلملاہٹ پھیلی ہوئی تھی ۔ رضیہ اور لنگڑی پھوپھو کپڑے سی رہی تھیں۔ غزل سیاہ مخمل پر چمکیاں ٹانک رہی تھی ۔

شاہین کا موڈ ٹھیک دیکھا تو لنگڑی پھوپھو نے فوراً موقعے سے فائدہ اٹھا کر کہنا شروع کیا ۔

میرے بھائی کو منع کر دیا ۔ اب میں بھی دیکھتی ہوں کہ شاہین میاں کیسا ملی الکٹرا انجینئر لاتے ہیں ڈھونڈ کر اپنی ستی ساوتری بہن کے واسطے ۔ ہم لوگاں تو چپ اللہ کے واسطے میں ہاں کر دیے تھے ۔ ورنہ شیخو میاں تو خود بھی کب تیار تھے جھوٹن کھانے کے واسطے ۔"

شاہین نے ادھر دیکھا ــــ غزل کپڑے پر چمکیاں ٹانک رہی تھی ۔ پھر اپنے آنسو ٹانکنے لگی ۔ شاہین نے لنگڑی پھوپھو کو کوئی جواب نہیں دیا ــــ کیوں کہ وہ جانتا تھا یہ بات لنگڑی پھوپھو نے نہیں کہی امی نے ان سے کہلوائی ہے ۔

رات کو وہ کلینک بند کر کے آیا تو حسب عادت سب سو چکے تھے ۔ صرف غزل کے کمرے کی لائٹ کھلی تھی ــــ شاہین نے آہستہ سے کواڑ کھول کر اندر دیکھا ــــ غزل کے ہاتھ میں کوئی ادھ سلا کپڑا تھا ــــ مگر وہ آنکھوں میں آنسو لیے سسکیاں لے رہی تھی ــــ شاہین نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا اور غزل کے پاس جا بیٹھا ۔

"تم نے اپنے آنسوؤں کا خزانہ کہاں چھپا رکھا ہے غزل ۔ پندرہ برس سے تمہیں روتے دیکھ رہا ہوں ۔"

غزل کچھ نہ بولی ـ ہاتھ میں تھامے ہوئے سوئی کو اپنی انگلیوں میں چبھو چبھو کر خون نکالتی رہی ۔ پھر شاہین کو اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر چونک پڑی ۔

"شاہین ۔ مجھے شیخو بھائی سے شادی کر نے دو ۔ ورنہ کتوں کی جھوٹن کون کھائے گا ! میں کب تک ممانی بیگم کے سر پر سوار رہوں گی
مگر شاہین نے کچھ نہ سنا ــــ وہ تو صرف غزل کو دیکھے جا رہا تھا ــــ اور سوچ رہا تھا کہ "ایوان غزل" کے وہ سارے مکین بے قصور تھے ۔ جو عورت کے حسن کی آنچ میں پگھل پگھل کر موم بنتے رہے جنھوں نے عشق کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں کیا ــــ پھر بھی "ایوان غزل" کے لائبریری روم میں رکھی ہوئی پچھتر بیاض مکمل نہیں تھیں ۔ ان میں ابھی بہت کچھ کہنے کو رہ گیا ہے ۔ اس سانولے سے رنگ کے بارے میں سوجھی سوجھی سی آنکھوں کے بارے میں، چھوٹی سی سرخ ناک اور آڑے اُڑے بالوں کے بارے میں ۔
شاہین کا بھی اپنے دادا حضرت کی طرح شاعری کرنے کو دل مچل اٹھا ــــ آج اسے معلوم ہوا کہ غزل میں کوئی ایسا سحر ہوتا ہے ۔ جو وہ شاعروں کی پسندیدہ صنف ادب بن گئی ہے ۔ ہر دور میں شاعروں نے اسے اپنے سینے سے لگایا ــــ اس پر طبع آزمائی کو ضروری سمجھا ــــ اور پھر شاہین نے بھی ان چند لمحوں میں غزل کو بڑے لطیف نام دیے ۔ بڑی خوب صورت تشبیہیں ــــ جذبات کے جانے کتنے سمندر تیرنا پڑے ــــ راہ کے کتنے پہاڑ الانگھے ــــ تب وہ ہانپتا ہوا بولا ــــ

"غزل ــــ اگر میں تم سے شادی کرنا چاہوں تو تم راضی ہو گی ؟"

اس بار غزل کا ہاتھ اتنی زور سے کانپا کر سوئی ہتیلی میں اترتی چلی گئی ــ اس نے تڑپ کر شاہین کو دیکھا ــــ سر سے پیر تک ۔ جیسے شاہین نے بڑی بے رحمی سے اسے چرکا دیا ہو ۔ اس پر کھلے چاقو سے وار کیا ہو ۔ اور پھر وہ کانپتے ہاتھوں سے شاہین کو دو دو دھکیاں کر بولی :

"نہیں نہیں ایسا مت کہو ـــ" اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ دیئے تو ہتھیلی میں سے ٹپکنے والے خون کے قطرے اس کے گالوں پر گرنے لگے۔

"میں ـ یہ ناٹک کھیلتے کھیلتے عاجز آ چکی ہوں۔ اب میرے اور ٹکڑے مت کرو۔ چلے جاؤ ـ یہاں سے چلے جاؤ شاہین۔"

شاہین نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور غصّے میں کہا۔

"بس کرو اپنے حسن پر اترانا۔ میں کوئی بنگلہ می نہیں ہوں جس کے آگے تم ڈرامے کا ریہرسل کر رہی ہو۔" اور پھر شاہین نے اس کے گالوں پر لگا خون پونچھ ڈالا۔

اس نے نگاہ اٹھائی۔ شاہین کو دیکھا ـ دیکھتی رہی ـــ اس کے چہرے پر کوئی خوشامد نہیں تھی۔ کوئی طلب نہیں تھی۔ وہ بہت ہی مغرور نظر آ رہا تھا۔ ہمت والا ـ جیسے اب غزل نے انکار کیا تو اس کی پیٹھ پر دو لاتیں مارے گا۔

"میں نصیر کی طرح محبّت کا ڈھونگ نہیں رچا رہا ہوں۔ مجھے تم سے کوئی محبّت وحبت نہیں ہے۔ آگے کی نہیں کہہ سکتا۔"

اور وہ باہر چلا گیا۔

یہ شاہین تھا۔ غزل نے اپنی خون آلودہ ہتیلی کو دبا کر سوچا۔ اس نے تو کبھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ شاہین بھی اسے ایک عورت سمجھتا ہے۔ وہ تو شاہین کے وجود کو ہمیشہ نظر انداز کرتی رہی۔ اس کے لئے شاہین ایک احمق معصوم لڑکا تھا۔ جسے ہر شرارت ہر بغاوت سکھانا پڑتی تھی۔ وہ آج بھی اتنا ہی چھوٹا تھا۔ اتنا ہی احمق ـ کچھ تو سوچتا وہ اتنا بڑا ڈاکٹر ـ "ایوانِ غزل" کا مالک ہے زائد کا بیٹا ـ بے وقوف ـــ جب ہی تو اتنی صاف گوئی سے کام لے رہا ہے ـــ مجھے تم سے محبّت وحبت نہیں ہے آگے کی نہیں کہہ سکتا ـــ تو آگے کی بات میں کہوں گی۔ ابھی اسی وقت ـــ وہ اٹھ کر شاہین کے کمرے کی طرف بھاگی۔

بچاری لنگڑی پھوپو بڑے انہماک سے جانماز پر بیٹھی اپنی قسمت کا سورج نکلنے کی دعائیں مانگتی رہیں۔ انہیں خبر ہی نہیں ہوئی کہ واحد حسین کا لوتا، راشد کا بیٹا

بھی اتنا گیا گذرا تھا کہ جھوٹے کھانے پر منہ مارتا پھرے۔

خیر ـــ صبح ہوئی تو سب، غزل کے قہقہوں کی آواز پر جاگے۔ وہ آنگن میں گنگناتی پھر رہی تھی۔ جاگو موہن پیارے جاگو ـــ

صبح بادام کا حریرہ بنا کر راشد کو دینے کی بجائے وہ اپنے گیلے بال کھولے آئینے کے سامنے جا بیٹھی اور چاند آپا کے میک اپ کا ڈبہ کھول لیا۔ کرانتی کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا اس لیئے شاہین اکثر اسے ہاسٹل سے گھر لے آتا تھا۔ آج بھی کرانتی غزل کے قدموں کے پاس بیٹھی پوچھ رہی تھی۔

"آنٹی آج آپ اپنا منہ ریڈ کیوں کر رہی ہیں۔ !"

رضیہ نے اس کے جہیز کے لئے جو دو چار جوڑے سلوائے تھے اس میں سے جو تھی والی بری ساری نکال کر اس نے پہن لی۔

مگر رضیہ کو اپنی پریشانیوں میں اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ غزل کے اس بدلے ہوئے روپ پر غور کرتی۔

سارے گھر میں خاموشی سی چھائی رہتی شروع ہی گرمیوں کی تیز ہوائیں ہر چیز کو جیسے جھنجھوڑے ڈالتی تھیں۔ درختوں سے زرد پتے گرے جاتے تھے۔ سیبوٹے پک رہے تھے۔ اور آم کے بور کی تیز مہک ہر طرف پھیل رہی تھی۔

یہ بڑا افراتفری کا دور تھا۔

اعلیٰ حضرت "راج پرمکھ" بن چکے تھے۔ اور کے ایم منشی نے انڈین یونین کے ایجنٹ بن کر تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیئے تھے۔ ابھی چند ماہ پہلے گاندھی جی کا قتل ہو چکا تھا۔ اس لئے ہر طرف سخت دہشت اور سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ اتحاد المسلمین کے کچھ لیڈر راتوں رات فرار ہو چکے تھے۔ قاسم رضوی جیل میں تھے اور لائق علی اپنے گھر میں ہی نظر بند تھے، اس وقت راشد اور اس کے ساتھیوں نے کانگریس سرکار کے سامنے اپنی وفاداری کے ہزاروں ثبوت پیش کیے اس کے باوجود جاگیرن

اور منصب ختم ہو رہے تھے۔ گھبرا کے وہ بغاوت کی سوچتے ـــــ مگر کیسی بغاوت ـــــ؟

ہر طرف سسکیاں اور آنسو تھے۔ ہزاروں افراد جنہوں نے گاندھی جی کے اشارے پر اپنے خطاب اور جاگیریں واپس کر دی تھیں۔ پھانسی کے تختے اور جیل کی سختیاں برداشت کی تھیں۔ انہیں اب قبل از وقت پنشنیں دی جا رہی تھیں۔ بہت سے چھوٹے بڑے کلرکوں، پولیس آفیسروں اور اہم عہدے داروں کو زبردستی ان کے عہدوں سے نکال دیا گیا۔ اس ہما ہمی کے عالم میں ہر شخص سوچ رہا تھا کہ آئندہ کیا ہوگا! ایسے وقت راشد چاروں طرف ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی پر احتساب تھا۔ اس لئے مخدوم اور ان کے ساتھی انڈر گراؤنڈ تھے۔

ان حالات میں شاہین سوچتا کہ انسان بچ کر کہاں جائے گا۔؟

اس نے راشد کی تمام تجویزیں رد کر دی تھیں۔ وہ نہ تو پاکستان جائے گا اور نہ امریکہ جا کر دولت کمائے گا۔ دولت کمانے میں اسے کوئی دلچسپی نظر نہ آتی تھی۔ کیوں کہ اس کے باپ اور دادا نے جو دولت کمائی تھی وہ "ایوان غزل" تھی اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ اور جب ہر طرف ایسے ہی حصار کھنچے ہوئے ہوں تو بھاگنے کی کوشش کیوں کریں۔ اس لئے شاہین حیدرآباد میں رہنا چاہتا تھا۔ تمام سیاسی اور سماجی تحریکوں سے الگ میڈیکل ریسرچ میں وقت صرف کرنا چاہتا تھا۔ وہ جب ہائی اسکول میں پڑھتا تھا تو مخدوم کی رومانی نظمیں اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ اور وہ اکثر سائنس کی کتاب رکھ کر گنگنانے لگتا تھا۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

اس شعر کی اداس فضا میں وہ خود بھی اپنے آپ کو تنہا اور اداس محسوس کرتا تھا۔

پھر ایک دن ایک مقامی رسالے میں اس نے مخدوم کی نئی نظم دیکھی جو جیل کی سلاخوں کو توڑ کر سارے حیدرآباد میں گونج رہی تھی۔

سوچتا ہوں کہ یہ گنج گراں مایۂ عمر
نذرِ زنداں ہوا نذرِ آزادئ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا۔

مخدوم کی ایسی نظموں کی وجہ سے شاہین جیسے تعلیم یافتہ نوجوان حالات سے سمجھوتہ کرنے کی بجائے چاروں طرف راستہ تلاش کر رہے تھے۔ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ مجبوری اور ضرورت نے بہت سی پرانی روایتوں کو توڑ دیا تھا۔ ڈیوڑھیوں سے پردہ لگی کاروں اور جھٹکوں میں نکلنے والی لڑکیاں اب بس اسٹینڈ کے کیو میں کھڑی نظر آتی تھیں۔ ہر گھر کی لڑکی اب اسکول جا رہی تھی۔ بند کمروں میں قالین پرتا پنورہ سنبھالے ہوئے چنو نواب، اب ریڈیو اسٹیشن سے دادرا اور ٹھمریاں گانے لگے تھے۔ ڈیوڑھیوں کا نیلام ہو رہا تھا۔ کاروں اور مکانوں کی قیمتیں گر گئی تھیں۔ دولہا نواب کے پوتے رکشا چلا رہے تھے۔ اور سکین علی شاہ کی پوتی منہ پر میک اپ چڑھائے ہر مرد سے عشق کا کھیل کھیلنے کو تیار رہتی۔ جو اسے پناہ دینے کا وعدہ کرتا۔ جو اس کے باپ کی کھوئی ہوئی "الف لیلہ" اسے واپس دلانے کا یقین دلاتا تھا۔ ـــــ اسی لئے شاہین پیسہ بٹورنے کی بجائے ہاسپٹل میں سروس کر رہا تھا۔ اور اب اس نے اپنا ایک چھوٹا سا کلینک حیدر گوڑہ میں کھول لیا تھا۔ جہاں وہ غریب مریضوں کا مفت علاج کرتا۔ ان کے پھلوں کے لئے پیسے اپنی جیب سے دے دیتا تھا۔ جب بھی اس کے سامنے کوئی ضرورت مند آ کھڑا ہوتا تھا تو وہ فوراً اپنی جیب ٹٹولنے

لگتا تھا ــــــ یوں ہی جیسے اس نے غزل کو شادی کا آفر دے دیا۔ اس نے تمام یورپ دیکھا تھا۔ اور وہ سچ مچ اتنا احمق نہیں تھا جتنا اس کی ماں یا غزل اسے سمجھتی تھیں۔

مگر غزل میں اچانک جانے اسے کیا کیا نظر آیا کہ اس نے کچھ نہ سوچا غزل اس کا ساتھ دے گی۔ اس کے ساتھ ہنس سکتی ہے۔ رہ سکتی ہے ــــــ بس پھر میں اس کا ماضی کیوں دیکھوں۔ میں بھی تو اپنے ماضی میں جھانکنے کا اختیار اسے نہیں دے رہا ہوں۔ بیچاری غریب لڑکی جسے بچپن سے صرف نفرت ملی۔ ایسی لڑکیاں ہر ڈیوڑھی میں ملتیں۔ ہر بنگلے سے نکل رہی تھیں۔ انہیں اپنے بے سہارا خاندان کو پالنے کے لئے بہت سے بہانے تلاش کرنا پڑتے ــــــ اسٹیج پر اداکاری ــــــ آفس میں کلرکی اسکول میں ٹیچری۔ یا پھر محفلوں میں چہکنے والی ایک فیشن ایبل خاتون بن کر کبھی وہ راشد کی زندگی کا سامان مہیا کرتیں۔ کبھی ہمایوں کی ردی کپڑے کا بند و بست ہو جاتا تھا۔

بیٹے کی اس خود سری پر راشد کو بڑا افسوس تھا۔ ادھر فوزیہ کی طرف سے بھی راشد کو چین نہیں ملا تھا۔ کیوں کہ فوزیہ کے دولہا کو ہر وقت یہی پچھتاوا تھا کہ اس نے شادی کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔ ورنہ اسے گھوڑے جوڑے کے پچھتر ہزار بھی مل سکتے تھے۔ اپنے نقصان کا ذکر ہر وقت وہ فوزیہ سے کرتا رہتا تھا۔

ان حالات نے راشد کو قبل از وقت بوڑھا بنا دیا۔ وہ ہر طرف کی پریشانیوں۔ اندیشوں اور مشکلوں کو تنہا جھیل رہا تھا۔ اس کا بیٹا اپنے باپ کی مشکلوں کو سمجھتا تھا۔ اور ہمیشہ یہی مشورہ دیتا کہ آپ روپیہ کمانے کی کوششوں کو اب ترک کر دیجئے۔ اکیلا میں آخر کتنا کھاؤں گا۔

صبر کرتے کرتے راشد کو اختلاج کی شکایت ہو گئی تھی۔

چنانچہ ایک دن زبردستی شاہین نے اس کا چیک اپ کیا۔ جانے کتنے ٹسٹ لئے۔ پھر اس کے ہاتھ پر پٹی باندھ کر اس کے دل کی دھڑکن سنی اور بہت پریشان ہو کر کہا۔

" ڈیڈی آپ کا بلڈ پریشر کافی بڑھا ہوا ہے۔ نمک چھوڑ دیجئے "

مگر راشد کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس کی ساری پریشانیوں کا سبب نمک ہو سکتا ہے۔ رضیہ بھی ان پریشانیوں میں گھر کر نڈھال رہنے لگی تھی۔ اس کے باوجود اس نے کئی بار غزل کو غور سے دیکھ کر کہا کہ یہ نئی ساری کیوں پہن لی۔ کبھی وہ شاہین کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے پر اسے ڈانٹ دیتیں۔ وہ جانتی تھیں کہ غزل تو منہ لگائی ڈومنی ہے۔ شاہین نے شیخو بھائی سے اس کی شادی رکوا دی ہے اس لئے وہ آجکل شاہین پر بڑی مہربان ہے اب تو پولیس کے کسی سپاہی سے اس کا بیاہ کرنا ہوگا تاکہ ساری مستی نکل جائے۔

لیکن غزل لنگڑی پھوپو کو آجکل بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ انہوں نے غزل کے بارے ہوئے رشتے کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ اور دن بھر شیخو بھائی کی کوٹھری میں گھسی جانے کیا کھسر پھسر کئے جاتیں۔ انہوں نے اپنے جہیز کے لئے رکھی ہوئی سرخ نیلی پیلی ساریاں بھی نکال کر پہن ڈالیں۔ دن میں کئی کئی بار اپنے کھچڑی بال کھولے کنگھی کئے جائیں۔ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے ماما کو حکم دیا جاتا کہ شیخو بھائی کو ایک ہاف فرائی انڈا۔ اور ایک پیالی دودھ بھیج دیا جائے

غزل نے اس فرمان کو بڑے غور سے سنا۔ اچھا ہوا کہ رضیہ نے لنگڑی پھوپو کا یہ حکم نہیں سنا تھا۔ کیونکہ شیخو بھائی کو تو ہمیشہ نوکروں والا ناشتہ بھیجا گیا تھا۔

ایک بار لنگڑی پھوپو لکس صابن کی ٹکیا اپنی سوکھی کلائیوں پر رگڑ رہی تھیں تو انہوں نے غزل سے کہا۔

" تم لوگ رات دن منہ پر سرخی پاؤڈر تھوپتے ہو مگر پھر بھی صورت پر

ٹھیکرے برستے ہیں۔ ہمیں دیکھو پچاس کے قریب پہونچ گئے مگر صورت پر کیسی رونق ہے ـــ؟"

شاہین کو عادت تھی کہ آتے جاتے غزل کے سر پر دھول مارتا ہوا جاتا وہ غزل سے اتنا لمبا تھا کہ اس کے سر پر دھول مارنے کے لئے غزل کو اسٹول پر چڑھنا پڑتا تھا۔ اسی لئے وہ ایک دن تپائی پر چڑھ کر شاہین کو پکڑنے کو جھکی تو شاہین نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ایک ہاتھ میں اٹھا لیا۔ راشد اور رضیہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ مگر اندر کمرے میں کھڑ پھڑ کرنے والی لنگڑی پھوپو نے اس منظر کو دیکھ لیا۔

شام کو سب کھانے کی میز پر بیٹھے تو لنگڑی پھوپو نے فلیتہ جلایا۔

" اچھا ہوا دلہن آپ حبیب جنگ کی پوتی سے شاہین بابا کا رشتہ طے کر آئے۔ مگر سنا ہے وہ لوگاں بڑے پرانے خیال کے ہیں گئے۔"

رضیہ اور راشد کا خیال تھا کہ شاہین اس خبر سے چونک پڑے گا کہ اس کی مرضی کے بغیر یہ رشتہ کیسے طے ہو گیا۔ مگر وہ مچھلی کے کانٹے صاف کرتا رہا۔

" یہ بھی اچھی بات ہے۔ ہم لوگاں بھی کاں کے ترقی پسند ہیں۔"

راشد بھی اب واحد حسین کے انداز میں سوچنے لگا تھا۔ اس کے کہیں کہیں سے ہوتے ہوئے سفید بال، بھاری بھرکم بدن اور گرجدار آواز پر غزل کو اکثر نانا حضت یاد آجاتے تھے۔

" مگر تمہارے گھر کا ان سے میل کیسے ہو گا راشد نواب ـــ؟"

لنگڑی پھوپو اتنی جلدی بات ختم کرنے کو تیار نہ تھیں۔

" وہ لوگاں اپنے گھر کے چال چلن بھی دیکھیں گے۔ گریاں تو ہر وقت ادھر ادھر کی بوٹیوں کے دن رات مزاخ دل لگی چلتی رہتی ہے۔

ظاہر ہے کہ غزل کے سوا کوئی بھی لڑکی گھر میں ڈھونڈو تو دوا کے

لئے بھی نہ ملی۔ مگر شاہین آج مچھلی کے کانٹوں میں اس بری طرح الجھ گیا تھا کہ اس نے کچھ نہ سنا۔ اس کے ہاتھ تو کانٹوں سے بچاؤ میں معروف رہے، اور نگاہیں اس کوشش میں رہیں کہ میز کے دوسرے سرے پر بیٹھی ہوئی غزل سے چار نہ ہوں۔

" تو کونسی لڑکیاں چھوکریاں ہم نے رکھ چھوڑی ہیں ـــ، بس لے دے کر ایک غزل ہی تو ہے۔" رضیہ نے پانی کا گھونٹ لے کر کہا۔

لنگڑی پھوپو نے منہ بنا کر رضیہ کو گھورا۔ یہ رضیہ بنتی تو تھی اپنے آپ کو بڑی چالاک مگر کبھی جو بات کی تہہ تک پہونچے۔

" یہ تو اللہ کا شکر بھیجو دلہن کہ ان لوگوں کو ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوا ہے کہ غزل " ایوان غزل " میں رہتی ہے۔ ورنہ آپ کے گھر کون رشتہ کرے گا ـــ؟"

لنگڑی پھوپو کی اس صاف گوئی پر شاہین اچھل پڑا۔ رضیہ بھی کھسیا کر انہیں گھورنے لگی، اور راشد کو پانی پی کر یہ کہنا پڑا۔

" پھوپو کا تو اب دماغ بالکل چل گیا ہے۔ غزل ہماری بہن کی نشانی ہے۔ اگر وہ لوگاں اتنے پچھورے ہیں تو ہم خود اس رشتے سے انکار کر دیں گے۔"

مگر غزل ماموں جان کی بات سننے سے قبل اٹھ چکی تھی۔ لنگڑی پھوپو کو اس دن سب ہی نے خوب برا بھلا کہا۔ اس لئے انہوں نے بھی سارے گھر سے بائیکاٹ کر کے شیخو بھائی کی کوٹھری میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کے باوجود انہیں یقین تھا کہ اب غزل کے قہقہے تھم جائیں گے۔ اور وہ شاہین کے ساتھ مذاق کرنے کی جرأت نہیں کرے گی

لیکن رات کو وہ جب عشاء کی نماز کے لئے ورانڈے میں آئیں تو غزل خوب بنی ٹھنی خوشبوؤں میں بسی آنگن میں کھڑی تھی، اور شاہین

سوٹ پہنے ورانڈے میں کھڑا پانی پی رہا تھا۔

وہ ستون کا سہارا لئے منہ کھولے۔ اس منظر کو دیکھتی رہیں۔

یہاں تک کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے چمٹے۔ باہر کی طرف جانے لگے تو شاہین نے لنگڑی پھوپو سے کہا کہ وہ سکنڈ شو دیکھنے جا رہا ہے اس لئے گیٹ لاک مت کرنا۔

اور پھر انہوں نے کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔

اس رات لنگڑی پھوپو نے عشاء کی نماز پڑھی، نہ انہیں ساری رات نیند آئی۔ کیونکہ اتنی وزنی بات کو چوکی سے اٹھا کر رضیہ کے کمرے تک لے جانے میں ہانپتی جا رہی تھیں۔

کراہتی رہیں تھی اور شاید اسے بخار آ گیا تھا۔ اس لئے وہ خوب روتی کراہتی رہی۔ مگر لنگڑی پھوپو کی جوتی کو غرض پڑی تھی کہ اس کے پاس جاتیں۔

صبح غزل اپنے ہاتھ سے شاہین کو چائے پلا رہی تھی تو یہ منظر لنگڑی پھوپو نے کواڑ کے سوراخ سے رضیہ کو بھی دکھایا۔

پھر راشد کی نظریں جانے کیسے شاہین کے کمرے کی طرف اٹھیں تو وہ غزل کے دونوں ہاتھ پکڑے اسے چکر دے رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر سگریٹ پی پی کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر جب بپھری ہوئی شیرنی کی طرح رضیہ کمرے میں آئی تو اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر کہا۔

"شاہین کی سسرال کے لوگاں کب تک شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔۔۔؟"

لیکن رضیہ پر تو جیسے کسی نے انگارے اچھال دیئے تھے۔ تنک کر بولی۔

"بس بس رہنے دو بے کار کی باتاں۔ میرا منہ نکو کھلواؤ۔ یہ سب آپ ہی کا کیا دھرا ہے۔"

"ایسی کیا بات ہے۔ شاہین کی شادی ہو جائے تو۔"

راشد نے رسان سے کہنا چاہا مگر رضیہ بجلی کی طرح پلٹی۔

"چپ بیٹھو اب ــ میں تو اس گھر میں آ کر پچھتائی۔ غلاظت کا گڑھا۔ میرے کو معلوم تھا کہ میرے بچے بھی یاں نہیں بچیں گے۔ آپ کی بہناں مر گئے۔ کلمو ہی بیٹیوں کو میرے حوالے کر گئے۔"

اور اسی وقت شاہین پردہ اٹھا کر اندر آیا۔ ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"امی۔ آپ میرے لئے دلہن مت ڈھونڈیئے۔ میری دلہن گھر ہی میں ہے۔"

بظاہر اس نے یہ بات امی سے کہی تھی۔ مگر انداز تخاطب پپا سے تھا۔ پھر وہ سیٹی بجاتا ہوا چلا گیا۔ لیکن وہ دونوں اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ جیسے شاہین کوئی منتر پڑھ کر انہیں پتھر بنا گیا ہو۔ بڑی دیر کے بعد کلاک کے گھنٹے جیسے کسی خطرے کا اعلان کرنے کو بج اٹھے تو راشد چونک پڑا۔

"اوہ ـــ کیا بج گیا ـــ! اس نے اپنے آس پاس کی دنیا پہچانی۔ یہ اسی کا کمرہ تھا، یہیں ان دونوں کے پلنگوں سے لگا ایک ننھا سا کریب پڑا تھا۔ جس میں لیٹا ہوا شاہین اٹھنے کی کوشش کرتا تھا اور اٹھ نہ پاتا۔ پھر راشد جھک کر اپنی دونوں انگلیاں تھما دیتا تھا تاکہ وہ ان کے سہارے اٹھ سکے پھر وہ اٹھا ـــ اور ہاسپٹل چلا گیا۔ جہاں وہ اسکرین پر لوگوں کے دلوں کا حال دیکھے گا۔ زخمی دلوں پر مرہم رکھے گا۔ وہ شہر کا سب

مشہور ہارٹ اسپیشلسٹ ہے ـــــ مگر اس نے یہ نہ سوچا کہ اس کے باپ کے سینے میں بھی دل ہے۔ وہ بلڈ پریشر کا مریض ہے ـــ اس کے دل پر کتنا زبردست وار کیا تھا ـــــ اور پھر بڑھتے ہوئے پریشر سے چکراتے ہوئے راشد نے کہا۔

" رضیہ گذرتے ہوئے وقت کو پیچھے کی طرف مت لے جاؤ ـــ جو ہوتا ہے ہونے دو ـــــ

*** *** ***

اس رات غزل کو بالکل نیند نہ آئی۔

ایسا تو اکثر ہوا کہ لوگوں نے اس کو شادی کا آفر کیا ـــ

بلگرامی ـــــ سرور ـــــ نصیر ـــــ اور پھر آج شاہین نے بھی یہی کیا ـــ

یہ سب مرد جو اس کے سامنے ایک دیا جلا کر اپنی دنیا کو روشن کرتے رہے ہیں ـــ وہ ان کے لئے پلاسٹک کی گڑیا تھی ـــ پالتو بلی تھی۔ جسے موڈ ہو تو پیار کرتے ہیں۔ جی نہ چاہے تو لات مار کے بھگا دیتے ہیں۔

آج شاہین نے بھی اس سے شادی کے لئے کہا تو اسے تعجب نہ ہوا پھر بھی جانے کیوں اسے بچپن میں کہیں دیکھی ہوئی دیوالی کا ایک منظر یاد آیا ـــــ سیکڑوں چراغ قطاروں میں جلتے ہوئے۔

" تم ـــــ مجھ ہی سے شادی کیوں کر رہے ہو ـــــ ؟" اس نے گھبرا کے پوچھا۔

" اس لئے کہ میں نہیں چاہتا تم زندگی بھر روتی رہو۔"

ہونہہ ـــــ" دیوالی کے دیوں کی لمبی قطار بجھتی چلی گئی۔

" تو تم بھی مجھ پر ترس کھا کر شادی کرنا چاہتے ہو ـــ مجھ پر رحم دکھا کر۔" مگر اس نے یہ بات شاہین سے نہیں کہی ـــ

"اچھا اگر میں زندگی بھر ہنسنے کا وعدہ کر لوں تو ——؟"
شاہین نے پلٹ کر اسے غور سے دیکھا۔
"کیسے ہنسو گی ——؟"
"جیسے اب روتی ہوں ——" اس نے فوراً جواب دیا۔
"بس، بس، بہت ہو چکی فلاسفی" وہ جیسے اب کسی بحث میں پڑنے کو تیار نہ تھا۔

"مابدولت جو فیصلہ کر چکے ہیں۔ اس پر اٹل رہیں گے ——"
اور اس نے فوراً امی کے کمرے میں جا کر اپنا ارادہ ظاہر کر دیا۔ جیسے خود بھی دیر کرنے سے گھبرا رہا ہو ——

شاہین ہاسپٹل چلا گیا تو کمرہ اندر سے بند کر کے غزل خوب روئی اس نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں کسی اور عورت کا تصور نہیں کر سکتا۔ وہ تو مجھ پر رحم کھا کر شادی کرے گا۔ بعد میں پچھتائے گا —— مجھ سے نفرت کرنے لگے گا۔ شاید اسے بھان —— بلگرامی اور نصیر کے قصے پوری طرح نہیں معلوم ہیں۔ بعد میں راشد ماموں اور لنگڑی پھوپوا سے یہ قصے خوب نمک مرچ لگا کر سنائیں گے اور وہ دور ہٹنے لگے گا۔

"آخر یہ کیسے ہو گا کہ میں نصیر کی دی ہوئی انگوٹھی اتار دوں ——
پھر جلوے کی رات شاہین میری کونسی انگلی تھامے گا —— !
نواب واحد حسین کا پوتا —— اختر الدولہ کا نواسہ ——
راشد حسین کا بیٹا —— ڈاکٹر شاہین راشد —— ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ایم۔ آر۔ سی۔ پی۔

نہیں۔ نہیں۔ وہ بہت بڑا ہے۔ وہ تو میرے سر پہ پہاڑ بن کر کھڑا ہو جائے گا۔ میں پس کر رہ جاؤں گی —— "ایوان غزل" کا سارا بوجھ

میں اپنے سر پر کیسے اٹھاؤں گی ——
"ایوان غزل" جو صرف محبوباؤں، معشوقاؤں کے لئے ہے —— یہاں جو عورت بیوی بن کر آئی وہ رضیہ کی طرح ہر طرف سے لٹتی رہی —— میں بھی یہاں شاہین کی محبوباؤں کی ناز برداریاں کروں گی ——"

رضیہ ممانی مجھے دو دن میں مار پیٹ کر نکال دیں گی —— لنگڑی پھوپو مجھے زہر کھلا دیں گی —— جھوٹے ٹکڑے کھانے والی کتیا —— دو ٹکے کی آوارہ چھوکری —— نہیں میں شیخو بھائی سے شادی کر دوں گی —— صبح شیخو بھائی سے کہوں گی مجھے ساتھ لے کر کہیں بھاگ جاؤ —— مجھے کمانے کے سارے گر یاد ہیں —— میں تمہیں ہر طرح کا سکھ پہنچاؤں گی۔

وہ کروٹیں بدلتی رہی —— پھر جب موذن اذان دے رہا تھا تو اس نے تھک کر سوچنا چھوڑ دیا۔

اللہ بہت بڑا ہے —— اللہ بہت بڑا ہے ——
صبح اس نے بخار میں پھنکتی ہوئی کرانتی کو اٹھایا تو سوچ لیا کہ وہ کرانتی کی ہو جائے گی —— کرانتی اب آٹھ برس کی ہو چکی تھی۔ پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ اور اپنے بارے میں سب کچھ جان چکی تھی۔

پھر اس نے کرانتی کو سویٹر پہنایا۔ اور کمرے سے نکلی تو حسین بی نے پوچھا۔

"غزل بی بی آج پھوپو پاشا کاں گئے —— ! میرے کو اسٹور کھول کر آٹا گھی ابھی تک نہیں دیئے ——"

تب اس نے جھانک کر دیکھا۔ لنگڑی پھوپوا اپنے کمرے میں نہیں تھیں —— جانے صبح ہی صبح کہاں گئی ہیں۔ غزل کو مارنے کا سامان کرنے —— وہ ہوتیں تو ابھی شیخو بھائی سے غزل کے نکاح کی بات بھی ہو جاتی

"تم کہاں جارہی ہو ——؟" رضیہ نے بڑے قہر بھرے لہجہ میں پوچھا۔

"کرانتی کو کلینک پہونچانے جارہی ہوں —" غزل نے سہم کر کہا۔ وہ چاہتی تھی آج کرانتی یہاں نہ رہے۔ جانے کیسے کیسے تماشے ہونے والے تھے آج۔ کلینک میں سسٹر اسے دوا پلا کر بخار اتار دے گی۔

"اور لنگڑی پھوپو کہاں ہیں ——؟" رضیہ نے بالکل پولیس والوں کے انداز میں شک بھری آواز سے پوچھا۔ رضیہ کو اب یقین ہو چلا تھا کہ اس کے خلاف چپکے چپکے کوئی ہانڈی پک رہی ہے۔ شاہین اور غزل نے لنگڑی پھوپو کو بھی اپنے ساتھ کر لیا ہے۔

اسی لئے زندگی میں پہلی بار لنگڑی پھوپو کسی کو بتائے بغیر کہیں چلی گئی تھیں۔ اب غزل بھی کرانتی کو لے کر کہیں بھاگ رہی ہے۔

"کوئی ضرورت نہیں گھر سے باہر قدم نکالنے کی۔" رضیہ غصے میں گرجی "کرانتی کو بخار ہے تو شاہین کو دکھاؤ — شاہین کے پاس تو تمہارے ہر دکھ کی دوا موجود ہے ——" پھر وہ خود ہی سسکتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

ممانی بیگم کی ڈانٹیں نئی نہ تھیں کہ اس پر کوئی اثر ہوتا۔

کرانتی کو بلانکٹ اڑھا کر اس نے اپنے بستر پر لٹا دیا۔ تو ممانی بیگم کے کمرے سے چیخیں بلند ہونے لگیں۔

ڈرائنگ روم میں اخبار پڑھتا ہوا راشد — سوتا ہوا شاہین — غزل — نوکر — ماما — سب ہی دوڑ پڑے۔

رضیہ کھلی ہوئی سیف پکڑے چلا رہی تھی۔

"میں لٹ گئی — میرا سارا زیور — پیسہ — مجھے کسی نے لوٹ لیا — تباہ کر دیا ——"

سب حیران تھے۔ راشد نے سیف کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ شاہین نے پورے کمرے کی تلاشی لی۔ دراصل کسی نے رضیہ کے سرہانے سے چابی نکال کر سیف

کھولی تھی اور اس میں سے صرف وہ زیور نکال لئے تھے جو اس خاندان کی دولت تھے۔ رضیہ کے جہیز والے زیوروں کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ غزل ڈر کے مارے بے ہوش ہوئی جارہی تھی۔ کیونکہ بچپن سے ہر ناکردہ گناہ کی سزا اسے ملتی رہی تھی۔ آج جانے کیسا قہر نازل ہوگا اس پر۔

شاہین پولیس اسٹیشن فون کرنے لگا تو راشد نے اس کے ہاتھ سے فون چھین لیا۔

"احمق — کیا لنگڑی پھوپو کو جیل بھجوائے گا۔ پہلے معلوم تو کرنے دو کہ معاملہ کیا ہے ——؟"

"لنگڑی پھوپو ——؟" شاہین نے تعجب سے کہا۔

"ہاں —— اور کیا ——"

شام تک راشد کو معلوم ہو گیا کہ لنگڑی پھوپو نے شنو بھائی سے نکاح کر لیا ہے۔ وہ اپنا سارا قیمتی سامان راتوں رات لے گئیں۔ رضیہ کے سیف میں سے وہ روپیہ اور زیور بھی لے گئیں جو ان کا حق تھا۔ لیکن اس پر واحد حسین قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ لنگڑی پھوپو نے کہلا بھیجا تھا کہ وہ مقدمہ بازی کے لئے تیار رہیں۔

"میں تو اسے پولیس میں دے دوں گی — اجاڑ صورت۔ بے شرم بڈھی اس بڑھاپے میں منہ کالا کرتے شرم بھی نہ آئی۔"

رضیہ کا چلاتے چلاتے منہ سرخ ہو گیا تھا۔

"کیا پاگل ہوئی ہو —" راشد نے اسے سمجھایا۔

اگر مقدمہ چلا تو آدھے "ایوان غزل" سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ جائداد روپیہ پیسہ۔ ہر چیز میں سے آدھا حصہ دینا پڑے گا۔"

"اللہ تو یہ اس خاندان کی لٹیاں — اجاڑ صورتاں۔

بڑھاپے میں بھی تو چین سے کے قابل نہیں۔ بال سفید کر دیئے کرتوڑ

دی۔ مگر پھر بھی بڈھی کی مستی نہیں گئی۔ جانے کب سے اس پیوٹ بڈھے پر نظریں رکھے بیٹھی تھی۔"

رضیہ مسلسل بڑبڑانے لگی۔

"چلو ایک رقیب رو سیا تو راہ سے ہٹا۔" اندر آ کر شاہین نے بڑی خوشی کے ساتھ غزل سے کہا۔

اور غزل سچ مچ رو پڑی ۔۔۔ شیخو بھائی کے چھن جانے پر ۔۔۔

"شاہین۔ اب اور کیا ہونے والا ہے ۔۔۔ ؟" اس نے پاگلوں کی طرح پوچھا۔

"جی ۔۔۔ آپ کو شرکت کی زحمت دی جانے والی ہے کہ میرے فرزند ڈاکٹر شاہین راشد کا عقد آج شام غزالہ سلطانہ سے طے پایا ہے۔ آپ کی شرکت باعث مسرت ۔۔۔"

اور اس عقد مسعود کی رات غزل بار بار سوچ رہی تھی کہ لڑکیاں کتنا جھوٹ بولتی ہیں۔ اس وقت کے بارے میں ۔۔۔ مجھے تو شہنائی کے سُر دل میں کوئی نشہ گھلتا نہیں لگ رہا ہے۔ نہ تو چاند تارے کہیں چمک رہے ہیں اور نہ میرے دل میں کہیں کلیاں لہک رہی ہیں ۔۔۔" ایوان غزل" کی ساری اداسی اور مایوسی کا اندھیرا میری طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے ۔۔۔"

گھبرا کر وہ نصیر والی ہیرے کی انگوٹھی کو بار بار اتارتی پھر پہن لیتی۔ تب شاہین اس کے پاس آیا۔ اور اس کی ٹھوڑی اٹھا کر بولا۔

"غزل ۔۔۔ اب ڈرنا چھوڑ دو۔ سوچنا چھوڑ دو ۔۔۔ آج سے وہی ہوگا جو تم چاہو گی ۔۔۔"

"نہیں۔ نہیں ۔۔۔" وہ چلا کر رو پڑی ۔۔۔

"شاہین خدا کے لئے میری اتنی انسلٹ مت کرو۔ میں کچھ نہیں چاہتی" مگر شاہین اپنی بات پر قائم رہا۔ اس نے غزل کو جو ہی کے نرم د ۔

نازک پھولوں کی طرح چھوا۔ اس کی صورت دیکھے گیا۔ اس کی باتیں سنتا رہا۔

شادی کے بعد وہ لوگ "ایوان غزل" کی اوپر والی منزل پر رہنے چلے گئے۔ مگر کرانتی کو ہاسٹل سے گھر بلوا لیا۔ اور وہ نیچے ایک کمرے میں رہنے لگی۔

"میں کلینک چلا جاؤں ۔۔۔ ؟" "آج کونسی پکچر دیکھنا ہے ۔۔۔ ؟" "آج تم کیا کھاؤ گی ۔۔۔ ؟ ذرا امی سے بات کرنے نیچے چلا جاؤں ۔۔۔"

وہ ہر ہر بات غزل سے پوچھ کر کرتا ۔۔۔

مگر اتنی محبت غزل کہاں سہت کر رکھتی۔ وہ جو بچپن سے جوتیاں اور تھپڑ کھانے کی عادی رہی تھی۔ شاہین کے خلوص اور محبت کی مٹھاس سے کانیاں لینے لگی۔ اسے یوں لگتا جیسے شاہین اس کا وہ شوہر نہیں ہے جس کے ساتھ زندگی بھر لڑنے اور ملنے کے اس نے خواب دیکھے تھے جس کے ظلم سہہ کر آنسو بہانے اور اس کے پیر دبانے کا ارمان وہ دل میں چھپائے بیٹھی تھی۔ شاہین تو ایک اجنبی تھا۔ ایک ایسا شخص جو اتفاق سے اس کی زندگی میں گھس آیا تھا۔ ایک اجنبی جو اسے بیوی نہیں طوائف سمجھتا ہے۔ اور اس کی جسم کی خواہشوں کو سمجھنا ہی اس نے اپنا سب سے اہم کام سمجھ رکھا ہے۔ جیسے غزل کو اتنے مردوں کے پاس صرف جسم کے مطالبے ہی لے گئے تھے۔

اسی لئے شاہین جب اسے اپنے پاس کھینچتا تو غزل اس سے میلوں دور ہو جاتی۔ اتنی دور کے شاہین کو چھونے کے لئے اس کے ہاتھ ہی نہ پہونچتے۔

اس نے غزل کے لئے نئی کار خریدی بنجارہ ہلز پر زمین لے کر مکان بنوانا شروع کر دیا۔ کرانتی کو اپنی بیٹی بنا کر پالنے کا وعدہ کیا۔ اور اسے کونونٹ میں داخل کر دیا۔ شوخ تیز و طرار کرانتی جتنی بڑی ہوتی جا رہی تھی اس کی دوگنی رفتار سے اس کی عقل بڑھ رہی تھی۔ اسکول کی ہر کلاس میں اس کی فرسٹ ڈویژن آئی مگر ٹیچر سے بدزبانی کرنے پر اسے سخت سزائیں بھی ملا کریں۔ شاہین اس کے لئے بہترین کپڑے خریدتا تھا، اس کی ہر فرمائش پوری کرتا تھا

ایک بار غزل نے اسے ٹوکا بھی۔

" آخر ہم کرانتی پر کیوں اتنا روپیہ ضائع کریں۔ اسے پڑھا دیا یہی کافی ہے ۔!

شاہین نے کہا۔

" تو کیا ہوا ۔ تم بچے پیدا مت کرنا۔ تاکہ کرانتی مزے میں رہے اور تم بھی بچوں کی جھنجھٹ سے آزاد رہ کر خوب مزے کرو عیش کرو ۔ !

" عیش، عیش ۔۔ آخر میں کتنا عیش کروں گی ۔" بعض وقت غزل سوچتی شاہین تو سچ مچ فرشتہ ہے ۔ وہ میرے آرام کے لئے کیسے کیسے پلان بنا رہا ہے ۔ مگر بچے کیوں نہ ہوں ۔ اس کا تو جی چاہتا تھا کہ چھ سات بچے ہو جائیں ۔ اور ان کی چیخ و پکار میں غزل اپنے آپ کو بھول جائے ۔ اس کا دماغ خالی ہو جائے ۔ اپنے ذہن کا یہ بوجھ وہ کسی کو نہ دے سکتی تھی اپنی اولاد کے سوا ۔"

شاہین تو اسے بے تحاشہ محبّت دے دے کر پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ اور کرانتی بے حد سرکش تھی بے انتہا غیر جذباتی ۔ وہ غزل کی محبت کا بھی مذاق اڑاتی تھی ۔ ایک بار آٹھ برس کی کرانتی نے اس سے پوچھا تھا۔

" غزل آنٹی رضیہ آنٹی کہتی ہیں کہ جب آپ کے بچہ ہو جائے گا تو آپ مجھ سے محبّت نہیں کریں گی ۔۔۔؟"

" تو میری چاند ہے ۔ چاند ۔۔ بھلا میں اپنی کرانتی سے بھی کبھی محبّت نہیں کر سکتی ۔ پگلی ۔" اس نے سچ مچ کرانتی کو سینے سے لگا کر کہا تھا۔

" مگر مجھے تو تعجب ہوتا ہے آنٹی کہ آپ کو اور شاہین انکل کو مجھے پالنے سے کیا فائدہ ۔۔۔؟ میں کوئی آپ کی بیٹی تھوڑی ہوں ۔۔۔؟

" بے وقوف ۔۔۔ کیا ہر بات کسی فائدے کے لئے کی جاتی ہے ۔؟"

" تو کیوں نہیں کی جاتی ۔ ؟" کرانتی نے بھی چلا کر جواب دیا ۔

" دیکھئے نا آنٹی ۔ اب آپ نے مجھ پر اتنے بہت سے پیسے خرچ کر کے مجھے بڑا کر دیا نا تو اس کے بدلے میں مجھے بھی آپ سے محبّت کرنا پڑے گی نا ۔؟

غزل کتاب ہاتھ سے رکھ کر کرانتی کو دیکھنے لگی ۔

یہ دس بارہ برس کی بچی ۔۔۔ جو جانتی تھی کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے ۔ اور جنہوں نے اسے جینا سکھایا ہے وہ ان کی مقروض ہے ۔

میرے اللہ ۔۔۔ کرانتی کو پناہ کہاں ملے گی ۔۔۔؟

وہ تو مجھ سے بھی زیادہ زہریلی رہی ہے ۔۔۔ کیا وہ بھی زندگی بھر تنہائی کی آگ میں جلے گی ۔ لوگ اس پر ترس کھائیں گے ۔ یا نفرت کریں گے ۔

قیصر اور سنجو کی یہ نسل ۔۔۔ " ایوان غزل " میں کیا کرنے کے لئے آئی ہے ۔

٭ ٭ ٭

غزل کو ہر وقت گم سم دیکھ کر شاہین کے دل پر چوٹ سی لگتی۔
یہ لڑکی اب بھی خوش نہیں ہے۔ اب میں اور اس کے لئے کیا کروں ــــ!"

شاہین نے ڈاکٹری کے علاوہ فرائیڈ کو بھی پڑھا تھا اور کارل مارکس کو بھی ــــ وہ اپنے وقت کی تمام تحریکوں سے متاثر تھا اس نے انسان کے جسم پر وفیسر ج کی تھی۔ اور انسان کے ذہن کی پیچیدگیوں پر بھی غور کیا تھا۔ ستائیس برس میں اس نے دنیا کو کھول کر ادھیڑ کر۔ پرزے پرزے کر کے بھی دیکھا تھا۔ اور اپنی مٹھی میں تڑپنے والی تتلی کی طرح محسوس کیا تھا ــــ اس نے اپنے خاندان اور اپنی روایتوں کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ اس نے اپنے والدین کے احساسات کو اپنی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں مانا۔ کیونکہ وہ زندگی سے محبت کرتا تھا۔ اسے اپنی ذات کی آزادی بہت عزیز تھی۔ شاید اسی لئے اس نے کسی عورت سے ابھی تک عشق نہیں کیا تھا۔ صرف اپنے جسمانی اور ذہنی تقاضے ضرور پورے کئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ غزل اس کی زندگی میں پہلی لڑکی نہیں تھی۔

وہ جانتا تھا کہ غزل کی زندگی میں بھی وہ پہلا مرد نہیں ہے۔ لیکن اس نے عورت کے جسم کے پاکیزگی کو کبھی اہمیت نہیں دی۔

اس نے تو محبت کو بھی کبھی قابل توجہ نہیں سمجھا۔ ممکن ہے

غزل کا مسئلہ گھر میں یوں نہ اٹھ کھڑا ہوتا تو وہ ابھی اور دس پانچ برس تک میڈیکل کالج کی لڑکیوں اور نرسوں کے ساتھ وقت گزار دیتا ممکن ہے اسی لڑکی سے شادی پر راضی ہو جاتا۔ جو امی نے اس کے لئے ڈھونڈھ رکھی تھی ــــ مگر یہ خود اس کی مرضی پر تھا۔ وہ اپنے مسئلے پر۔ اپنے معاملے میں ہر کام میں خود مختار رہنا چاہتا تھا۔ کسی کی دھونس اور مصلحت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ان لڑکیوں کو پل بھر میں پہچان لیتا تھا جو مرد پر کئی طرح سے جال پھینکتی ہیں۔ اسے ہمیشہ کے لئے پھانسنے کو ــــ اگر غزل بھی اس پر توجہ دیتی۔ اگر امی اور لنگڑی پھوپو غزل کے مسئلہ کو اتنی اہمیت نہ دیتیں تو شاید وہ بھی شیخو بھائی کی بجائے کسی اور مرد کی تلاش میں روانہ ہو جاتا جو غزل کا ہاتھ تھام سکے۔

مگر غزل اس بات کو ناممکن کیوں سمجھتی تھی۔ کہ وہ غزل سے شادی کر سکتا ہے ــــ؟ امی یہ کیوں سمجھتی ہیں کہ ایک بدنام اور بے سہارا لڑکی ان کی بہو نہیں بن سکتی! اور اس نے یہ کر دکھایا۔

پھر اس نے غزل کو اس بات کا بھی یقین دلانا چاہا کہ وہ اس کے ساتھ شوہر کا ہر فرض بنھائے گا۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا!"

مگر غزل شاید ابھی تک پرانی یادوں کے حصار سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔ جاہل اور ناسمجھ لڑکی۔ وہ شاید اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ نصیر کی پہلی محبت ہی اس کی حق دار ہے۔ اسی لئے نصیر کی دی ہوئی انگوٹھی اس کی انگلی میں پڑی تھی۔ اور وہ شاہین کے ساتھ یوں نبھا رہی تھی جیسے اس کی بیوی نہ ہو۔ اس کی خادمہ ہو۔ دو پیسے کی چھوکری۔ جسے کسی بھی وقت دھتکارا جا سکتا ہے۔

رفتہ رفتہ شاہین نے پکچر جانے کا پروگرام بنانا چھوڑ دیا کیونکہ

ڈھونگ رچائے گا۔! وہ مجھے کبھی اپنے دوستوں سے نہیں ملاتا میں کہیں باہر جاؤں تو بار بار یہی دیکھتا رہتا ہے کہ میں کسے دیکھ رہی ہوں اس نے مجھ سے آج تک کبھی گانے کی فرمائش نہیں کی۔ کبھی نصیر بلگرای بجان اور سرور کے بارے میں نہیں پوچھا۔

رفتہ رفتہ شاہین کی مقبولیت بڑھتی گئی ۔۔۔ کیونکہ غزل سے مایوس ہو کر اس نے اپنے کام پر پوری توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ ابھی تک یوں بھی حیدرآباد میں اچھے ہارٹ اسپیشلسٹ بہت کم تھے۔ اس لئے اس کا سارا وقت اپنے کام میں گذرنے لگا۔ صبح آٹھ بجے سے کلینک شروع ہو جاتا۔ دوپہر میں کھانے کے وقت غزل سے کچھ ہنسی مذاق چلتا اس کے بعد رات کے گیارہ بجے تک ہاسپٹل کی ڈیوٹی پھر مریضوں کے گھروں پر جانا۔

اور پھر رات آتی ۔۔۔ اندیشے ۔۔۔ مصلحتیں۔ احتیاطیں لئے ہوئے اور غزل کو رُلا رُلا دیتی ۔

شاہین کے اتنے محتاط رہنے پر ایک دن غزل جھنجھلا گئی۔

" شاہین۔ اب ہماری شادی کو پانچ برس ہو گئے۔ میں نے بہت عیش کر لئے۔ اب مجھے اپنا بچہ چاہئے۔ میں کب تک اکیلی رہوں ؟

" میں جو ہوں تمہارے لئے ۔۔۔ بے وقوف۔ بچے ہوں گے تو اور پریشان ہو جاؤ گی۔ دیکھ لو کراتی اپنے والدین پر کیسی تنقید کرتی ہے تو تم یونہی لوگوں کے خوف سے سہمی رہتی ہو۔"

شاہین کی بات سن کر وہ چپ ہو گئی ۔۔۔ "

" تم ٹھیک کہتے ہو۔"

" میں کون تھی ۔۔۔ کیا تھی ۔۔۔ میں اس بات کو بھول چکی ہوں مگر شاہین نہیں بھولا۔ اس کے بچے بھی نہیں بھولیں گے۔ اسی لئے وہ اپنے

باہر نکلتے ہی غزل گھبرا گھبرا کے ان شناسا چہروں کو ڈھونڈھے جاتی تھی جو انہیں ساتھ دیکھ رہے ہوں گے کہیں کوئی مل نہ جائے، کوئی کچھ پوچھ نہ بیٹھے۔

جھنجھلا کر شاہین کہتا۔

" آخر تم یہ کیوں چاہتی ہو کہ اس دنیا میں تم دوسرا جنم لو تاکہ لوگ تمہیں نہیں پہچانیں ۔۔۔! ادھر ادھر دیکھنا چھوڑ دو ۔۔۔ تم صرف مجھے دیکھا کرو۔ میں نے تمہارے اسی خوف کی وجہ سے لوگوں سے تمہیں ملانا چھوڑ دیا ہے ۔"

اور غزل گھبرا کے سر جھکا لیتی ۔

پردے پر ڈائرکٹر جانے کیا جھک مارتا، دلیپ کمار کیسی ایکٹنگ کرتا۔ بس یہاں تو دونوں ایک جگہ بیٹھے اپنے اپنے دلوں میں جانے کیا کیا خوف، اندیشے اور شکایتوں کی ہانڈی پکنے جاتے۔

" چلو اٹھو ۔۔۔ پکچر ختم ہو گئی ۔۔۔" وہ کھڑا ہو جاتا

غزل چونک کر کھڑی ہو جاتی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اپنی دھن میں غزل نے پکچر ہال سے باہر نکلتے وقت شاہین کی بجائے کسی اور مرد کے ہاتھ میں ہاتھ تھما دیا۔ کسی اور کے قدموں سے قدم ملا کر چلنے لگی ۔۔۔ شاہین نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کار کی طرف بڑھ گیا۔ پھر چونک کر غزل نے اپنے آس پاس دیکھا ۔۔۔ نیلی کار کو پہچان کر وہ سمجھ گئی کہ شاہین ہی اس کے اندر بیٹھا ہو گا ۔۔۔

رات کو کلینک سے آنے کے بعد اب وہ غزل سے چونچلے لگانے کی بجائے اپنے اسٹڈی روم میں اخبار رسالے پھیلا کر بیٹھ جاتا۔ اب غزل کا کلیجہ اور پھٹتا تھا۔

" دیکھا ۔۔۔ آخر وہ مجھ سے بے زار ہو ہی گیا کب تک زبردستی کا

بچوں کی ماں مجھے بنانا نہیں چاہتا۔ وہ بدنام لڑکی جس سے شادی کرنے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ مگر شاہین نے اس کی خاطر یہ ایثار کیا۔ اتنی بڑی قربانی دی۔ وہ چاہتا تو شادی کے دو چار مہینے بعد مجھ سے کھیل کر مجھے رخصت دے دیتا۔ مگر اس فرض کو نبھائے جا رہا تھا۔

اسی لئے وہ فوزیہ کے بچوں کو کاندھے پر اٹھائے اٹھائے پھرتا بچوں کے کھلونے اور کلینڈر خرید کر لاتا ہے۔ پندرہ برس کی کرانتی سے بچوں کی طرح باتیں کرتا۔ مگر میری کوکھ سے کونپل اگا کر "ایوان غزل" کے باغ کی خوبصورتی بگاڑنا نہیں چاہتا۔

"اب کیا سوچنا شروع کر دیا ــــ !" اس نے غزل کا سر ہلا کر پوچھا اور پھر سنجیدگی سے کہا۔

"غزل۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں خوش نہیں رکھ سکا۔ میں وہ مرد نہیں تھا۔ تم نے جس کے خواب دیکھے تھے۔ بعض وقت مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم نے میری خواہش پر اپنے آپ کو قربان کر دیا ہے۔ مگر یقین مانو میں تمہارے کسی راستے پر نہیں کھڑا ہوں۔ تم جہاں چاہے جا سکتی ہو۔ جو چاہے کر سکتی ہو ــ"

"میں جانتی ہوں ــ" غزل نے بڑی بے بسی کے ساتھ چلا کر کہا۔ "مگر خدا کے لئے اپنی زبان سے یہ مت کہو کہ اس گھر سے چلی جاؤ" اور پھر وہ چپ ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے غلطی کی ہے۔ وہ مجھے اب ہر جگہ بھیجنے کو تیار ہے۔ ہر لحہ چھوڑنے کو راضی ہے۔ وہ میری راہ سے ہٹتا جا رہا ہے ــ مگر میں کہاں جاؤں ــ ؟

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"بس اب شروع ہو گیا رونا ــــ" شاہین نے برا مان کر کہا۔

"تم سے تو بات کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ کہ آخر میں کیا

کروں ــ ؟ ساری زندگی تو ایک عذاب ہو گئی ہے۔"

وہ الماری کھول کر شراب کی بوتل نکالنے لگا۔

صبح ناشتے کی میز پر وہ دونوں منہ سجائے بیٹھے تھے کہ کرانتی اپنی رپورٹ لے کر آئی۔ اس کا میٹرک کا رزلٹ آیا تھا۔ وہ فرسٹ ڈویژن پاس ہوئی تھی۔

"انکل۔ اب آپ مجھے سائیکل ضرور دلائیے۔ آپ نے پرومس کیا تھا۔"

"لڑکیاں سائیکل نہیں چلاتیں۔ تم نے کسی لڑکی کو سائیکل چلاتے دیکھا ہے۔" غزل نے اسے سمجھایا۔

"نہ چلائیں۔ میں تو چلاؤں گی۔ تو کوئی میرا کیا کر لے گا۔ ؟"

"ابھی سے اتنی خود سری۔ کبھی میری بات نہیں مانتی۔" غزل نے مدد کے لئے شاہین کو دیکھا۔

"یہ ایوان غزل کی روایت ہے۔" اور پھر شاہین نے کرانتی سے کہا "ہم لا دیں گے تمہیں سائیکل۔"

"اور لاوارث لڑکیوں پر رحم کھانے کی روایت آپ قائم کر رہے ہیں۔" غزل نے تنک کر پوچھا۔

"رحم ــــ ؟ میں کسی پر رحم کر سکتا ہوں ــ" شاہین نے سگریٹ جلا کر ماچس کی تیلی بجھائی۔

"میں تو ظالم بے رحم ڈاکٹر ہوں۔ دل چیر چیر کے پھینکنے والا۔ انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والا۔ میں کیا جانوں رحم کیا ہوتا ہے۔ جذبات کیا ہوتے ہیں۔ محبت کیسی ہوتی ہے۔ ؟"

"صاف کہو نا کہ تمہیں مجھ سے کچھ نہیں ملا۔ محبت نہ قدر نہ انصاف" غزل غصے کے مارے چلانے لگی۔

"ایک رنڈی سے بیاہ کر کے تمہیں اور کیا ملے گا ــ ؟ تم کس چیز کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ تم نے مجھے محبت، دولت اور اپنی پناہ کی بھیک دی۔ مگر

میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بعد میں پچھتاؤ گے۔"

"مگر آپ کو پچھتانے کی کیا ضرورت ہے انکل۔۔۔؟ اگر آنٹی آپ کو سوٹ نہیں کرتیں تو آپ ڈائیورس کیوں نہیں لے لیتے۔۔۔؟"

کرانتی نے شاہین کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اچانک کہا۔

اس کی بات سن کر غزل اور شاہین اچانک چپ ہو گئے۔ کیونکہ وہ دونوں اس بات کو بھول چکے تھے کہ کرانتی اب پندرہ سال کی ہو چکی تھی۔ اور اس نے بہت سی کتابیں، ناولیں، کہانیاں پڑھ ڈالی تھیں۔ وہ دن رات کتابوں میں کھوئی رہتی تھی۔ اس کے باوجود اس کی اسکول کی رپورٹ بری نہیں آئی۔ اس کے بہت کم دوست تھے۔ وہ ہر جگہ تنہا تنہا اکیلی اکیلی پھرتی چھٹیوں میں پڑھتے پڑھتے تھک جاتی تھی تو اکیلی کہیں گھومنے نکل جاتی رنگ و برش لئے پینٹنگ کرتی۔ کھڑکی کھولے گھنٹوں بازار کا نظارہ کئے جاتی۔

غزل نے کتنا ہی چاہا کہ کرانتی اس سے دوستی بڑھا لے۔ وہ بھی تو اکیلی تھی۔ کوئی تو ہوتا جو اس کی بات سنے۔ جس سے وہ اپنے دل کا حال کہے نیچے رہنے والی رضیہ اور راشد نے تو اس سے بالکل ہی قطع تعلق کر لیا تھا۔ اسے نیچے اترنے کا حکم نہیں تھا۔ شاہین کو اپنا بنا لینے کے جرم میں کئی بار غزل نے سوچا۔ رضیہ سے جا کر کہے کہ شاہین اس کا نہیں ہے۔ اس نے رضیہ سے کچھ بھی نہیں چھینا ہے۔ اس لئے اس نے کرانتی سے دل بہلانا چاہا۔ کیونکہ غزل کرانتی کو بہت چھوٹا سمجھتی تھی۔ بالکل نادان بچی۔ مگر آج اسے معلوم ہوا کہ وہ غزل اور شاہین کے نازک رشتے پر بھی غور کر چکی ہے۔

اب غزل کہاں جاتی "ایوان غزل" نے اسے ابھی تک شاہین کی داشتہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ نہ کبھی راشد نے اسے دلہن کہہ کر پکارا تھا۔ نہ رضیہ نے اسے ماں بننے کی دعائیں دیں۔ رضیہ نے اسے

کوئی خاندانی زیور تک نہ پہنایا تھا۔ اس کی انگلی میں صرف وہی انگوٹھی تھی۔ جو نصیر کے خاندان کی بہو کو پہننا چاہئے۔ اس انگوٹھی کے بارے میں بھی کبھی شاہین نے نہیں پوچھا کہ یہ کس نے دی تھی۔ کئی بار غزل کے دل میں آیا کہ اب جبکہ وہ مسز شاہین بن چکی ہے۔ یہ انگوٹھی اس کی انگلی میں کیوں ہے، اس نے انگوٹھی اتار کے سنگار میز پر ڈال دی تو اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ بیزار سی ہو گئی۔ جیسے اس کا دم نکل رہا ہو۔ میں نے نصیر سے کہا تھا کہ میری جان اب اس انگوٹھی میں ہے۔ اس نے نصیر کے بغیر جینا سیکھ لیا۔ مگر انگوٹھی کے بغیر وہ چند منٹ بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک بار کرانتی نے اسے انگوٹھی سے کھیلتے دیکھ لیا۔

"یہ آپ کے انگیجمنٹ کی انگوٹھی ہے نا آنٹی۔۔۔؟"

"ہاں! اس انگوٹھی میں میری جان ہے۔" جانے کیسے اتنے جذباتی لہجہ میں اس نے کرانتی سے یہ بات کہی۔ حالانکہ اس دن کے بعد سے وہ کرانتی سے بات کرتے وقت بڑی محتاط رہتی تھی۔

"آپ کی جان۔۔۔! وہ کیسے آنٹی۔۔۔؟"

"سنو کرانتی۔۔۔!" اس نے فوراً بات بدل کر کہا۔

"میں مر جاؤں نا۔ تب بھی تم اس انگوٹھی کو میرے ہاتھ سے مت نکالنے دینا۔"

"میں سمجھ گئی۔ یہ انگوٹھی آپ کے رومانس کی یادگار ہے۔ مگر آپ کو یہ کیوں دھوکہ ہے آنٹی کہ آپ کی جان انگوٹھی میں آ سکتی ہے۔" کرانتی اس کی جہالت پر ہنسنے لگی۔

"تم کیا جانو ان باتوں کو۔ جب بڑی ہو جاؤ گی تو پتہ چلے گا۔"

"تو کیا آنٹی آپ مجھے چھوٹا سمجھتی ہیں۔ سولہ سال کی لڑکی۔ اوہ۔ میں اتنی بڑی کتابوں نا آنٹی۔۔۔ اب تو میں نے سیکس پر بھی کتابیں پڑھی ہیں۔"

"سیکس پر ــــ؟" غزل چونک پڑی۔

"ہاں آنٹی ــ" اس نے اپنی بات کی دھن میں غزل کے تعجب کو بالکل نظرانداز کر دیا۔

"آنٹی آپ نے کبھی محبت کی۔ پھر شاہین انکل سے شادی بھی کر لی۔ اور اب رو رو کے ان ہی کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کا کیس۔"

کرانتی بڑے اطمینان سے غزل کے پلنگ پر لیٹی تلا بازیاں کھا رہی تھی اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اس کے کٹے ہوئے گھنے بال سارے چہرہ پر بکھر گئے تھے۔ اور چھوٹی سی اسکرٹ کے نیچے اس کی سیاہ صحت مند رانیں نظر آ رہی تھیں۔

"تو اسی لئے تم نے ابھی تک کسی سے محبت نہیں کی۔" غزل نے بڑی مشکل سے ہنسی مذاق کا موڈ برقرار رکھا ــ وہ بہت دن سے چاہتی تھی کہ کرانتی سے کھل کر باتیں کرے اور اس کی کہیں شادی ہو جائے تو اس جھنجھٹ سے نجات ملے۔

"میں محبت کیسے کروں آنٹی ــ! کالج میں بھی بہت سی لڑکیاں ہی پڑھتی ہیں ــ" وہ تکیہ سینے کے نیچے رکھ کر اوندھی لیٹ گئی۔

"کسی ایک ہی لڑکے کے بارے میں کتنا ہی سوچوں مگر پھر خیال بھٹک جاتے ہیں ــ" وہ بڑی معصومیت سے کہہ رہی تھی۔

"اچھا آنٹی ــ ایک بات بتاؤں؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ایک لڑکا سعادت تو مجھ سے محبت کر بھی چکا ہے۔"

"اچھا ــــ؟" غزل سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"کیا کیا ہوا ــ! مجھے پوری بات سناؤ ــ"

مگر کرانتی پھر لیٹ گئی جیسے کوئی بہت اہم بات نہ ہوئی ہو۔

پھر وہ دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر چت لیٹ گئی اور چھت کی طرف دیکھ کر بولی:

"میرا کلاس فیلو ایک لڑکا ہے سعادت، وہ اکثر میرے پیچھے پیچھے گھومتا تھا آنٹی۔ ہر بات میں میری تائید کرتا۔ میرے لئے کیڈبری چاکلیٹ اور چیونگم لاتا تھا میرے نوٹس بھی تیار کر کے دیتے تھے ــــ وہ ہماری کلاس کا بڑا پڑھاکو لڑکا ہے۔ تو ایک دن کالج جاتے وقت بس میں اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے بہت چاہتا ہے۔ بس ہر وقت میرا ہی خیال ہے اسے ــ تو آنٹی میں فوراً سمجھ گئی اس کی بات ــ" اور پھر کرانتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"مگر آنٹی ــ سچی بات کہنے پر آپ خفا تو نہیں ہوں گی ــ؟"

"نہیں ــ تم پوری بات سناؤ ــ" غزل جانتی تھی۔ یہ ان لوگوں کی اولاد ہے۔ جنہوں نے سچ کی لڑائی میں جان دی تھی۔

"تو آنٹی ایک دن جب سعادت نے مجھ سے کہا کہ آج رات ٹھیک بند پر ملیں گے تو میں وہاں چلی گئی۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ اب یہ بتاؤ کسی ہوٹل میں کمرہ لوگے یا اپنے گھر مجھے لے چلوگے۔ کیونکہ آپ کے ڈر سے میں اسے یہاں تو نہیں لا سکتی تھی نا ــ"

اس نے اپنے بالوں کی لٹیں جھٹک کر بڑی شوخی سے غزل کو دیکھا جو اس کی بات منہ کھولے سن رہی تھی۔

"میری بات سن کر وہ گھبرانے لگا۔ پھر کہنے لگا کہ کرانتی یہ بتاؤ کہ ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو سکتے ہیں۔ یا نہیں ــ؟ لو ــ پھر وہی جہالت کی باتیں ــ سچی آنٹی مجھے غصّہ آنے لگا۔ میں نے کہا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تم سے صرف اسی وقت کی بات کر رہی ہوں ــ تم مجھے پسند ہو اس لئے میں تمہارے ساتھ چلوں گی ــ مگر آنٹی ــ وہ تو بس ایک ہی بات پر اڑا ہوا تھا کہ پہلے یہ بتاؤ مجھ سے شادی کروگی یا نہیں ــ؟"

"پھر کیا ہوا ــ؟" غزل نے لرز کر پوچھا۔

"بس میرا موڈ خراب ہوگیا——" وہ زور زور سے اپنا پیر ہلانے لگی۔

"میں کیوں کرتی اس کے ساتھ شادی۔ شادی کے بعد زندگی بھر مجھے اس کی بات ماننا پڑتی۔ اور وہ مجھ پر ایثار و قربانی کے احسان رکھتا۔ آپ ہی سوچیے نا آنٹی کہ کوئی بھی میاں بیوی مکمل آزادی کے ساتھ کہاں رہتے ہیں۔ اور میں تو ایسا کبھی نہیں کروں گی کہ دل نہ چاہنے پر بھی اپنے شوہر کو دھوکا دیے جاؤں۔"

"تو آنٹی میری باتیں سُن کر فوراً بھاگا کہ پھر کبھی آؤں گا۔"

ہاہاہا" وہ تکیے میں منہ چھپا کر خوب ہنسی۔

"آنٹی یہ جو ہمارے کالج کے لڑکے ہیں نا۔ سب کے سب اپنے پیرنٹس سے بہت ڈرتے ہیں۔ جب تک ان کی ممی کی پسند نہ ہو، کسی لڑکی سے لو نہیں کر سکتے۔ سب بڑے بزدل ہیں۔"

"تم کون ہو۔" غزل نے اسے غور سے دیکھ کر پوچھا۔

"میں! میں تو بس کرانتی ہوں۔ آنٹی! آپ کو معلوم ہے میری ممی اور ڈیڈی نے کیا کیا غلطیاں کی تھیں! ہمارے لیکچرار گوپال ریڈی نے مجھے سب بتایا ہے۔ وہ بڑے جینئس اسکالر ہیں۔ آپ سے اور انکل سے ملانے میں کبھی انھیں گھر لاؤں گی۔ آنٹی، گوپال ریڈی نے مجھے بتایا ہے کہ مجھے کل کیا کرنا ہے۔ کدھر جانا ہے۔!"

کرانتی باتیں کرتے کرتے تھک گئی۔ بڑی دیر تک چھت کو گھورتی رہی۔ جانے کیا سوچے گئی۔

پھر اچانک اٹھ بیٹھی اور پلنگ سے نیچے کود کر بولی۔

"اب چلے ہم بھی اپنا حق چھیننے۔

مگر غزل نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ چپ چاپ بیٹھی فضا میں گھور رہی تھی۔

اور

اس کے دونوں گال آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے ..

"ایوانِ غزل" کا وہ سجا بنا باغ اب اُجاڑ پڑا تھا۔ ساری ڈیوڑھی میں سناٹا گونجتا رہتا۔ سوکھے پتے آنسوؤں کی طرح دن بھر گرا کرتے۔ پھر کبھی شاہین کے حکم پر کریم دھوبی کو بلایا جاتا جو سارے پتے سمیٹ کر لے جاتا تھا۔

آم اور سیتا پھل، چیکو اور نارنگیاں خود ہی پک پک کر گرتی تھیں مگر انہیں اٹھانے کے لیے کوئی بچہ نہیں دوڑتا تھا۔ باغ کے تمام پودے ڈسپلین اور قواعد کو بھول کر کانٹے دار جھاڑیوں میں مل گئے تھے۔ روشیں ٹوٹ گئی تھیں اور گلاب کی کیاریوں کو کاٹ کر مالی نے وہاں مکئی کے بھٹے بو دیئے تھے۔ اندر بھی سارے کمرے بند پڑے تھے۔ رضیہ سرِ شام درانڈے کی لائٹ کھول دیتی۔ یا اس کے کمرے کا بلب جلتا تھا۔ گیارہ بجے راشد واپس آتا تو وہ دونوں وہیں چوکی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ بسم اللہ بی جلدی جلدی برتن سمیٹتی اور سو جاتی تھی۔

"ایوانِ غزل" کا سب سے بڑا ہال البتہ ابھی تک آباد تھا کیونکہ راشد وہیں بیٹھتا تھا۔ اس نے اب گتے داری چھوڑ کر کانگریس میں شرکت کر لی تھی اور پہلا الیکشن ہوا تو کانگریس کے ٹکٹ پر وہ بھی کھڑا ہوا۔

چند دن بعد رضیہ نے کرانتی کو بمبئی اوپنہ بھیج دیا تھا۔ اوپر والے حصے میں بھی

بہت کم شور مچتا۔ کالج سے آنے کے بعد کچھ دیر کرانتی کی چیخ و پکار بھی مذاق گونجتا تھا۔ اس کے بعد وہ کوئی کتاب لے کر اپنے کمرے میں لیٹ جاتی تھی۔ نیچے غزل اور کرانتی کی آواز بھی نہ پہنچتی تھی۔

باہر لان میں پھدکنے والی رنگین چڑیا اب بھی دالان کے سامنے، کریا پاپت کے درخت پر آ کر بیٹھتی تھی۔ اور چاروں طرف گھوم گھوم کر دُم ہلا ہلا کر ہر شخص کا انگریزی میں احوال پوچھتی ——— شوں شوں۔ شو ——— دو دو ——— یہ سیٹی بجانے والی ننھی سی چڑیا حیران تھی کہ اس گھر پہ ایسا سناٹا کیوں چھا گیا ہے۔ واحد حسین کہاں گئے جنھوں نے اس چڑیا کو مخاطب کر کے اپنی پرانی غزل سنائی تھی لنگڑی پھوپو کہاں ہیں جنھیں اپنی آواز کے آگے اس چڑیا کی آواز بھی نہ بھاتی۔

"بھاگ اُجاڑ صورت یہاں سے۔ جب دیکھو پکارا کرتی ہے۔"

وہ ننھے ننھے بچے کہاں گئے جو سوپ کا جال بنا کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ تنک مزاج بشیر، جس نے ایک بار اسے تھپڑ کھینچ مارا تھا ——— رحم دل نبو دل۔ جو اسے ہمیشہ روٹی کے ٹکڑے ڈالا کرتی تھی۔ شوخ و چنچل چاند جو اس کی آواز میں آواز ملا کر خود بھی سیٹی بجانے لگتی۔ روتی صورت غزل۔ جسے کبھی اس کی سیٹی بھی نہ ہنسا سکی ———

ادھر نوزیہ بھی مہینوں میکے نہ آتی۔

اپنے اکلوتے بھائی کی اس حماقت پر اسے بھی ماں کے ساتھ بے حد غصہ آیا تھا۔ افسوس بھی ہوا کیونکہ بھائی کے بیاہ میں گھوڑے جوڑے پر لڑائی لڑنے اور بہنوں گھر میں دھوم مچانے کے ارمان دل ہی میں گھٹ کر رہ گئے تھے۔ اس کے باوجود وہ غزل سے نفرت نہ کر سکی۔ کیونکہ غزل اس کی ہم عمر سہیلی بھی تھی۔ اس کے بچپن کی ساتھی تھی۔ اور شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قسمت نے نوزیہ کو کچھ نہ دیا تھا۔ شوہر کی محبت سے مایوس

ہو کر اس نے اپنے بچوں میں پناہ لی تھی تو اکٹھے سات بچے پیدا کر ڈالے۔ ان میں سب سے چھوٹے بچے کو رضیہ پالتی تھی کہ فوزیہ کا کچھ بوجھ کم ہو۔ پھر جب اس چھوٹے سے چھوٹا آجاتا تو بڑا ماں باپ کے پاس بھیج دیا جاتا تھا۔ فوزیہ کا ڈاکٹر شوہر اب تین بیویوں کا رکھوالا تھا۔ ہر بیوی کے پانچ سات بچے تھے۔ اسی لئے وہ بیویوں سے گھبرا کے گھر کی ماماؤں اور ہاسپٹل کی نرسوں میں پناہ لیتا تھا۔ فوزیہ کی وہ بے پناہ خوبصورتی اور تنک مزاجی جانے کہاں چلی گئی تھی۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ ہر بار بچے کی پیدائش پر سب ڈر جاتے تھے کہ اب کی نہ بچے گی۔ مگر اس کا ڈاکٹر شوہر دو چار بوتلیں خون چڑھا کر اُسے پھر زندگی کے میدان میں گھسیٹ لاتا کہ اگلے سال وہ ایک اور بچہ پیدا کر سکے۔ اب اس کی ساس کو سمدھیانے کے خراب ہی پہ کوئی اعتراض نہ تھا مگر فوزیہ خود ہی گھر سے باہر نہ نکلتی۔ سب سے بڑی بیوی ہونے کی وجہ سے شوہر کے سارے کاموں اور مسائل کی وہی ذمہ دار تھی۔ پھر سوکنوں کے جھگڑوں سے نبٹنا۔ ان کی اولادوں کی ضرورتیں پوری کرنا۔

اس کے باوجود میکے آتی تھی تو اس کا سارا وقت اوپر غزل کے ساتھ گزرتا تھا۔ وہ غزل کی ہم عمر تھی۔ مگر اب اس سے دس برس بڑی لگتی۔ کہیں کہیں سے بال سفید ہو رہے تھے۔ بدن سوکھ کر بے رونق ہو گیا تھا۔ اختلاج، خون کی کمی اور نقاہت کے بارے اس کے چہرے کی رونق غائب ہو چکی تھی۔

فوزیہ غزل کی قسمت پہ رشک کرتی تھی۔ کیسی خوش قسمت نکلی یہ لڑکی۔ بچپن سے من مانے عیش کئے۔ مردوں کے ساتھ خوب گلچھرے اڑائے اور پھر شاہین جیسے تعلیم یافتہ خوبصورت خاندانی لڑکے پر چھاپہ مارا —— لیجئے —— سب کو ادھر ادھر ڈھکیل پورے "ایوان غزل" کی مالکن بیٹھی۔ ا

دونوں کی زندگی کیسی پرسکون تھی! فوزیہ نے کبھی بھائی بھاوج کو لڑتے دیکھا نہ ایک دوسرے کی کوئی شکایتیں کرتے سنا۔ سننے پر

سہاگ بچے بھی نہ ہوئے۔ جو فوزیہ کے لئے اللہ کا سب سے بڑا قہر تھے، غزل کو دیکھو کیسے مزے میں ہے۔ پچیس برس کی ہو چکی۔ مگر سولہ سال کی لڑکیوں والی صورت ہے۔ طرح طرح کے فیشن۔ قسم قسم کا میک اپ —— شوہر کیوں اودھر اودھر بھٹکے گا! دیکھو کیسا بیوی کا پلو تھامے پھرتا ہے —— فوزیہ نے بھائی کے تعلق سے کبھی کوئی خبر نہ سنی کہ اس نے کسی ماما کو بھی اندھیرے اُجالے چھیڑا ہو۔

اس کے باوجود وہ اوپر آتی تو سونا سونا "ایوان غزل" دیکھ کر اُسے وحشت ہوتی تھی۔ اب اس گھر میں کون بچے کھیلیں گے!

اگلے تو شاہین کے ہاں بھی کونپلیں نہ پھوٹیں تو کیا "ایوان غزل" کا تاریخی باغ اجڑ جائے گا!

فوزیہ کے ماں باپ نہ چاہیں مگر فوزیہ تو ہر نماز کے بعد بھائی کا چراغ روشن ہونے کی دعائیں مانگتی تھی۔ بھابی کو حکیموں، ڈاکٹروں کے پاس جانے کا مشورہ دیتی۔ اسے تعجب تھا کہ یہ کیسی عورت ہے جسے بچے کی آرزو ہی نہیں ہے۔ اکیلی گھر میں پڑی رہتی ہے۔ فوزیہ کے چھوٹے بچے کو اوپر بلا کر اس کے ساتھ کھیلتی ہے مگر اپنا بچہ نہیں چاہتی۔ آخر ایک دن فوزیہ نے کہہ دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا غزل کہ تم اپنا علاج کیوں نہیں کرواتیں؟"

"اس لئے کہ میں بیمار نہیں ہوں۔" غزل نے آہستہ سے کہا۔

"تو پھر ——————" فوزیہ کو سخت تعجب ہوا۔

"سنو فوزیہ ——————" غزل نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا ——

"تم اس بات کو یاد کیوں نہیں رکھتیں کہ میں ایک رنڈی ہوں۔ دس مردوں کی ٹھکرائی ہوئی —— اور شاہین نواب محمد حسین کا پوتا —— اختر الدولہ کا نواسہ ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ "ایوان غزل" کی رگوں میں دوڑنے والا خون ناپاک ہو جائے؟ تم نے ترس کھا کر مجھے اپنے گھر میں

پناہ دی ہے نوزیہ ۔ مگر اس نیکی کے بدلے میں تمہیں شرمسار کرنا نہیں چاہتی ـــــ اب تم اپنے بھائی کی ایک شادی اور کر دو ـــ کسی شریف زادی سے ۔ تاکہ تمہارے نجیب الطرفین خون کی شرافت باقی رہے ـــ
وہ سسک سسک کر رونے لگی ۔ نوزیہ کے کاندھے پر اس کا سر تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے نوزیہ کو تھامے ہوئے تھی ۔ نوزیہ چپ تھی ۔ غزل سمجھ رہی تھی کہ اب وہ غزل کو سینے سے لگا کر سمجھائے گی ۔ اپنے بھائی سے جواب طلب کرے گی ـــ مگر نوزیہ نے غزل کا سر اپنے کاندھے سے ہٹایا اور آہستہ آہستہ نیچے اتر گئی ـــــ

رات سے راشد کی طبیعت خراب تھی ۔ اسے ہلکا سا ہارٹ اٹیک ہوا تھا ـــ کیونکہ وہ الیکشن ہار گیا تھا ـــ پچاس ہزار روپے اور مستقبل کی منسٹری ـــ گورنمنٹ کا اعتماد ـــ ۔ ـــ انسان کتنی شکستوں کو دل پر سہ سکتا ہے ـــ
آج غزل اور کرانتی کے نیچے آنے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا ۔
رضیہ کو اپنی پریشانی میں ناراض ہونے کا ہوش ہی کہاں تھا !
سب راشد کے کمرے میں جمع تھے ۔ رات کے نو بج رہے تھے ۔ سردی بڑھ چکی تھی ۔ مگر نوزیہ کے بچوں کا ہنگامہ جاری تھا ۔ آج شاہین بھی کلینک بند کر کے جلدی آگیا تھا اور دواؤں کی بجائے اچھی اچھی خبروں کے ڈوز ڈیڈی کو پلائے جا رہا تھا ۔
راشد بھی اب کل سے بہتر تھا ۔ اسے غزل اور کرانتی کا نیچے آنا اچھا لگ رہا تھا گھر کی کھوئی ہوئی چہل پہل اچھی لگ رہی تھی ۔ وہ جانتا تھا کہ شاہین یہ ساری باتیں اسے خوش کرنے کے لیے کر رہا ہے ۔ مگر پھر بھی شاہین کا اس کے سرہانے بیٹھ کر قہقہے لگانا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا ـــــ
پھر دروازے کا پردہ ہٹا اور شیخو بھائی اندر آ گئے ـــــ

چوڑی دار پاجامہ ـــ ٹوئیڈ کی شیروانی ـــ ترکی ٹوپی ـــ چھاتی تنی ہوئی ـــ اجلے اجلے سے ـــ ان کے پیچھے لنگڑاتی ہوئی لنگڑی پھوپھو کھڑی تھیں مگر ان کی شکل اتنی بدل چکی تھی کہ پہلی نظر میں کسی نے نہ پہچانا۔ انھوں نے اپنے بال سیاہ کر لئے تھے ـــ کانوں میں کرن پھول جھمکے۔ گلے میں ست لڑا اور چندن ہار ـــ اور کالی پوت کا لچھا۔ گلابی کتان کی چمکتی ہوئی ساری اور ہاتھوں میں جگمگاتا ہوا سچے موتیوں کا جوڑا ـــ

کمرے میں سب ہی ان سے چھوٹے بیٹھے تھے۔ مگر انھوں نے سب کو جھک جھک کر سلام کئے۔ آخر میں رضیہ سے جا کر لپٹ گئیں اور رونے لگیں۔

مگر رضیہ کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ اس نے لنگڑی پھوپھو کو ہٹا کر تیز لہجے میں کہا۔

"آپ لوگاں یہاں کیوں آئے ہیں۔ کس کی اجازت سے ـــ"

"ہشت ـــ چپ بیٹھو رضیہ ـــ" راشد نے غصے میں کہا۔

"بات تو کرنے دو ـــ آتے ہی لڑنا شروع کر دیا۔"

"میرے کو معلوم ہے راشد میاں کہ رضیہ دلہن مجھ سے لڑیں گی۔ مجھے گالیاں کوسنے دیں گی۔ کیونکہ میں اپنا حق لے گئی تھی ـــ" کرانتی سب سے الگ ایک کتاب کھولے کرسی پر بیٹھی تھی۔ مگر لنگڑی پھوپھو کی بات سننے کے لئے کتاب پھینک کر تماشہ دیکھنے کے لئے آکھڑی ہوئی۔

"مگر ہوس چھوڑ دو دلہن پاشا ـــ" لنگڑی پھوپھو کہہ رہی تھیں۔

"تمہارے خسر میرے کو چھت سے نیچے پھینک کر اپنی قبر کیا سمیٹ کر لے گئے کہ تم لے جاؤ گی۔ دیکھ لو کتوں کی چھوڑی ہوئی جھوٹن تم کھا رہی ہو ـــ اب تو خدا کے قہر سے ڈرو بی بی ـــ"

"چپ بیٹھ بے شرم بڈھی ـــ" رضیہ نے غصے میں کہا۔

"بے شرم کہیں کی۔ سفید چونڈے کو کالک لگا کر اپنا تماشہ بنایا ہے اور اب

آئی ہے میرے کو نصیحت کرنے ـــ"

غزل پیچھے ہٹ کر چپ چاپ شیخو بھائی کو دیکھ رہی تھی جو غصے میں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ شاہین بڑے غور سے اپنی ماں اور لنگڑی پھوپھو کی باتیں سن رہا تھا لیکن کرانتی کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ وہ اس لڑائی کو یوں انجوائے کر رہی تھی جیسے کوئی مزاحیہ ڈرامہ دیکھ رہی ہو۔

"تو پھر کیا کرتی! واحد بھائی نے مجھے چھت سے نیچے پھینک کر میری ٹانگیں توڑ دیں کہ میں اس گھر سے کہیں نہ جا سکوں۔ ارے میں تم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ تم سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ کبھی مجھے نیچے پھینک دیتے ہو کبھی چاند کو آگ میں جھونکتے ہو ـــ

تمہاری شاعری کی ایسی تیسی۔ اس ایوان غزل پہ مٹی ڈالوں جہاں عورت کو لوٹ کھسوٹ کے چھوڑ دیتے ہیں۔"

گوہر پھوپھو چلاتے چلاتے بے دم سی ہو کر ایک طرف کو جھک گئیں تو شیخو بھائی نے انھیں اپنے ہاتھوں پر سنبھالا۔

"بس کرو گوہر بیگم آپ یہاں لڑنے کو نہیں آئے تھے۔"

اور پھر شیخو بھائی نے ایک ایک کر کے لنگڑی پھوپھو کے بدن پر سے زیور اتار کے راشد کی طرف پھینکنا شروع کیے۔

"یہ لو راشد میاں، اس زیور کو پھر اپنی سیف میں بند کر لو۔ گوہر بیگم ہوتے ہیں۔ میں ان کو منع کیا تھا میرے کو زیور نہیں ہوتا۔ ایک گوہر بھوت ہے۔"

راشد نے سونے کے کڑے کو ہاتھ میں تھام کر حیرانی سے دیکھا اور خوشی کے مارے کانپنے لگا۔ پھر چالیس تولے کا وزنی ہار دھم سے راشد کے سینے پہ پڑا اور اس نے ہار سمیت دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھام لیا۔

سب خاموش تھے۔ شاہین ـــ غزل ـــ نوزیہ اور رضیہ اور کرانتی جیسے کسی پکچر کا کلائمکس سین آگیا ہو جہاں ایک دلہن اچانک کسی فرشتہ صفت

انسان کا روپ دھار لے۔ اور ایک ایک روپے کے لیے سب کے سامنے گھگھیانے والے شیخو بھائی کا روپ دھار کر ہزاروں روپے کا زیور راشد کے منہ پہ مارنا شروع کر دے

سچ مچ کی زندگی میں تو کبھی ایسا نہیں ہوا ہے۔ یہ تو کسی تھرڈ کلاس ہندوستانی فلم کا ایک بور سین تھا۔ کرانتی کو الجھن سی ہونے لگی

"یہ بھی اتار لو —" لنگڑی پھوپو نے انگوٹھیوں والا مہندی لگا ہاتھ رضیہ کی طرف بڑھا دیا۔

"رہنے دو — مجھے اب نہیں چاہیئے یہ زیور —" جانے کس دل سے رضیہ نے محض دکھاوے کے لیے سب کو سنایا۔

"جاؤ سب زیور لے جاؤ شیخو بھائی اور اس کا گڑ بہ پی ڈالو۔"

"گڑ مبہ پینے کے لئے میں نے ایک کارخانے میں نوکری کر لی ہے۔ دلہن پاشا آپ کی مہربانی کا شکریہ۔" شیخو بھائی نے ہاتھ جوڑ کر حسب عادت نہایت انکساری سے کہا۔

"گوہر بیگم کو دلہن بننے کا ارمان تھا بول کے انوں یہ زیوراں لے کر گئے تھے۔"

"تو اب کون سا دلہنا پا ختم ہو گیا ہے ان کا —" رضیہ نے جل کر کہا۔

"بڑے ارمانوں بھری سو دو برس کی کنواری ہیں نا۔ ابھی بس دو برس اور گھونگھٹ نکال کر بٹھا رہنے دو — توبہ توبہ اللہ میاں —" رضیہ نے زور زور سے منہ پہ تھپڑ مارے۔

"ایوانِ غزل" کی پوٹیاں چھوکریاں۔ اللہ کی پناہ اُجاڑ صورتاں سوئی کے کیڑے ہیں۔ چاہے انھیں قبر میں سلا دو۔ پھر بھی ان پہ اعتبار نہیں کرنا۔" رضیہ غصے میں یوں ٹہل رہی تھی جیسے جلتے تیل میں پوری کانپ رہی ہو۔

اس سارے جھگڑے کے دوران راشد بالکل چپ رہا۔ چندن ہار اس کے سینے پہ رکھا تھا — کرانتی، رضیہ اور شیخو بھائی کے مکالموں پہ

خوب قہقہے لگا رہی تھی اور باری باری سب کی صورتیں غور سے دیکھتی جاتی تھی — پھر کچھ دیر بعد کرانتی کچھ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس نے پلنگ پر پڑا ہوا کرن پھول اُٹھا کر راشد کے اوپر رکھتے ہوئے کہا۔

"راشد انکل کی ڈیڈ باڈی پہ میں سب سے پہلے سونے کا پھول رکھوں گی۔"

یہ سن کر سب اچھل پڑے۔ شاہین تڑپ کر اٹھا — اور اس ایک لمحے کے دوران جب وہ کرسی سے اٹھ کر راشد کی طرف جھک رہا تھا تو اس نے اندازہ لگا لیا کہ اس کے باپ کو نجات مل چکی ہے۔

راشد کی تیسری برسی کے دن غزل پیش دالان میں چاندنی کا فرش کروا رہی تھی کہ کوئی نوکر اس کے ہاتھ میں ایک خط دے گیا۔ یہ خط غزل ہی کے نام تھا

"آج میں اس غزل سے مخاطب ہوں جس نے مجھے پاکستان کا سب سے مقبول شاعر بنا دیا ہے۔ مگر اب میری شاعری پھیکی پڑتی جا رہی ہے کیونکہ تمہاری یادوں کے نقوش دھندلانے لگے ہیں۔

اس لیے میں نئی زندگی لینے تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ میرے ساتھ میری بیوی بھی ہوگی۔

نصیر

جسے اب کسی کا بھی ہونے کا
اندیشہ نہیں ہے۔

غزل نے خط تہہ کر کے لفافے میں رکھا۔ اور دھلتی شام کی ساری اداسی — برسی والے گھر کا غمناک سناٹا۔ اس کے چار دن اور چھا گیا —— قالین کا کونا ہاتھ میں تھامے وہ ہر چیز بھول گئی۔ سب باتیں — یوں لگا جیسے ان دس برسوں میں وہ صرف آنگن میں بڑھتا ہوا اندھیرا ہی دیکھے جا رہی ہے ——

اسے انتظار تھا۔ کسی کی آہٹ کا — کسی کے ہلکے ہلکے ترنم کا ——

میری شاعری —— جانِ غزل — ایمانِ غزل۔ میری غزل ——

اب وہ کتنا مایوس ہوگا مسز شاہین سے مل کر —— میں اس کا انتظار کیوں کرتی —— ! میں نے اس کے منہ پہ تھوک دیا ہے۔ میں اس سے اجنبیوں کی طرح ملوں گی۔ اس کے شاعرانہ موڈ کو تباہ کر دوں گی — اس کی شاعری کا رخ بدل دوں گی ——

نصیر کو جلانے کے لیے وہ اچانک شاہین پہ زیادہ مہربان ہو گئی اپنا رنگ روپ تو بقول نوزیہ کے یوں ہی اس نے سنت کر رکھا تھا۔ کسی کے انتظار میں۔ میک اپ کی تہہ اور بڑھا دی —— وہ سب ساریاں اکٹھی کیں جو اس پہ اچھی لگتی تھیں۔ شاہین کے ساتھ شام کو وہ عابد شاپ گئی۔ بہت سے نئے قسم کے بلاؤز سلوائے جس میں بدن کا ہر حصہ نمایاں ہو سکے۔ وہ اپنی بھولی بسری ہنسی کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اکٹھا کرنے لگی۔

نصیر کی بیوی ، بیویوں کا بہت ہی فضول سا ماڈل تھی گوری گول مٹول۔ دو بچوں کے بعد ہی پھول کر کپا ہو گئی تھی۔ بے ڈھنگے پن سے سلے ہوئے کپڑے پہنے۔ پھوہڑ پن کا میک اپ۔ ضروری اور غیر ضروری زیوروں میں لدی —— شوہر کی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں پر ناک بھوں چڑھانے والی —— ذرا ذرا سی بات پر نصیر کو اس کی خوشامد کرنا پڑتی۔

نصیر غزل سے یوں ملا جیسے وہ غزل کے جان لیوا بدن، مدھوش کن آنکھوں اور سب کچھ بھلا دینے والے چہرے سے واقف ہی نہ ہو —— یہ بات غزل کو بھی پسند آئی — اسے ڈر تھا کہ نصیر کہیں اپنی بیوی کے سامنے اس کی عزت کا بھرم نہ توڑ دے۔

رضیہ نے نصیر کی خوب آؤ بھگت کی۔ سارے گھر میں چہل پہل مچ گئی۔ فوزیہ بھی اپنے بچوں سمیت نصیر بھائی سے ملنے آئی دو دن چلے

گئے تو کیا ہوا —— آخر خون کی محبت کبھی نہ کبھی تو اسے کھینچ ہی لائی شاہین نے بڑے بھائی کی طرح اس کا استقبال کیا۔ وہی لڑکپن کی بے تکلفی اور بے ساختگی واپس آگئی جو نصیر کے پہلی بار حیدر۔ آباد آ لے پر ان دو کے درمیان پیدا ہوئی تھی۔

نصیر نے اس کی ڈاکٹری کے دھندے پر طنز کیا اور اس نے نصیر کے بھاری بھر کم بدن کو دیکھ کر پاکستان میں شاعروں کی قدردانی پر جملے کسے —— ذرا دیر بعد ہی وہ دونوں غزل اور نفیس کی حرکتوں پر دبی دبی سرگوشیوں کے ساتھ مسکرا رہے تھے۔ شاہین کو جیسے بالکل یاد ہی نہ رہا تھا کہ نصیر پہلی بار حیدر آباد آیا تھا تو اس نے غزل کے خطرے سے اسے آگاہ کیا تھا۔ اس کے باوجود اورنگ آباد جاتے وقت وہ راہ میں لٹ جانے والے مسافر کی طرح سسکیاں لے کر شاہین سے کہہ رہا تھا۔

"شاہین میں مر جاؤں گا۔ یار صرف تم سے امید ہے کہ میرا ساتھ دو گے قسم خدا ورنہ میں زہر کھا لوں گا۔ تم پھر کبھی میری صورت نہ دیکھ سکو گے ——"

اور اب آنے کے بعد نصیر نے شاہین کو یوں شادی کی مبارکباد دی تھی جیسے وہ شاہین کی دلہن سے واقف ہی نہ ہو —— اس نے غزل بھابی غزل بھابی کی رٹ لگا لی تھی ——

اتنے بھاری جھوٹ کے پتھر انھوں نے کیسے اپنے سینے پر رکھ لیے ہیں —— غزل بڑے تعجب سے کبھی نصیر کو دیکھتی۔ کبھی شاہین کو —— اور شاہین نصیر کے سامنے غزل کے ساتھ نئے نویلے دولھاؤں کی طرح چونچلے بگھارتا —— دم بھر کے لئے اس سے دور ہٹ کر نہ بیٹھتا تھا۔ گھبراہٹ کے مارے غزل کو اختلاج سا ہونے لگا تھا۔ یوں لگتا جیسے وہ سب منہ پر میک اپ تھوپے، سوانگ بھرے کوئی ڈرامہ کھیل رہے ہیں۔ ابھی پردہ گر جائیگا

تب ایک اور تماشہ شروع ہوگا۔

نصیر اتفاقاً یا تفریحاً کرنے آیا تھا۔ دل کے سوئے ہوئے جذبے جگانے اور وہ کرانتی کو دیکھ کر جاگ اٹھا —— ہائے کیا جوانی ہے —— اسے جوش یاد آئے اور پھر ان کے وہ معاشقے جو انھوں نے دکن کی سیاہ فام عورتوں سے کیے تھے۔ وہ شاہین کی پسند کی داد دینے لگا کہ کیسی چڑیا اس نے پال رکھی تھی —— چلو ایوان غزل میں اب ایک نئے معشوق کی آمد تھی —— اور وہ چاہتا تھا اب کی بار پھر یہاں کوئی ایک اور رنگین کہانی چھوڑ جائے —— یہی وجہ تھی کہ اس نے غزل پہ کوئی خاص توجہ نہیں دی اور شاہین کے ساتھ ہو لیا کہ اس ترمال میں ساجھے دار بن سکے مگر اسے یوں محسوس ہوا جیسے شاہین اس نوخیز حسینہ کے معاملے میں کسی اور کی شرکت برداشت نہیں کرتا —— یا پھر کوئی اور بات تھی کہ اس کی قیامت خیز جوانی کو شاہین نظر انداز کئے ہوئے تھا۔

"یار تم نے یہ چڑیا تو خوب پالی ہے۔" ایک دن نصیر صبر کھو بیٹھا۔ شاہین نے نصیر کو گھور کے دیکھا —— کرانتی کو اس نے دل کے کسی خانے میں بیٹی کا سا رشتہ تو نہیں دیا تھا۔ پھر بھی وہ کرانتی کی جوانی پر کبھی نگاہ نہیں ڈال سکا۔ شاید اس لیے کہ اس نے چار پانچ برس کی کرانتی کو اپنی گود میں اٹھایا تھا —— اس نے کرانتی کو کھلونے لاکر دیئے تھے اور اسے اپنے بستر پہ تھپک تھپک کر سلایا تھا —— لیلیٰ کا کتا —— رضیہ نے کرانتی کو ہمیشہ لیلیٰ کا کتا کہا تھا —— اسی لیے نصیر کی بات اسے اچھی نہیں لگی اور رات کو اس نے زندگی میں پہلی بار کرانتی کو ڈانٹا ——

گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں —— ہر وقت نئی اسکرٹ اور بیل باٹم

مت پہنا کرو۔"

کرانتی سہم گئی ——— کیونکہ انکل نے کبھی اس کے لباس پہ اعتراض نہیں کیا تھا — اور شاید یہ پہلی ڈانٹ تھی جو اس نے سنی۔ مگر وہ جواب دینے کے بجائے چپ ہو گئی۔ کیونکہ اس وقت اسے شاہین سے ایک اہم بات کہنا تھی ———

"اور آج تم گھر پہ کیوں ہو — کالج نہیں گئیں —" شاہین نے پھر پلٹ کر پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک نصیر یہاں رہے کرانتی کم سے کم گھر میں آئے۔ ویسے بھی وہ گھر میں کم رہتی تھی اور اس کا سارا وقت گوپال ریڈی کے ساتھ گزرتا تھا جو نکسلائٹ تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے کالج سے نکالا گیا تو اسی کے ساتھ کرانتی کو بھی ملازمت سے علاحدہ کر دیا گیا تھا۔

"انکل ——— وہ ——— وہ گوپال ریڈی ———" کرانتی کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی —

"اب گوپال ریڈی کا ساتھ چھوڑ دو۔ ایکبار ملازمت کھو چکی ہو — پھر کہیں یہ نوکری بھی نہ چلی جائے۔" شاہین نے سنبھل سنبھل کر کہا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کرانتی نصیحتیں سننے والوں میں سے نہیں تھی۔

کرانتی نے بال پیچھے کی طرف جھٹک کر آہستہ سے کہا۔

"وہی تو ہوا ہے ———"

"پھر نوکری چھوٹ گئی ——— ؟" شاہین نے تعجب سے پوچھا اور پھر وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا ——— کہیں جائے وہ — میری بلا سے ——— الماری سے بوتل نکال کر اس نے میز پہ رکھتے ہوئے سوچا ———

کئی دن بعد نفیس اور نصیر سے ہنسی مذاق کر کے غزل اوپر آئی تو رات کے بارہ بجے تھے — شاہین کسی مریض کو دیکھنے گیا تھا اور کرانتی کے کمرے میں ابھی تک لائٹ جل رہی تھی ——— پڑھ رہی ہو گی — اس نے سوچا — یہ لڑکی جانے کس طرف جا رہی ہے — کہاں ماری ماری پھرتی ہے۔ کچھ نہیں بتاتی۔ بالکل لڑکوں کے انداز میں جینس اور بیل باٹم پہنے — سگریٹ پیتی ہے۔ اس نے لڑکیوں والی کوئی بات نہیں سیکھی تھی۔ میک اپ کرنا نہ اچھے کپڑے پہننا۔ نہ پکچر دیکھنا — اسے کوئی شوق نہیں تھا —

اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے غزل ٹھٹک گئی۔

سفید قمیص اور نیلا پینٹ پہنے کرانتی سگریٹ سلگا رہی تھی۔ اس کے جھنڈ والے بال سارے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اور سارا کمرہ جانے کیسے سامان سے بھرا پڑا تھا ——

وہ کہیں جا رہی ہے —!

"یہ سامان کیسا ہے —— ؟" غزل نے اندر آ کر ادھر ادھر دیکھا۔ سیاہ کپڑے میں بندھی ہوئی ر ائفلیں تھیں —— کارتوسوں کی پیٹیاں اور بند ڈبے —— " غزل کو دیکھ کر انتی گھبرا گئی اور سگریٹ پھینک کر اس سے لپٹ گئی —

آنٹی آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں —— ؟ میں ذرا آج گوپال ریڈی کے ساتھ جا رہی ہوں —— ابھی ہمارے ساتھی آتے ہوں گے —— آپ مت گھبرایئے —— میں اب یہاں نہیں آیا کروں گی — آپ کو نہیں ستاؤں گی ——

غزل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس چپ چاپ کھڑی رہی۔

"تم کہاں جا رہی ہو —— کیا کرنے — ؟" بڑی دیر بعد غزل اپنی آواز پر قابو پا سکی۔

"میں لڑنے جا رہی ہوں —" کرانتی نے سگریٹ کی خالی ڈبیہ کو ٹھوکر مار کے کہا اور سامان کے ڈبوں پر ایک چادر لا کر ڈال دی۔

"آج آپ نے نیوز پڑھی آنٹی! ورنگل میں سات آدمیوں کو پھانسی دے دی گئی ہے — کیا آدمی کا خون اتنا سستا ہے آنٹی — وہ کمرے میں ادھر ادھر گھوم کے کچھ چیزیں اپنی جیبوں میں بھر رہی تھی —— کیا اپنے لیے حق، راحت اور انصاف مانگنے کی سزا کبھی ختم نہ ہوگی — ؟"

"مگر یہ تو بڑا خطرناک راستہ ہوتا ہے کرانتی ——" غزل نے بڑے دکھ سے کہا۔ (اسے قیصر اور سنجیوا کا انجام یاد آ رہا تھا) ——

"لوٹ مار، قتل اور غارت گری پھیلانے کے علاوہ بھی کوئی راستہ ہو سکتا ہے —— کیا تم نے اس پر کبھی غور کیا ہے۔" غزل اب تھک کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"میرے ڈیڈی نے کہا تھا ——" کرانتی نے سگریٹ سلگاتے میں کہا — انصاف کی بھیک مانگی تو انھیں پھانسی کا پھندا ملا تھا۔

"اور تمہیں کیا ملے گا —— ؟" غزل نے جل کر پوچھا — (باغیوں کی اولاد۔ آخر گئی نا اپنے خون پر!)

"سکون" اس نے آنکھیں بند کر کے چھت کی طرف منہ اٹھایا۔

اجنبی لوگوں کے لئے غزل کے دل میں ہمیشہ محبت کے سوتے پھوٹ پڑتے تھے ـــ اسے جو چیز پسند آجاتی اس کی تمام برائیاں خود بخود نظروں کے سامنے سے ہٹ جاتی تھیں ـــ اسی لئے نصیر کی بیوی نفیس بھی اس کی عنایتوں سے نہ بچ سکی۔ غزل جب نصیر کی سی آنکھوں والی، اس کی سی مسکراہٹ والی، نصیر کی چھوٹی بچی کو پیار کرتی تھی تو اس میں فرائیڈ کے خوش ہونے کی کوئی بات نہ تھی۔ کیونکہ خلوص پر مرنا اس کی پرانی عادت تھی ـــ ایک ہفتہ میں اس نے نفیس کے ساتھ دوستی کے بے شمار مرحلے طے کرڈالے۔

بچوں کو مارنے پیٹنے اور شوہر سے لڑنے کے بعد وقت بچے تو نفیس کافی خوش مزاج تھی،

ایک بار نصیر اور شاہین سیکنڈ شو دیکھنے چلے گئے، بچوں کو سلا کر نفیس اوپر چلی آئی، پھر نفیس اور غزل ایک ہی پلنگ پر لیٹ کر گپیں ہانکنے لگیں، وہ ساری دلچسپ باتیں، راز اور ساس نندوں کی زیادتیاں، شوہر کے رومانس کے قصے، جو صرف دو جگری سہیلیاں ہی آپس میں کرتی ہیں،

نفیس نے پہلے تو عام عورتوں کی طرح اُجالا بیگم نے ظلم و ستم کی داستان سنائی، پھر اپنے خاندان اور اپنی صورت شکل کی تعریفیں کرتی رہی اور آخر میں نصیر کی طرف آئی ـــ

"یہ تمہارے نصیر بھائی بھی بڑے وہ ہیں ـ" وہ ناز سے اٹھلائی "مجھ سے کہتے تھے کہ شادی کرونگا تو تم سے ورنہ ساری زندگی کنوارا رہوں گا۔ ان کی شاعری میں ہر جگہ میرا ہی تو ذکر ہے۔"

غزل یہ سن کر چونک پڑی،

"ان سے شادی کے وقت مجھے بڑا ڈر لگتا تھا کہ شاعروں پہ بہت سی لڑکیاں مرتی ہیں نا ـ پاکستان کے شاعر تو چیونٹیوں بھرے کباب ہیں جانے کتنی محبوبائیں ان کی جان کو لپٹی رہتی ہیں۔"

"ہاں تو پھر ـ اور کیا کہتے تھے تم سے نصیر ـ؟" غزل نے کھوئے ہوئے لہجہ میں پوچھا،

"انہوں نے مجھ سے قسم کھا کر کہا تھا کہ تم ہی وہ پہلی اور آخری لڑکی ہو، میں جسے چاہتا ہوں۔"

غزل نے مسکرانا چاہا، پھر ہار کے زور زور سے پاؤں ہلانے لگی۔
نفیس اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی،

"البتہ ایک بار انہوں نے اقرار کیا تھا کہ ایک لڑکی انہیں بے حد چاہتی تھی۔"

"اچھا ـــ؟" غزل یوں اچھل پڑی جیسے اچانک نفیس نے اس پر چاقو سے وار کیا ہو۔

"ہاں ـ بڑے رنگین مزاج ہیں یہ تمہارے نصیر بھائی ـ مجھے معلوم

ہے کہ وہ لڑکی انڈیا میں تھی، اسی لیے تو میں ضد کر کے ان کے ساتھ آئی ہوں مجھے جلانے کے لیے کہتے ہیں وہ تو آج بھی میری راہ میں آنکھیں بچھائے ہوگی۔"

"ہونہہ — سب بکواس ہے۔" غزل نے غصے میں اپنے ہونٹ کاٹے۔

"اور نہیں تو کیا۔" نفیس نے اطمینان سے کہا۔ "کہتے ہیں ایک خوب صورت لڑکی مجھ پر بُری طرح مرتی تھی، مگر وہ ایسی لڑکی تھی جس سے صرف پیار کیا جاتا ہے —"

غزل پر جانے کیسی تھکن سوار ہوئی کہ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی، صرف محبوبہ — نصیر کی محبوبہ — بلگرامی کی محبوبہ — بھان کی محبوبہ — شاہین کی محبوبہ — سرور کی محبوبہ — جان غزل — شاعر گر — "ایوان غزل کی معشوقہ —!

پھر نفیس نے اپنے سینے پر پلو ڈال کر بڑے ٹھسّے سے بیوی پن کی اہمیت جتائی۔

"اب تو میں نے انہیں خوب کس کر باندھ رکھا ہے، کہو تو سوئی کے دھاگے میں سے نکل جائیں گے میرے خاطر۔"

غزل جانے کیسے وہاں سے اٹھی اور یوں اپنے کمرے میں آئی جیسے موت کا خیال آتا ہے۔

جی تو چاہ رہا تھا کہ دیوار سے اپنا سر دے مارے، بستر پر گر کے وہ ہاتھ پاؤں پٹکنے لگی، دل میں جانے کیا چیز ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی تھی، شاید اسی کو ہارٹ اٹیک کہتے ہیں — دل کا دورہ — دل پر ایک زوردار چوٹ لگتی ہے، ایک گہرا زخم پڑھ جاتا ہے — لیکن میرے دل پر بھی کوئی

بگ زخم کے لیے باقی ہے — ؟ دانت کچکچا کر اس نے ساری کھول پھینکی، کسی کو مار ڈالنے، تباہ کر ڈالنے کے لیے اس کے ہاتھ بیقرار تھے — اس نے کروٹ بدلی تو سامنے ڈریسنگ ٹیبل کا آئینہ تھا — اُفوہ — اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا — بال چڑیلوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے — آخ تھو — اس نے سچ مچ آئینے کے اوپر تھوک دیا — شاعروں کی معشوقہ غزل — جان جاناں —

پھر شاہین کا میڈیکل بکس کھول کر اس نے آئیوڈین کی ایک شیشی نکالی اور بڑے اطمینان سے سوچ سوچ کر پیڈ پہ لکھنے لگی۔

"میں اپنی موت کی خود ذمہ دار ہوں۔"

ابھی اس نے زہر کی شیشی کھولی بھی نہ تھی کہ دل میں ناقابل برداشت درد ہونے لگا۔

تو آج وہ دن آگیا — ؟

اس نے چاروں طرف آخری نظر ڈالی —

اس گھر کے اس نے کیسے کیسے خواب سجائے تھے — الماری میں کتنی چیزیں اکٹھی کی تھیں — رنگین ساریاں — طرح طرح کے جوتے چھوٹے موتیوں کے زیور — ان چیزوں کی خاطر اُسے گھنٹوں چہرے پر میک اپ کرنا پڑا تھا، شراب کی بدبو میں نہائے ہوئے مردوں کے پیار — گنجے بڈھوں کا چھچھورا پن — نوجوان مردوں کی بے قراری — کیسے کیسے زہر پیے تھے — ان الماریوں میں فلمی گانوں سے بھری ہوئی کاپیاں تھیں — اخباروں کی کٹنگ جن میں اس کی اداکاری کی تعریف کی گئی تھی — چھوٹے بڑے کپس اور شیلڈز — اور پھر اس کا،

البم ۔۔۔!

البم کے نام پر اس کا دل ٹھہر گیا۔

یہ البم اس کی زندگی کا آئینہ تھا، یہاں شناسا چہروں کا ہجوم تھا، وہ اٹھی اور البم نکال کر کھول دیا ۔۔۔ یہ سب وہ تھے جو اس پر اپنی جاں نثار کرنے کو تیار تھے مگر عزت نثار نہ کر سکے ۔۔۔ انہوں نے اسے اپنی محبوبہ بنایا تا کہ اپنی جوانی کو رنگین بنائیں اور پھر ان عورتوں سے شادی کی جو صرف بیویاں ہوتی ہیں ۔۔۔ ماچس اٹھا کر اس نے البم کو جلانا شروع کیا ۔۔۔!

مرنے سے پہلے ان سب صورتوں کو آگ لگا دینا چاہیے۔

تمام فوٹو بڑی جلدی جل گئے ۔۔۔ لیکن ربر کی چمڑے والی جلد بڑی دیر میں جلی ۔۔۔ راکھ ٹوبر کے وہ جھٹکنے لگی تو راکھ میں دبا ایک ادھ جلا فوٹو نکلا ۔۔۔۔ یہ سرور کی آنکھ تھی جو ابھی تک اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی ۔۔۔ یہ فوٹو سرور نے شادی کے آفر کے ساتھ اسے دیا تھا اور غزل اسے سارے گھر میں نچاتی پھری تھی،

"ان حضرت کو ملاحظہ کیجئے ۔ شاعری کرتے ہیں اور مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں ۔"

میں نے کہا:

"جاؤ شاعر ۔ کیوں اپنا شاعرانہ موڈ تباہ کرنا چاہتے ہو، مجھے ابھی کئی ڈراموں میں ایکٹنگ کرنا ہے ۔ شادی کی فرصت کسے ہے ۔!"

آج سرور کا پورا چہرہ جل گیا ہے، مگر یہ آنکھ باقی ہے، میری طرف دیکھے جا رہی ہے۔

کھڑکی کے پاس جا کر اس نے فوٹو کا وہ ٹکڑا نیچے چھوڑ دیا ۔۔۔ بڑی دیر تک وہ خلا میں ہاتھ پاؤں مارتا رہا اور پھر کسی پتھر سے جا ٹکرایا ۔۔۔!

اس کے دل میں ٹھنڈک سی پڑ گئی ۔۔۔ چلو کسی کو تو اس نے بھی ٹھکانے سے لگایا ۔۔۔!

اندر آئی پیڈ سامنے رکھا تھا،

"میں اپنی موت کی خود ذمہ دار ہوں ۔"

کیوں ۔۔۔؟ میں کیوں ہونے لگی اپنی موت کی ذمہ دار ۔۔۔ میری موت کا ذمہ دار اردو کا ہر شاعر ہے ۔۔۔ "ایوان غزل" کے وہ سارے مکین ہیں جو سنہری فریموں میں بند بڑے ہال کے اندر چپ چاپ بیٹھے ہیں ۔۔ کسی نئے معشوق کے منتظر ۔۔۔ عشق کی کسی تازہ واردات کے مارے ہوئے جو لڑنے بھی جاتے تو معشوقوں کی ڈولیاں ساتھ ساتھ چلتی تھیں ۔۔۔ اپنے سے دور ۔۔۔ اپنی مصروفیتوں اور دلچسپیوں سے دور جہاں کی سسکیوں اور آہوں کی آوازیں انہیں کبھی سنائی نہ دیتیں تھیں ۔

اگر نصیر کو اپنی موت کا ذمہ دار ٹھہراؤں تو اس کی کتنی بدنامی ہو گی، نفیس تو فوراً روٹھ کر میکے چلی جائے ۔۔۔ اور وہ نصیر کی صورت والی ننھی سی بچی ماں کے بغیر رو رو کر مر جائے گی ۔۔۔ اور نصیر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بیٹھ جائے گا، سارے پاکستان میں اس کے دشمن اس کا نام اچھالیں گے، اس کی شہرت خاک میں مل جائے گی، نصیر کے اس وحشت ناک تصور کو اس نے اپنے سامنے سے ہٹا دیا،

پھر کیا لکھوں ۔ کسے قاتل ٹھہراؤں ۔۔۔؟

"غزل —؟"

اس نے پلٹ کر دیکھا—

نصیر پشیمان سا — چوروں کے انداز میں سامنے کھڑا تھا—

ایک ہی نظر میں اس نے نصیر کے چہرے پر برستے ہوئے سوال کو پڑھ لیا —— دس برس سے ترسا ہوا اس کا بدن — بے قرار ہاتھ —— بے چین آنکھیں —— جانے کتنی کوشش کے بعد نفیس اور شاہین سے بچ کر وہ یہاں آیا تھا — اچانک غزل کا سویا ہوا بدن سپردگی کے بے پناہ جذبوں سے سرشار ہو اٹھا —— وہ پٹرول کا ڈرم بن گئی اور ننھی سی چنگاری اسے چھونے آگے بڑھ رہی تھی — آج پورے دس برس کے بعد نصیر اس کے سامنے کھڑا تھا تو وہ کچی کنواریوں کی طرح کانپ رہی تھی — اس وقت وہ اپنی موت بھول چکی تھی — اسے نفیس اور شاہین کبھی یاد نہیں رہے تھے —— نصیر اس کے اور قریب آگیا — اتنے قریب کہ وہ اس سے بے اختیار لپٹ گئی —

مگر نصیر نے اپنی کمر میں سے اس کے ہاتھ نکال کر تھام لیے،

"غزل — یہ انگوٹھی مجھے دے دو — اماں جان کہتی تھیں کہ یہ انگوٹھی نفیس کو پہننا چاہیے، میں تمہیں اور بہت سے پریزنٹس دے جاؤں گا — اور ہاں بھئی — ایک دن ہم پر بھی کچھ عنایت کرو — مگر اس طرح کہ شاہین کو خبر نہ ہونے پائے — قسم خدا کی تمہاری یاد تو میری جان کا روگ بن گئی ہے — میں نے تمہارے تصور میں جانے کتنی غزلیں —"

وہ منہ کھولے نصیر کو دیکھ رہی تھی —— اس کی سننے اور سمجھنے کی قوت ختم ہو چکی تھی —— وہ حرکت بھی نہ کر سکی —— اس کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ جو کسی کو پکڑنا

چاہتے تھے یوں ہی اٹھے رہے اور نصیر نے آہستہ سے انگوٹھی اتار لی —

"میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میری جان تمہارے فراق میں —"

وہ غزل کے کھلے ہوئے ہونٹوں پر جھک گیا —

"تم آج بھی میری شاعری کی جان ہو — لیکن میں چاہتا ہوں کہ دنیا کو ہماری اس دیوانگی کا کوئی ثبوت نہ ملنے پائے —"

وہ نہ جانے غزل کو کب تک پیار کرتا رہا اور کب باہر چلا گیا —

غزل نے چونک کر اپنی خالی انگلی کو ٹٹولا اور اس چھت کی طرح دھم سے گر پڑی جس کے ستون کسی نے نیچے سے گرا دیے ہوں

"ایوان غزل" کے اس سب سے بڑے اور خوبصورت ہال میں آراستہ غزل کی نہائی دھوئی بنی سنوری لاش رکھی تھی —— اس وقت بھی اس کے چہرے پر وہی ازلی معصومیت تھی جس کی وجہ سے اس نے بہت سے مردوں کو بے وقوف بنا لیا تھا —— یوں لگتا تھا جیسے آج اپنے سارے آنسو ختم کر کے وہ چپکے چپکے مسکرا رہی ہو —

کریا پات تلے کرسی ڈالے دونوں ہاتھوں میں سر تھامے، شاہین بالکل اپنے دادا کے انداز میں بیٹھا تھا —— سارے گھر میں لوگ بھرے ہوئے تھے، اور جب انگریزی میں باتیں کرنے والی چڑیا اس حادثے کی تفصیل پوچھنے شاہین کے پاس آئی تو اس نے سر اٹھا کر اس چڑیا کو دیکھا —

— میں کیا جانوں وہ کیوں مر گئی —— شاعروں کے مضامین میں معشوق کو موت نہیں آتی، وہ نہ تو کسی کو چاہتا ہے نہ کسی سے پیمان وفا باندھتا ہے —!

پھر سیاہ برقعہ میں لپٹی ہوئی کراچی ایک ہفتے کے بعد آئی تو غزل آنٹی

کی موت نے اُسے تڑپا دیا — روتے روتے وہ چپ ہو گئی، اس نے کفن ہٹا کر غزل کی انگلی ٹٹولی اور شاہین کے پاس جا کر آہستہ سے بولی —

"انکل، وہ انگوٹھی کیا ہوئی جو آنٹی کے ہاتھ میں تھی۔"

شاہین نے کرانتی کی اس فضول بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"آنٹی کی موت کی وجہ میں جانتی ہوں —"

وہ اب کی بار نصیر سے مخاطب ہوئی جو کرانتی کو بڑی ترسی ہوئی ندیدی نظروں سے گھور رہا تھا،

"نصیر انکل — آنٹی اس لیے مر گئیں کہ ان کی انگوٹھی کھو گئی — انہوں نے مجھ سے کہا تھا مرنے کے بعد بھی انگوٹھی کو مت اتارنا — اس میں میری جان ہے۔"

"اچھا — کیسی انگوٹھی تھی وہ —" نفیس نے تعجب سے کہا۔

اور نصیر جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا اور باہر جا کر شیخو بھائی سے پوچھنے لگا کہ قبر تیار ہونے کی اطلاع آئی یا نہیں —!

غزل "ایوان غزل" سے رخصت ہونے لگی تو کسی کی آنکھ میں آنسو نہ تھے — رضیہ — فوزیہ — نفیس اور نصیر، سب سر جھکائے کھڑے تھے، کرانتی وہاں سے غائب تھی — آخری دیدار کے لیے لوگوں نے غزل کا چہرہ کھولا تو شاہین کو کچھ نظر نہ آیا — اس کی آنکھوں میں غزل کے نقوش دھندلے ہونے لگے — وہ آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی — جیسے سینما کے پردے پر کسی ہیروئن کا کلوز اپ فیڈ آؤٹ ہو جائے —!

آج نصیر پاکستان جا رہا تھا۔

کل غزل کا چہلم ہو گیا تھا — اور نصیر نے ختم قرآن کے بعد اللہ میاں سے دعا مانگی تھی — غزل کے گناہ معاف کرنے کی — اس پر دوزخ کا عذاب کم کرنے کی —

پھر وہ "ایوان غزل" کے سب سے بڑے ہال میں گیا، اور وہاں کے مکینوں کی بیاضیں دیکھنے لگا — تاکہ چند اچھی غزلیں منتخب کر کے پاکستان کے مشاعروں کے لیے کچھ مسالا لے جائے واحد حسین کے دادا کی بیاض پر رینگتی ہوئی دیمک جھٹک ہی رہا تھا کہ اچانک چاروں طرف اجالا پھیل گیا، — فریموں میں سے نکل نکل کر تمام سوئے ہوئے شاعر بے چینی سے دیکھنے لگے اور دیمک لگی بیاضیں کھلنے لگیں کہ ایک اور معشوق کا سراپا لکھ لیں۔

نصیر بڑے اشتیاق سے اس محبوب کو دیکھنے لگا، جس کی مشعلِ رخسار سے شام گلزار ہوئی جا رہی تھی

"آداب عرض کرتا ہوں کرانتی دیوی — آئیے یہاں بیٹھیے —"

اس نے کرسی سے اٹھ کر جھکتے ہوئے اسے کرسی پیش کی —!

کرانتی نے اپنے بغیر تیل والے بالوں کے جھنڈ کو پیچھے جھٹکا اور سگریٹ منہ سے نکال کر بولی۔

"شکریہ — مجھے فرصت نہیں ہے۔" اور پھر پرانی کتابوں والی الماری کھول کر کچھ نئی کتابوں کے بنڈل ایک اٹیچی میں رکھنے لگی —!

"اچھا — آپ کو بھی شاعری کا شوق ہے — ؟"

وہ کرانتی کے پاس جا کھڑا ہوا تو اس نے مڑ کے بڑی ناگواری کے ساتھ اسے دیکھا، اور سگریٹ کا کش لے کر بولی —

"جی نہیں — یہ دوسری کتابیں ہیں — میں نے حفاظت کے لیے یہاں رکھ دی تھیں۔"

"لیکن آج ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے — ایسی بھی کیا بے رُخی — ؟"

اس نے کرانتی کا ہاتھ پکڑ لیا — کیوں کہ نصیر جانتا تھا کہ آج کی لڑکیاں عشق کا یہی انداز پسند کرتی ہیں — بے باکی — جلد بازی — اور — زبردستی — !

کرانتی نے اپنا ہاتھ چھڑایا نہیں — وہ نصیر کی صورت پر برستے ہوئے سوال کو سمجھ گئی اور اپنے پینٹ کی جیب میں دوسرا ہاتھ ڈال کر بولی —

"لیکن آپ کو مجھ سے بہت دور بیٹھنا پڑے گا نصیر صاحب — ! کیوں کہ میری جیب میں ٹائم بم ہیں — کہیں ایسا نہ ہو، میں آپ کے پاس آؤں اور آپ مع "ایوان غزل" کے حرفِ مکرر کی طرح مٹ جائیں —"

کرانتی ہنسنے لگی —

اتنی زور سے کہ الماریوں میں چین سے سونے والی چھپکلیاں بے چین ہو کر جھانکنے لگیں،

یہ غزل کا نیا مضمون ہے — نصیر نے سوچا —

اور آہستہ آہستہ وہ "ایوانِ غزل" کے پھاٹک سے باہر نکل گیا —

کھریا پات پر بیٹھی ہوئی چڑیا کی سیٹی اُسے ابھی تک سنائی دے رہی تھی — شوسو — شوں — شودد

یہ غزل کا نیا مضمون ہے ـــ نصیر نے سوچا ـــ
اور آہستہ آہستہ وہ "ایوانِ غزل" کے پھاٹک سے باہر نکل گیا ـــ
کھریا پات پر بیٹھی ہوئی چڑیا کی سیٹی اُسے ابھی تک سنائی دے رہی تھی ـــ شوسو ـــ شوں ـــ شودد

بالکلیات

مصنف: یوسف ناظم
صفحات: 136
قیمت: -/51 روپے

شریف زادہ

مصنف: مرزا رسوا
صفحات: 200
قیمت: -/62 روپے

رات کے مسافر

ترتیب: انور سجاد
صفحات: 112
قیمت: -/53 روپے

دوہے

مصنف: جمیل الدین عالی
صفحات: 88
قیمت: -/49 روپے

پچھلے پہر

مصنف: جان نثار اختر
صفحات: 96
قیمت: -/49 روپے

الفاظ کا مزاج

مصنف: غلام ربانی
صفحات: 136
قیمت: -/60 روپے

سحر کے پہلے اور بعد

مصنف: سعید الظفر چغتائی
صفحات: 152
قیمت: -/64 روپے

تحقیقی مضامین

مصنف: مالک رام
صفحات: 264
قیمت: -/91 روپے

ISBN: 978-81-7587-825-9
9 788175 878259

₹ 152/-